APRIL 2011
کرن
افسانہ نمبر
www.Paksociety.com
http://pakfunplace
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.Paksociety

## انٹرویو



## ناول



## مکمل ناول



## ناولٹ



## افسانے



## مستقل سلسلے




اپریل 2011

جلد 34 شمارہ 1

قیمت 40 روپے

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

## اداریہ

اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ماہِ اپریل میں ہی موسم گرما کی سختیوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے شہری ادارے جو ہمارے ملک کے شہریوں کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کے ذمے دار ہیں۔ اپنی اعلا کارکردگی کے جوہر دکھانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ موسم گرما کا آغاز ہوتے ہی بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ شہریوں کے لیے شدید اذیت کا باعث بنتی ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری و ساری ہے۔ ہر سال بنائے جانے والے منصوبوں میں کوئی اس مسئلے کا حل نہیں نکال پایا۔ ابھی لوڈشیڈنگ کر کے بھی توانائی کے بحران پر قابو نہیں پایا جا رہا۔ تاہم مربوط اقدامات کے ذریعے اس بحران پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے یہاں وسائل کی کمی نہیں مگر مسئلہ دیانت دار قیادت اور وسائل کے صحیح استعمال کا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار و اختیار کو درست پالیسیاں مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

### سانحہ ارتحال،

ادارۂ خواتین ڈائجسٹ کے انتہائی اہم کارکن شبیر احمد مختصر علالت کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ شبیر احمد صاحب گزشتہ بیس سال سے ادارہ سے وابستہ تھے۔ نہایت محنتی اور دیانت دار۔ اپنے فرائض انتہائی خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔ ان کے خلوص اور محنت کی وجہ سے ادارے کے تمام لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے خاص عزت اور محبت تھی۔ ان کی وفات ہم سب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

### اس شمارے میں،

- اداکارہ "فاطمہ نیازی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- کرن کے سالگرہ کے موقع پر قارئین سے سروے کا بقیہ حصہ،
- اداکارہ "نبیل" دو کے بہانے کے ساتھ، • نیا سلسلہ "آواز کی دنیا"، افتخار حسین سے باتیں،
- "مجھ سے ملیے" مصنفہ نایاب جیلانی سے ملاقات،
- "شادی مبارک ہو" شمع فردوس اور شمرینہ کی شادی کا احوال،
- فوزیہ یاسمین اور نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناول،
- "عشق آتش" سعدیہ راجپوت کا طویل ناول اختتامی مراحل میں،
- "او لبتی پون پاگل" فرحین اظفر کا مکمل ناول،
- "گوشۂ عافیت" شگفتہ بھٹی کا ناولٹ اختتامی مراحل میں،
- "محبت اب شروع ہوگی" فاخرہ گل کا ناولٹ،
- بشریٰ احمد، سلوی علی، سنبل، درشا خالد، میرا گل، سلمیٰ حسین، رشک حبیبہ اور عائشہ ندیم کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "موسم گرما اور آپ" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔



## حمد باری تعالیٰ

یارب! غضب کی دھوپ سے ہر دم بچا مجھے
اپنے کرم سے راستہ سیدھا دکھا مجھے

مجھ کو تو مار ڈالتے شاید یہ حادثات
رحمت نے تیری بڑھ کے دیا حوصلہ مجھے

تُو نے تفکرات کی کاٹی ہیں بیڑیاں
تُو نے ہی بندِ غم سے کیا ہے رہا مجھے

میں اس کرم کا شکر کروں کس طرح ادا
تُو نے بنایا اُمتیِ مصطفیٰ مجھے

دل کا گداز، اشکِ سحر، عشقِ مصطفیٰ
جو کچھ ملا ہے تیرے ہی کرم سے ملا مجھے

ہوتا رہے کرم ترا مجھ پر یہ بار بار
بطحا دکھا مجھے، کبھی طیبہ دکھا مجھے

ہر کام ہے خدا کے دو عالم کے ہاتھ میں
عابد نہیں جہاں میں کسی سے گلہ مجھے

خواجہ عابد نظامی

## نعت رسول مقبول

رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے
خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کہیے

شریعت کا ہے یہ اصرار ختم الانبیا کہیے
محبت کا تقاضا ہے کہ محبوبِ خدا کہیے

جبین و رُخ محمد کے تجلی ہی تجلی ہیں
کسے شمس الضحیٰ کہیے، کسے بدرالدجیٰ کہیے

جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش بن جائے
جب اُن کا نام آئے مرحبا صلی علیٰ کہیے

صداقت پر بنیاد رکھی گئی ہے دینِ فطرت کی
اسی تعبیر کو انسانیت کا ارتقا کہیے

محمد کی نبوت دائرہ ہے جلوۂ حق کا
اسی کا ابتدا کہیے، اسی کا انتہا کہیے

مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے
مری آنکھوں کو ماہر چشمۂ آبِ بقا کہیے

ماہر القادری

ماسی اور ملکہ کی

# فاطمہ آفندی سے ملاقات

شاہین رشید

جب کسی ڈرامے میں کوئی نیا چہرہ دیکھو تو تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نئے لوگ متعارف ہو رہے ہیں لیکن تواتر کے ساتھ نہیں بلکہ بہت آہستہ آہستہ۔ ایک نیا سیریل جب شروع ہوتا ہے تو تمام سینئر فنکاروں میں ایک آدھ چہرہ ہی نیا ہوتا ہے اور وہ بھی ثانی رول میں۔ لیکن یہ فنکار کا کمال ہے کہ وہ چھوٹے رول میں بھی اپنی صلاحیت منوا لیتے ہیں۔

"فاطمہ آفندی" نے بھی گیارہ سال کی عمر میں ٹی وی پہ پہلا ڈرامہ کیا پھر پڑھائی میں مصروف ہو گئیں اور اب جبکہ وہ بڑی ہو گئیں اور تعلیم سے بھی فارغ ہی ہونے والی ہیں تو ایک مرتبہ پھر وہ ڈراموں میں نظر آرہی ہیں۔ "ماسی اور ملکہ" جیسے مقبول شو میں انہوں نے شانو کا رول کر کے سب کو چونکا دیا اور اب وہ "تقریباً" ہر دوسرے سیریل میں نظر آرہی ہیں۔ آج کل آپ کو ڈرامے "لڑکیاں محلے کی" اور "صندل" میں دیکھ رہے ہیں۔ ان سے کچھ دلچسپ گفتگو ہوئی جو نذر قارئین ہیں۔

★ "کیسی ہیں فاطمہ۔۔۔ اور یہ تو بتائیں کہ آپ نے اپنے مقبول سیریل "ماسی اور ملکہ" کیوں چھوڑ دیا؟"

✻ "جی آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور "ماسی اور ملکہ" کے لیے میرا خیال ہے کہ میں نے بہت صحیح ٹائم پہ چھوڑ دیا ہے ایک تو بہت طویل ہو گیا تھا' پھر اس کی کہانی رک گئی تھی ایک ہی ڈگر پہ چلی جا رہی تھی تو میں نے سوچا کہ یہ مناسب وقت ہے کہ اس کو چھوڑ دوں۔"

★ "کیا آپ کا لہجہ بھی عام بول چال میں شانو جیسا ہی ہو گیا تھا؟"

✻ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لہجہ کافی خراب ہو گیا تھا اور میں جو سیریل بھی کر رہی تھی اس میں مجھے زیادہ پرابلم ہو رہی تھی۔ کیونکہ باوجود کوشش کے وہی لہجہ آجاتا تھا تو بس اس لیے بھی چھوڑ دیا۔"

★ "آج کل کیا کیا کر رہی ہیں؟"

✻ "میرے چار سیریز انڈر پروڈکشن ہیں جو کہ تقریباً ختم ہی ہونے والے ہیں اور بہت جلد آن ایئر ہو جائیں گے اور ایک سوپ کر رہی ہوں۔ ایک سیریل "کچھ کمی سی ہے" کے ڈائریکٹر مظہر معین ہیں اور اس میں میرا کردار بہت اچھا ہے۔ ایک تیز طرار لڑکی کا رول ہے۔ اس طرح ایک سیریل "پل صراط" ہے یہ حلال و حرام کے موضوع پہ ہے یہ سیریل اے ہن بی پروڈکشن کا ہے۔ "عشق عبادت" یہ سیریل برکت صدیقی کا ہے "عورت کا گھر کون سا ہے" اس سیریل کے ڈائریکٹر جاوید فاضل صاحب تھے۔ ایک دن پہلے میں نے ان کے ساتھ شوٹ کیا۔ اگلے دن ان کا انتقال ہو گیا اور یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک دن پہلے تک تو میں ان کے ساتھ تھی۔ اب اس سیریل کو عارف خان ڈائریکٹ کر رہے ہیں۔"

★ "مزید باتوں سے پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✻ "جی میرا نام فاطمہ آفندی ہے 17 دسمبر 1990ء کو میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ مجھے سب پیار سے فاتو یا فاتی کہتے ہیں میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرا نمبر آخری ہے اور سب کی لاڈلی ہوں۔ تعلیمی سلسلہ ابھی جاری ہے اور گریجویشن کر رہی ہوں اور والدین اور آپو اسید اوکا تعلق حیدر آباد سے ہے۔"

★ "منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی اب تک؟۔۔۔ اور نہیں تو اپنی پسند کو ترجیح دیں گی یا؟"

✻ "نہیں جی ابھی نہیں۔۔۔ اور ابھی دو تین سال شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ اور ایسا نہیں ہو گا کہ صرف میری پسند ہو اور ایسا بھی نہیں کہ صرف والدین کی پسند ہو۔ تو شادی اس سے کروں گی جس میں امی ابو کی پسند بھی شامل ہو گی اور میری پسند بھی شامل ہو گی۔"

★ "بالکل ٹھیک۔۔۔ اس فیلڈ میں کیسے آئیں۔ گھر والوں نے کوئی اعتراض کیا؟"

✻ "گھر والوں نے ہی مجھے شوبز میں آنے کا مشورہ دیا اور انہی کی خواہش پر میں اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ کیونکہ اس فیلڈ میں میری امی بھی ہیں اور میری خالہ بھی ہیں۔ میری امی کا نام "فوزیہ مشتاق" ہے اور انہوں نے کافی ڈرامے کیے ہیں اور میری خالہ "فرح ندیم" ہیں جنہیں آپ آج کل بھی کئی ڈراموں میں

دیکھ رہی ہیں۔ تو ان کی وجہ سے اور ان کی خواہش پہ میں اس فیلڈ میں آئی۔"

★ "آپ کی اپنی کوئی خواہش نہیں تھی کیا؟"

✻ "میں بحیثیت چائلڈ اسٹار کے اس فیلڈ میں آئی تھی اور جب گیارہ سال کی تھی تو میں نے پہلا ڈرامہ کیا تھا اور میری اس وقت کوئی خواہش نہیں تھی کیونکہ میں اپنی تعلیم کو مکمل کرنا چاہتی تھی۔ تو گھر والے یہی کہتے تھے کہ پڑھائی بھی ساتھ ساتھ کرو۔ اس طرح تم میں خود اعتمادی آجائے گی اور پھر جب تم باقاعدگی کے ساتھ اس فیلڈ میں آؤ گی تو تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

★ "پہلا پروگرام کون سا تھا اور شہرت کس پروگرام یا ڈرامے نے دی؟"

✻ "پہلا ڈرامہ "دام رسائی" کے نام سے کیا تھا اور یہ پی ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا اور میں بحیثیت چائلڈ اسٹار کے آئی تھی پھر 2001ء میں پھر ایک لمبا گیپ آگیا درمیان میں کچھ کمرشلز میں نے کیے اور تین چار سال پہلے میں نے دوبارہ ڈراموں میں کام شروع کیا اور اب ایک ڈیڑھ سال سے اہم کردار کرنے شروع کیے ہیں ورنہ آپ کو پتا ہی ہے کہ بچوں کے رول تو ایسے ہی ہوتے ہیں اور جس سوپ نے مجھے شہرت دی' مجھے پہچان دی وہ "ماسی اور ملکہ" ہے۔ جس میں میں نے شانو کا رول کیا۔"

★ "کبھی سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آکر اتنی شہرت مل جائے گی؟"

✻ "نہیں کبھی نہیں سوچا تھا اور اب مجھے مزا آرہا ہے اس فیلڈ میں آکر کام کرکے اور اپنی پہچان کروا کے۔"

★ "ماحول کیسا ہے؟"

✻ "ماحول اچھا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں اور بہت برے لوگ بھی ہیں۔ میں جب اس فیلڈ میں آئی تو یہاں کے لوگوں کے بارے میں اور ماحول کے بارے میں لاعلم تھی اسی لیے ہر ایک کے ساتھ اچھائی کرنا' خیال کرنا' مدد کرنا مجھے اچھا لگتا تھا لیکن جب رسپانس نہیں ملا۔ لوگوں نے قدر نہیں کی تو اب میں صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہوں میرے لیے سب کچھ میری فیملی ہے۔"

★ "اب تک کیے گئے ڈراموں میں کون سا کردار سب سے اچھا لگا؟"

✻ "یہ تو سوچنا پڑے گا۔۔۔ ہاں "میری ان سنی کہانی" میں مجھے اپنا کردار بہت اچھا لگا تھا اور اس میں مجھے اپنی پرفارمنس کافی اچھی لگی تھی۔ پھر "ماسی اور ملکہ" میں بھی مجھے اپنا کردار بہت اچھا لگا تھا۔ یہ ایک علیحدہ ہی تجربہ تھا کہ مجھے لہجہ بدل کر بولنا تھا اور اپنے آنے والے ڈراموں میں آپ "پل صراط" میں میرا رول دیکھیے گا۔ مجھے تو بہت اچھا لگا اب ناظرین کو کیسا لگتا ہے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

★ "ابھی تو آپ کو اس فیلڈ میں بہت کام کرنا ہے لیکن پھر بھی آپ چاہتی ہیں کہ کوئی کردار ملے نہ ملے فلاں کردار جلدی سے مل جائے؟"

✻ سوچتے ہوئے "کوئی بہت ہی چیلنجنگ رول ہونا چاہیے جیسے اندھی لڑکی یا فقیر لڑکی کا رول ہو۔ اس میں کافی محنت کرنی پڑے گی۔"

★ "نگیٹو رول ملیں تو؟"

✻ "میں نے نگیٹو رول بھی کیے ہیں اور میں مزید نگیٹو رول کرکے اور زیادہ تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہوں اور میری یہ بھی خواہش ہے کہ میں ہر کردار میں ایک مختلف گیٹ اپ کے ساتھ آؤں تاکہ لوگ بور نہ ہو جائیں۔ کیونکہ میں خود بہت بور ہو جاتی ہوں۔ لوگوں کو ایک ہی طرح کے رول میں دیکھ دیکھ کر۔"

★ "زندگی انجوائے کر رہی ہیں؟"

✻ "الحمد للہ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے میں بہت خوش ہوں اور میری دعا ہے کہ شادی کے بعد میری زندگی ایسی ہی اچھی گزرے۔"

★ "آپ یونیورسٹی بھی جاتی ہیں اور اداکاری بھی' ماڈلنگ بھی تو مشکل نہیں ہوتی کیا؟"



✻ "بہت مشکل ہوتی ہے' میں جب شوٹ پہ جاتی ہوں تو سب پوچھتے ہیں کہ آپ کی پڑھائی کب ختم ہو گی اور ہم کب تک آپ کے ٹائم پہ چلیں گے۔ مجھے احساس ہے کہ میری وجہ سے دوسروں کو کافی پریشانی ہوتی ہے اور آپ یقین کریں کہ اب تو گھر والوں کے لیے بھی ٹائم نکالنا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔ اور مجھے اس کا بہت احساس ہے۔"

★ "لوگ آپ کو اس فیلڈ میں آپ کے بڑے لے کر آئے ہیں کیا آپ کی بھی یہ خواہش تھی کہ میں اس فیلڈ میں آؤں؟"

✻ "سچی بات بتاؤں۔۔۔ ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ در حقیقت میں تو فیشن ڈیزائنر بننا چاہتی تھی اور میری پڑھائی بھی یہی ہے اور ان شاء اللہ میں فیشن ڈیزائنر بھی بنوں گی لیکن اب مجھے اس فیلڈ میں بھی مزا آرہا ہے۔ اس لیے اسے بھی جاری رکھوں گی۔ اکثر سوچتی ہوں کہ اس فیلڈ میں دیر سے آکر میں نے بہت سے سال ضائع کردیے ہیں۔"

★ "اپنی ڈائیٹ کا خیال رکھتی ہیں یا سب کچھ کھا لیتی ہیں؟"

✻ "خیال بھی رکھتی ہوں اور کھا پی بھی لیتی ہوں۔ مثلاً" خیال یوں کہ ناشتا ہلکا کرتی ہوں۔ پراٹھے کا استعمال نہیں کرتی اور کھانے میں اگرچہ سب کچھ کھا لیتی ہوں لیکن باربی کیو مجھے پسند ہیں۔ چائنیز بہت پسند ہے۔ یہ ایسے کھانے ہیں کہ اس سے موٹے ہونے کا امکان کم ہے۔"

★ "خود بھی کوکنگ کا شوق ہے؟ اور کوکنگ چینل دیکھتی ہیں؟"

✻ "میرے موڈ پر منحصر ہے۔۔۔ اگر موڈ ہو تو بہت کچھ پکا لیتی ہوں ورنہ نہیں اور مجھے اپنے ڈرامے دیکھنے کا وقت نہیں ملتا تو بھلا کوکنگ چینلز کیسے دیکھ سکتی ہوں۔"

★ "ارے اپنے ڈرامے بھی نہیں دیکھتیں؟"

✻ "کوشش کرتی ہوں کہ اپنے ڈرامے دیکھ لوں۔ دوسروں کے ڈرامے دیکھوں۔ ان سے کچھ سیکھوں اپنے ڈراموں میں اپنی غلطیاں نوٹ کروں۔۔۔ تاکہ بہتر سے بہتر پرفارمنس دے سکوں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب میں گھر آتی ہوں تو اتنی زیادہ تھکی ہوئی ہوتی ہوں کہ سو جاتی ہوں۔ مجھے نیند جلد آجاتی ہے اور میں Repeat بھی نہیں دیکھ پاتی۔ کوئی چھٹی کا دن مل ہو تو ٹیپ پہ دیکھ لیتی ہوں۔"

★ "موڈ کب خراب ہوتا ہے اور غصہ تیز ہے یا؟"

✻ "موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب کوئی میری بات نہ مانے۔ بچپن میں میرا غصہ تیز تھا مگر اب ٹھیک ہو گئی ہوں۔ پہلے چھوٹی سی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اب بڑی ہو گئی ہوں اس لیے غصے کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتی ہوں۔"

★ "پاکستانی چینلز شوق سے دیکھتی ہیں یا بیرونی چینل؟"

✻ "میں اپنے پاکستانی چینلز شوق سے دیکھتی ہوں ۔۔۔ بہت اچھا کام کر رہے ہیں ہمارے چینلز اور میں بیرونی چینلز نہیں دیکھتی کیونکہ میرا خیال ہے کہ

ہمارے پاکستانی زیادہ اچھا کام کر رہے ہیں "جیو" "اے آر وائی" "ہم" تمام چینلز بہت اچھے ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں مجھے انڈین چینلز بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔"

★ "لوگوں کو تو انڈیا میں کام کرنے کا کریز ہوتا ہے اور آپ کو چینل دیکھنا بھی پسند نہیں؟"

✻ "مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کسی نے آفر دی تو دیکھوں گی کہ اپنے اور اپنے کلچر کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی تو پھر سوچوں گی۔"

★ "عام زندگی میں آپ کیسی لڑکی ہیں۔ بہت زیادہ گھل مل جانے والی یا اپنی انا کے خول میں بند؟"

✻ "میں تھوڑی سی انا پرست لڑکی ہوں اور اپنی انا کو کم کرنا چاہتی ہوں مجھ میں یہ عادت ہے کہ کسی سے تھوڑی چڑ ہو جائے تو سوچتی ہوں کہ بس ٹھیک ہے آئندہ اس سے بات نہیں کروں گی۔ عزت نفس تو کبھی ختم نہیں کروں گی۔ بلکہ میں چاہتی ہوں کہ سب کی غلطیاں معاف کر دیا کروں۔ مجھ میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ میں بہت جلد لوگوں میں گھل مل جاتی ہوں اور ان کو جج نہیں کر پاتی اور ان پر اندھا بھروسہ کر لیتی ہوں، ٹھوکر کھاتی ہوں مگر پھر وہی حرکت کر بیٹھتی ہوں۔"

★ "گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے۔ سارے دن کی باتیں بتاؤں یا کوئی بات بھی نہ کرے؟"

✻ "گھر آ کر تو دل چاہتا ہے کہ امی ابو کے ساتھ گھر والوں کے ساتھ وقت گزاروں، ان کو سارا دن کی روداد سناؤں، ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور پھر اپنے کمرے میں جاؤں مگر میں اتنی زیادہ تھکی ہوئی ہوتی ہوں کہ میک اپ اتارے بغیر، کپڑے تبدیل کیے بغیر سو جاتی ہوں۔"

★ "لوگ پہچان لیتے ہیں اور آپ کے کام پر تنقید کرتے ہیں؟"

✻ "جی ہاں لوگ پہچان لیتے ہیں اور وہ لوگ جو پہلے امی ابو سے کہتے تھے کہ کیوں بچی کو اس فیلڈ میں لائے یہ فیلڈ اچھی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو اس فیلڈ میں نہیں آنا چاہیے۔ اب وہی لوگ کہتے ہیں کہ ہم آپ پہ فخر کرتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ ہماری رشتے دار ہے۔"

★ "چھٹی کا دن تو آرام کرتے ہی گزرتا ہو گا؟"

✻ "کہاں جی..... چھٹی کے دن اپنی پڑھائی کرتی ہوں۔ کچھ ادھورے کاموں کو مکمل کرتی ہوں کچھ گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

★ "ماڈلنگ میں مزا آتا ہے یا اداکاری میں؟"

✻ "مزا مجھے دونوں میں آتا ہے۔ ماڈلنگ آسان بھی ہے اور پیسہ بھی زیادہ ملتا ہے اداکاری مشکل ہے مگر رسپانس بہت اچھا ملتا ہے اور اپنی شخصیت سے ہٹ کر پرفارم کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔"

★ "فضول خرچ ہیں۔۔۔ اور موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

✻ "اس وقت موڈ خراب ہوتا ہے جب مجھے کہیں جانے میں دیر ہو رہی ہو اور گھر والے کہیں کہ اس کو ساتھ لے جاؤ۔ اس کو راستے میں ڈراپ کر دینا اور جب میری کوئی بات سمجھ ہی نہ رہا ہو تو غصہ بھی آتا ہے اور موڈ بھی خراب ہو جاتا ہے اور جہاں تک خرچ کی بات ہے تو فضول خرچ تو ہوں اپنے اوپر بھی بہت خرچ کرتی ہوں اور دوستوں کے اوپر بھی پیسہ اڑا دیتی ہوں۔"

★ "ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا؟"

✻ "جی ہاں میں ملک سے باہر جا چکی ہوں اور ڈرامے کے سلسلے میں نہیں بلکہ ایک کمرشل کے شوٹ کے لیے تھائی لینڈ گئی اور میں نے باہر جا کر یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ لوگ بہت پروفیشنل ہیں اپنے کام میں مخلص ہیں اپنے ملک کے لیے اور اپنے کام میں بہت آگے ہیں اور ترقی یافتہ ہیں اور ہم ان سے کتنے پیچھے ہیں۔"

★ "اپنے آپ کو عام لوگوں سے کتنا مختلف سمجھتی ہیں؟"

✻ "بہت مختلف سمجھتی ہوں۔ میری دوست کہتی ہیں کہ میں بور ہو رہی ہوں۔ اور میں اس بات پر ہنستی ہوں کہ ایک وقت تھا کہ جب میں بھی ایسے ہی بور ہوا کرتی تھی اور فضول ہی ادھر ادھر گھومتی تھی یا گھر میں بیٹھ کر بور ہوتی تھی اور اب یہ صورت حال ہے کہ گھر والوں کے لیے بھی میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

★ "کس ڈائریکٹر اور رائٹر کے ڈراموں میں کام کرنا پسند کریں گی؟"

✻ "جس ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرتے ہیں مجھے مزا آتا ہے اور میں ایزی فیل کرتی ہوں وہ مظہر معین ہیں اور بابر جاوید کے ساتھ بھی میں نے پانچ چھ سیریلز کیے ہیں بلکہ شروع شروع میں تو سب سے زیادہ ڈرامے ہی ان کے کیے ہیں میں نے اور اچھا لگتا ہے ان کے ساتھ کام کر کے مگر پھر بھی مجھے مظہر معین کے ساتھ کام کر کے اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ یہ حوصلہ افزائی بہت کرتے ہیں اور کسی بھی کردار کے لیے ان کا انتخاب بہت اچھا ہوتا ہے۔"

★ "کافی فنکاروں کے ساتھ کام کر چکی ہیں مگر پھر بھی خواتین و حضرات میں کوئی فنکار جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہو؟"

✻ "ویسے اللہ کا شکر ہے کہ اس کم عرصے میں کافی معروف فنکاروں کے ساتھ کام کر چکی ہوں جیسے فیصل قریشی بھائی، ثانیہ سعید وغیرہ جیسے اچھے فنکاروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ ہاں نادیہ جمیل کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے۔"

★ "کبھی واک یا ریمپ پہ واک کی؟"

✻ "نہیں کبھی نہیں اور نہ ہی میری ایسی کوئی خواہش ہے صرف چل کے آنا ہوتا ہے اور بس۔ کوئی پرفارمنس نہیں ہوتی اور مجھے کپڑوں میں بھی کافی ایشوز ہوتے ہیں۔ عجیب سا لگتا ہے جب سب لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔"

★ "ماسی اور ملکہ" بہت طویل چلا۔ کوئی ایسا سین تھا جس میں بہت ری ٹیکس دیے ہوں؟"

✻ "شروع شروع میں مسئلہ ہوتا تھا کیونکہ جب لہجہ بنانے کی کوشش کرتی تھی تو ایکسپریشن نہیں آتے تھے۔ جب لہجہ ٹھیک طرح سے پک کر لیا تو پھر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور آسانی سے سب کچھ ہو گیا۔"

★ "فلم کریں گی؟۔۔۔ کمرشلز کتنے کیے ہیں؟"

✻ "اگر کہانی اچھی ہو اور معیاری ہوئی تب۔۔۔ ورنہ نہیں اور کمرشلز تو میں کافی کر چکی ہوں۔ آج کل بھی کافی آن ایئر ہیں اور کچھ کی آفرز ہیں۔"

☼ ☼

# افتخار خان

شاہین رشید

کتاب اور ریڈیو انسان کی تنہائی کے بہترین ساتھی ہیں۔ سب ساتھ چھوڑ بھی دیں تو یہ کبھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتے جب تک کہ انسان خود ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔۔۔ اور اگر تجزیہ کیا جائے تو انسان نے کتاب کا ساتھ تو تقریباً" چھوڑ ہی دیا ہے۔ کتابیں طاق میں سج گئی ہیں اور لوگوں نے ان کو خریدنا بھی چھوڑ دیا ہے لیکن ریڈیو سے ناتا جوڑا ہوا ہے اور اب تو جب سے ایف ایم آیا ہے ریڈیو سننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ڈرائیونگ کے وقت' رات کی تنہائی میں' فارغ اوقات میں' لوڈ شیڈنگ کی بوریت ہو اور لوڈ شیڈنگ کے وقت کرکٹ کی کمینٹری سننی ہو یا ملک کے حالات سے آگاہی حاصل کرنی ہو ریڈیو بہترین ساتھی ثابت ہوتا ہے۔

ہمیں بہت سی کالز اور خطوط آتے ہیں کہ ریڈیو کے لوگوں سے بھی ملاقات کروایا کریں۔ لہٰذا ہم ایک نیا سلسلہ "آواز کی دنیا" سے شروع کر رہے ہیں۔

اس ماہ ہم آپ کی ملاقات ایف ایم 94.6 پشاور کے آر جے افتخار خان سے کروا رہے ہیں۔ امید ہے یہ سلسلہ قارئین کو پسند آئے گا۔

* "کیسے ہیں افتخار صاحب۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

☆ "میں ٹھیک ہوں اور مصروفیات تو ایف ایم کی ہی ہیں اور ساتھ ساتھ میں پشاور یونیورسٹی سے ایم بی اے بھی کر رہا ہوں۔"

* "گڈ۔۔۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

☆ "میں بنیادی طور پر خیبر ایجنسی سے ہوں آفریدی خاندان سے میرا تعلق ہے اور میں پشاور میں بیس جنوری کو پیدا ہوا اور کس سال پیدا ہوا یہ نہیں بتاؤں گا' میں یہ سسپنس برقرار رکھنا چاہتا ہوں' کیونکہ کچھ لوگ مجھے بیس سال کا سمجھتے ہوں گے تو کچھ اس سے زیادہ کا۔"

* "ایف ایم والے اپنی آواز کی وجہ سے ہمیشہ جوان رہنا پسند کرتے ہیں۔۔۔ آپ نے کہا کہ آفریدی خاندان سے آپ کا تعلق ہے تو کیا شاہد آفریدی سے بھی کوئی رشتہ ہے؟"

☆ "میں ماشاء اللہ سے ابھی جوان ہی ہوں۔۔۔ (قہقہہ) اور شاہد آفریدی سے اتنا تعلق ہے کہ وہ بھی پاکستانی ہے اور میں بھی' وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی۔"



* "جی آپ اپنی فیملی کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

☆ "جی میں آپ کو بتا رہا تھا کہ آفریدی خاندان سے ہمارا تعلق ہے۔ میں جب آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا تو میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا والد صاحب حیات ہیں اور آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور میری ماشاء اللہ چار بہنیں ہیں۔ تین کی شادیاں ہو چکی ہیں ایک چھوٹی ہے اور میرے ایک بڑے بھائی ہیں جو بی بی سی انڈر 19 کے منیجر بھی ہیں ان کا نام فخر عالم ہے اور میری تعلیمی قابلیت کچھ یوں ہے کہ ایم ایس سی اکنامکس کمپیوٹر کورس' پشاور یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا ہوں اور اس کے بعد ایک اور ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔"

* "اتنی ڈگریاں لے کر کیا کریں گے۔ ایف ایم کے علاوہ کہیں جاب بھی کرتے ہیں؟"

☆ "مجھے پڑھنے کا شوق ہے اور یقیناً" یہ ڈگریاں میرے کام آئیں گی۔ ابھی میں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیونکہ ایک سے فارغ ہوتے ہی میں دوسرے ایم اے میں داخلہ لے لیتا ہوں اور جاب کے لیے میں نے ابھی تک کہیں اپلائی نہیں کیا۔"

* "ایف ایم تو لوگ پارٹ ٹائم جاب سمجھ کر کرتے ہیں اور آپ؟"

☆ "میں بھی اسے پارٹ ٹائم جاب سمجھ کر کرتا ہوں اور اسے ہوائی روزی بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لوں پھر کہیں جاب کروں گا کیونکہ جاب تو کرنی ہی ہے۔ اس پر تو انحصار نہیں کرتا۔"

* "اور جاب ملنے پر ہی شادی کرنے کا ارادہ ہے؟ ویسے آپ بننا کیا چاہتے تھے؟"

☆ "جی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ ویسے مجھ سے بڑے بھائی نے بھی شادی نہیں کی اور ان کی ہو گی تو پھر میرا نمبر آئے گا اور جہاں تک بننے کی بات ہے تو بچپن میں مجھے شوق تھا کہ میں آرمی میں جاؤں۔ پھر میڈیکل کی سائیڈ پہ دھیان چلا گیا۔ لیکن جب ایف ایس سی میں نمبر کم آئے تو میں دل برداشتہ ہو گیا اور میں نے سوچ لیا کہ میں نے پڑھنا ہی نہیں ہے اور تقریباً" چار ماہ میں گھر میں ہی رہا اور کچھ نہیں پڑھا لیکن سوچا کہ اس طرح تو گزارا نہیں ہو گا۔ تو پھر پڑھائی دوبارہ شروع کی اور اب میرا ارادہ اکنامسٹ بننے کا ہے۔"

* "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی اور کب سے شوق تھا آپ کو؟"

☆ "جب میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا تو پہلی بار پشاور میں پہلی مرتبہ ایف ایم متعارف ہوا اور یہ ایف ایم 101 تھا اور اسے سن کر بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سی آوازیں' ساتھ ہی میوزک مگر پھر آہستہ آہستہ اس ایف ایم نے مجھے بہت متاثر کرنا شروع کر دیا اور میرا بھی دل چاہا کہ میں بھی ایف ایم میں جا کر کام کروں لیکن مجھ میں اتنی زیادہ خود اعتمادی نہیں تھی کہ میں ان لوگوں کی طرح پروگرام کر لیتا جن کو میں روز سنتا تھا۔ آڈیشن دینے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔۔۔ پھر کچھ عرصے کے بعد پشاور میں ہی ایف ایم 104 کا اجرا ہوا اور وہاں میں نے ہمت کر کے آڈیشن دیا۔ تو میں کامیاب ہو گیا پھر میری ٹریننگ ہوئی اور اس کے بعد میں نے باقاعدگی سے پروگرام شروع کیا۔ مجھے جنون کی حد تک شوق تھا ایف ایم میں پروگرام کرنے کا۔"

* "اتنا جنون تھا مگر خود اعتمادی نہیں تھی کیوں اور ہمت کس نے دلائی؟"

☆ "آپ بھی سن کر حیران ہوں گی اور میرے سامعین بھی کہ میں بہت زیادہ شرمیلا انسان تھا اور نہ صرف شرمیلا بلکہ خاموش ـــــ اور تنہائی پسند بھی اور تنہائی پسند تو خیر میں اب بھی ہوں۔ اکیلے میں بیٹھنا مجھے اچھا لگتا ہے اور ہمت کس نے دلائی تو بس قدرت نے مجھے ہمت دلائی ایک دم سے ہی میری نیچر میں تبدیلی آئی اور میں نے سوچ لیا کہ مجھے ایف ایم میں کام کرنا ہی ہے اور پھر اللہ نے مجھے کامیابی دی۔"

* "کتنے سال ہوگئے آپ کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے اور کس کس دن اور کس وقت آپ کے پروگرام ہوتے ہیں؟"

☆ "میں تقریباً" پانچ سال سے ایف ایم پہ کام کر رہا ہوں 2005ء میں جوائن کیا تھا اور 2006ء میں آن ایئر ہوا۔۔۔ اور میں روزانہ ایف ایم 94.6 سے رات کو آٹھ بجے سے دس بجے تک پروگرام کرتا ہوں اور ہمارے پروگرام کا نام ہے "پشتو بلا گلا" ہے اور اس میں بس ہلا گلا ہی ہوتا ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ پشتو کا پروگرام ہے مگر ایسا نہیں ہے اس میں اردو کا ٹچ بھی ہم دیتے ہیں۔۔۔ آج سے تقریباً" دو مہینے پہلے حیث ورک پہ ہمارا پروگرام ہوتا تھا وہ کس پروگرام تھا۔"

* "پشتو کے سامعین زیادہ ہیں اور اردو بھی تو لوگ سمجھتے ہیں؟"

☆ "جی بالکل سمجھتے ہیں۔ جیسے مانسہرہ' ایبٹ آباد اور پشاور سٹی کے لوگ اردو بولتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں تو ان کی فرمائش ہوتی ہے کہ اردو بھی شامل ہونی چاہیے۔"

* "2006ء سے آپ کے پروگرام آن ایئر آرہے ہیں۔ شرمیلا پن تو ختم ہو گیا ہو گا تو کیا ٹی وی کی طرف جانے کا خیال کبھی نہیں آیا؟"

☆ "ٹی وی میں ایک مرتبہ آڈیشن کے لیے گیا تھا اور سلیکشن بھی میرا ہو گیا تھا۔ مگر گھر سے اجازت نہ ملی کہ میں ٹی وی پہ کام کروں۔"

* "اجازت کا مسئلہ تو لڑکیوں کو ہوتا ہے؟"

☆ قہقہہ ـــ "نہیں ایسی بات نہیں مگر کیا کریں کہ ہماری کچھ روایات ایسی ہیں کہ جن کی ہم کو پاسداری کرنی پڑتی ہے اور روایات سب کے لیے برابر ہیں خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ آزادی ہو تو سب کے لیے نہیں تو پھر لڑکوں کے لیے بھی نہیں ہونی چاہیے۔"

* "گھر میں کون منع کرتا ہے والد صاحب؟"

☆ "نہیں والد صاحب نہیں' بڑے بھائی منع کرتے ہیں۔۔۔ ویسے میرا اپنا بھی بہت زیادہ شوق نہیں ہے اور میں میڈیا میں زیادہ آگے نہیں جانا چاہتا اور ہمارے دوست جو گلوکار ہیں وہ مجھے کہتے ہیں کہ ہمارے گانوں کے لیے ماڈلنگ کرو لیکن عجیب سا لگتا ہے۔ ویسے اگر کبھی ٹی وی میں کام کرنے کی اجازت ملی تو پھر میری خواہش ہوگی کہ میں "ٹاک شو" کروں میں ہوسٹ بننا چاہتا ہوں۔"

* "آپ کے خیال میں تمام ایف ایم ایک جیسے ہوتے ہیں یا ان میں کچھ فرق بھی ہوتا ہے؟"

☆ "میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ کوئی بھی ایف ایم اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہا ہے۔۔۔ ہم صرف میوزیکل سائیڈ پہ بھی جا رہے ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ہر موضوع پہ بات کرتا ہوں تاکہ لوگوں کے علم میں آئے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ آج کل کے حالات کیا ہیں اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

* "آپ ایف ایم میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"

☆ "میں چاہتا ہوں کہ صرف تفریح نہ ہو بلکہ اس میں آج کل کی مناسبت سے ہر موضوع پہ بات ہونی چاہیے اور پروگرام ایسا ہو کہ اس سے کچھ حاصل کریں۔ معلوماتی پروگرام ہونا چاہیے اور ساتھ ساتھ تفریح بھی۔۔۔ اور میں اگر پشاور یا خیبر پختونخواہ کی بات کروں تو ہمارا ایف ایم زیادہ تر دیہاتوں میں سنا جاتا ہے تو دیہات کے لوگوں کے لیے کچھ ایسی بات ضرور ہونی چاہیے جس میں ان کے لیے معلومات ہوں اب تعلیم کی کمی کی وجہ سے کسی کو اپنے حقوق کے بارے میں نہیں پتا' ہمیں بتانا چاہیے کہ آپ کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور اس کو پورا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ لوگ محنت کرتے ہیں مگر صلہ نہیں ملتا اس کا ذمہ دار کون ہے یہ سب لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔"

* "رات آٹھ بجے سے دس تک آپ کا پروگرام ہوتا ہے۔ لائیو کالز بھی آپ لیتے ہیں۔ فون کرنے والوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے یا لڑکوں کی؟ اور کوئی ایسی کال جس کے بارے میں آپ بتانا چاہتے ہوں؟"

☆ "لڑکے اور لڑکیاں دونوں کی ہی آتی ہیں اور لڑکیاں کبھی کبھی بہت بولڈ بھی ہو جاتی ہیں مجھے یاد ہے کہ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ لڑکیوں نے آن ایئر مجھے I Love you کہا۔ اس وقت میں خاموش ہو گیا۔ اب ان کو میں کیا جواب دیتا۔"

* "اس قسم کی کالز آتی ہیں کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں یا آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ تو پھر آپ کیا کرتے ہیں کال کٹ دیتے ہیں کیا؟"

☆ "ایسی کالز اکثر آتی رہتی ہیں اور میں بند تو نہیں کرتا اور موڈ پہ بھی منحصر ہے۔ اگر موڈ بہت اچھا ہے تو مزاحیہ جواب دیتا ہوں۔۔۔ ورنہ تو بس ایسا ہی کوئی جواب دے دیتا ہوں کہ جیسے یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

* "ڈائریکٹ آپ کے پاس کالز آتی ہیں یا پہلے آپریٹر کے پاس جاتی ہیں؟"

☆ "ڈائریکٹ میرے پاس ہی آتی ہیں' کیونکہ ایک آر جے خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس کو آن ایئر لے کر جانا ہے اور کس کو آن ایئر لے کر نہیں جانا۔"

* "ریڈیو کے لوگ تو آپ کے انداز اور آپ کی آواز کو پسند کرتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ عام پبلک بھی آپ کو پہچانے؟"

☆ "نہیں ایسا کچھ دل نہیں چاہتا جب میں آر جے بنا تو ایک سال تک بہت خواہش تھی کہ لوگ مجھے پہچانیں اور پہچانے بھی لگے۔ مگر پھر میں اپنے آپ کو چھپانے لگا کہ ...... پرائیویٹ لائف زیادہ اہم ہوتی ہے۔ لوگ آواز سے بھی پہچان جاتے ہیں اور باوجود اس کے کہ میں کہوں کہ نہیں میں تو کسی آر جے اختیار کو نہیں جانتا ان کا یہی اصرار ہوتا ہے کہ آپ تو وہی ہیں۔"

* "ایف ایم سے ملنے والے معاوضے سے مطمئن

ہیں آپ؟ سیلری ہے یا روزانہ کی بنیاد پر معاوضہ ملتا ہے؟"

☆ "روزانہ کی بنیاد پر معاوضہ ملتا ہے اور اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن اچھا ہے میں مطمئن ہوں مگر اور زیادہ اچھا ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔"

* "آپ کے خیال میں ریڈیو زیادہ سنا جاتا ہے یا ٹی وی زیادہ دیکھا جاتا ہے؟"

☆ "میرا خیال ہے کہ ٹی وی زیادہ دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ایف ایم آجانے کی وجہ سے ریڈیو کے سننے والوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ گاؤں دیہاتوں میں اور ڈرائیونگ کے وقت بھی لوگ ریڈیو سنتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں کہوں گا کہ ٹی وی دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

* "ریڈیو میں کسی سے کوئی شکایت آپ کو جو آپ اس انٹرویو کے ذریعے سے بتانا چاہیں؟"

☆ "الحمد للہ یہاں ایسا کوئی بندہ نہیں ہے کہ جس سے مجھے کوئی شکایت ہو یہاں تو سب ایک دوسرے سے پیار کرنے والے لوگ ہیں۔ بس میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ زیادہ تر آر جے جو پروگرام پریزنٹر ہوتے ہیں اس کو اتنی عزت ضرور دیں کہ وہ خوش ہو کر آپ کا پروگرام کرے۔ بعض ایف ایم ایسے ہیں، جو "آر جے" کی عزت نہیں کرتے ان لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ پروگرام کی وجہ سے ہی آتے ہیں۔"

* "بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پٹھانوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ غصے کے تیز ہوتے ہیں۔ آپ اپنے بارے میں کیا کہیں گے؟"

☆ "ہاں یہ تو آپ نے ٹھیک کہا کہ پٹھانوں میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اور مجھے بھی غصہ زیادہ آتا ہے مگر گھر میں۔ گھر سے باہر نہیں کوشش کرتا ہوں کہ گھر سے باہر کے لوگوں کو اپنا غصہ نہ دکھاؤں۔"

* "ایف ایم کے کسی دوسرے چینلز سے آپ کو آفر آئی اور پروگرام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانے کا اتفاق ہوا؟"

☆ "ویسے تو لاہور، اسلام آباد جانے کا اتفاق تو ہوتا رہتا ہے۔ لیکن پروگرام کے سلسلے میں ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور اپنے ویسے کے سارے شہر بہت اچھے ہیں۔"

* "آپ کے شہر پشاور میں آئے دن بم بلاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے موت سے؟"

☆ "نہیں بالکل نہیں ہم لوگ اب ان حالات کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ہر برے وقت کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں اور موت تو برحق ہے۔ جس انداز میں لکھی گئی ہے وہ تو آنی ہے۔"

* "سیاست دانوں سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

☆ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جو بندہ صدارت کی کرسی پر بیٹھتا ہے وہ خود اتنا سمجھ دار ہوتا ہے کہ اسے کوئی کیا سمجھا سکتا ہے۔ میں اگر ان لوگوں کی جگہ ہوتا اور دیکھتا کہ ملک مجھ سے نہیں سنبھل رہا تو میں تو استعفیٰ دے دیتا ہمارے سیاست دان اپنی سیکیورٹی تو آئے دن بڑھا دیتے ہیں اور عوام کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔"

* "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں اور فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

☆ "فارغ وقت تو میں اپنے ایک کزن کے ساتھ گزارتا ہوں اور چھٹی کا دن بھی اسی کے ساتھ گزارتا ہوں۔"

* "کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

☆ "کچھ زیادہ نہیں اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس قناعت پسند ہوں۔ جو کھانے کو مل جائے صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتا ہوں۔ البتہ میں صفائی پسند بہت ہوں جس دن چھٹی ہوتی ہے اپنا کمرہ خود ہی صاف کر لیتا ہوں۔"

* "ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا؟"

☆ "ہاں جی۔ افغانستان گیا ہوں اور کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ ویسے دنیا گھومنے کا بہت شوق ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے افتخار خان صاحب سے اجازت چاہی۔

## دو کا پہاڑہ

# نبیل

شاہین رشید

1 "کوئی دو نام جن کے لیے آپ کی خواہش تھی کہ کاش یہ میرے ہوتے؟"

* "اصل میں میرا نام ندیم تھا جس کو تبدیل کر کے نبیل رکھ لیا گیا۔ ویسے مجھے عیسیٰ اور موسیٰ بہت پسند ہیں۔ جو کہ میرے بیٹوں کے نام ہیں میرے بڑے بیٹے کا نام موسیٰ اور چھوٹے کا نام عیسیٰ ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبرز؟"

* "مجھے لگتا ہے کہ ایک اور نو ہے۔"

3 "دو تاریخی ادوار جس میں آپ جانا چاہتے ہیں؟"

* "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور بہت اعلا دور تھا۔۔۔ میں اس دور میں جانا چاہوں گا اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کا دور۔۔۔ کہ لوگ کیا سوچتے تھے کیا کھاتے تھے۔ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔"

4 "کوئی دو افراد جن کے SMS کے جواب آپ فوراً دیتے ہیں؟"

* "عموماً تو میں سب کو ہی جواب دے دیتا ہوں' لیکن جہاں تک فوری جواب کا تعلق ہے تو ایک تو بیگم ہیں اور دوسری۔۔۔ بھی بیگم ہی ہیں۔"

5 "کوئی دو بری باتیں جن سے آپ چھٹکارا پانا چاہتے ہیں؟"

* "ایک بری عادت تو یہ ہے کہ میں تنقید بہت کرتا ہوں۔ اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں اور دوسری یہ کہ میں بہت حساس ہوں اور مجھے اپنی یہ عادت بھی پسند نہیں ہے۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"

* "کوشش کرتا ہوں کہ نہ بولوں اس لیے مجھے سوچنا پڑ رہا ہے کہ میں کون سے جھوٹ اکثر بولتا ہوں۔ کوئی ایسی بات۔ جس سے مجھے اندازہ ہو کہ دو لوگوں میں لڑائی ہو جائے گی تو لڑائی سے بچانے کے لیے جھوٹ بول دیتا ہوں اور تو کچھ یاد نہیں آ رہا میرے اطراف کے لوگ میرے بارے میں بہتر بتا سکتے ہیں۔"

7 "کن دو باتوں پر آپ کو غصہ آ جاتا ہے؟"

* "ایک تو یہ کہ کوئی مجھے بے ایمان کہے یا میری ایمانداری کو کوئی چیلنج کرے اور دوسری بات یہ کہ کوئی جہالت کی بات کرے۔"

8 "موجودہ دور کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرچی سے آئے ہیں؟"

* "نہیں اس حوالے سے تو میں کچھ نہیں کہنا چاہوں گا کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی پرچی سے آیا ہو گا۔ سب ہی بہت اچھا پروگرام کرتے ہیں۔"

9 "مارننگ شو کے دو اینکر جو بہترین پروگرام کرتے ہیں؟"

* "Atv کی فرح حسین اور آج ٹی وی کی "سویرا ندیم" بہت اچھا پروگرام کرتی ہیں۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

* "دو تو نہیں تین ہیں جو میرے بہت ہی اچھے اور قابل بھروسہ ہیں ان میں طارق بٹ' علی عمران یہ ہمارے رائٹر ہیں اور رانا رضوان جو کہ ڈائریکٹر ہیں ملنے کے۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"

* "میں دنیا گھومنا چاہتا ہوں اپنے گھر کے دوستوں کے ساتھ جیسے علی عمران اور رانا رضوان ان کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتا ہوں مشہور شخصیات کے ساتھ نہیں۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟"

* "عبدالستار ایدھی اور عمران خان۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"

* "عید اور رمضان المبارک۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

* "علی الصبح کا وقت اور رات گئے۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟"

* "اگر کسی سے ملاقات کرنا اچھا لگتا ہے تو کہتا ہوں کہ "آپ سے ملاقات کر کے اچھا لگا اور اللہ آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔"

16 "دو کھانے جن کو کھا کر آپ کبھی بور نہیں ہوتے؟"

* "پلاؤ اور سبزی گوشت۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں آپ شرم محسوس نہیں کرتے؟"

* "ماں اور بیوی۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ

کرکٹ دیکھتے ہیں؟"

* "آج کے دور میں مجھے شعیب اختر بہت پسند ہے اور پھر شاہد آفریدی۔"

19 "دو خوب صورت دن جو گزر چکے ہیں؟"

* "میرا سیریل "دھواں" جب ہٹ ہوا اور دوسرا وہ دن جب میری شادی ہوئی۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"

* "موبائل اور گاڑی کی چابی۔"

21 "دو الفاظ یا محاورے جو آپ بہت استعمال کرتے ہیں؟"

* "ایک تو میں Obviously بہت بولتا ہوں اور دوسرا I mean بہت بولتا ہوں۔"

22 "دو پسندیدہ صحافی؟"

* "میرا پرانا دوست، طاہر سرور میر اور طلعت حسین۔"

23 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

* "جمعہ اور اتوار۔"

24 "بارہ مہینوں میں سے کون سے دو مہینے اچھے

لگتے ہیں؟"
* "ستمبر میں میری سالگرہ ہوتی ہے اور اکتوبر میں میری بیٹی کی سالگرہ ہوتی ہے۔"
25 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"
* "میرا بیڈ روم اور لاؤنج۔"
26 "گھر کے دو کام جو آپ کو کرنا پسند نہیں؟"
* "استری کرنا اور کھانا پکانا۔"
27 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ؟"
* "اسکاٹ لینڈ اور پیرس۔"
28 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"
* "سارے ہی بوجھ ہیں کسی ایک کو نہیں کہا جا سکتا۔"
29 "کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟"
* "جرمنی اور انگلینڈ۔"
30 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"
* "گرین اور بلیک۔"
31 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"
* "لاہور اور کراچی۔"
32 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"
* "سردی اور بہار۔"
33 "لڑکیوں کی دو ناپسندیدہ باتیں؟"
* "ایک تو یہ کہ پاؤں صاف کریں یا صاف رکھا کریں اور دوسری یہ کہ خوشبو اچھی لگایا کریں۔"
34 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتے ہیں؟"
* "پانی پیتا ہوں اور پھر واک پہ جاتا ہوں۔"
35 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا؟"
* "میری ماں، میری بیوی اور تیسری میری بیٹی فاطمہ ہو گی جو کہ ابھی دو سال کی ہے۔"
36 "آپ کے نزدیک دنیا کی دو خوب صورت ترین خواتین؟"
* "ایشوریا رائے اور کرینہ کپور۔"
37 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"
* "میڈیسن اور اداکاری۔"
38 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان؟"
* "سیاست سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی لگتا ہے کہ کلنٹن اور ایک نیویارک کا میئر تھا جولیانی وہ اچھے تھے۔"
39 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"
* "ایک تو یہ کہ آپ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور دوسری یہ کہ زندگی میں کوئی شارٹ کٹ اختیار نہیں کرنا۔"
40 "اپنے دو ڈرامے جو آپ فراموش نہیں کر سکتے؟"
* "دھواں اور عجائب خانہ۔"
41 "دو کردار جو آپ نے ابھی تک ادا نہیں کیے؟"
* "کردار تو بہت سارے ہیں۔"
42 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"
* "انسان زندگی میں بہت سے فیصلے کرتا ہے جو غلط بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مگر مجھے کوئی ایسا فیصلہ یاد نہیں جس نے مجھے نقصان پہنچایا ہو۔"
43 "کوئی دو فیصلے جن سے آپ کو کامیابی ہوئی ہو؟"
* "کراچی آنا اور شادی کرنا۔"
44 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں؟"
* "میں کوشش کرتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں اور میری وجہ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔"
45 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"
* "ویسے تو ہمیں ساری نمازیں پڑھنی چاہئیں، لیکن فجر اور ظہر اکثر میرے ہاتھ سے آجاتی ہیں۔"
46 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"
* "کپڑے، گھڑیاں اور پرفیوم۔"
47 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"



* "والدہ اور والد تو حیات ہیں نہیں۔"
48 "دو لوگ جن کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے؟"
* "ہمارا جو ڈرامہ چل رہا ہے "بلبلے" اس کے ڈائریکٹر رانا رضوان اور رائٹر علی عمران کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتا۔"
49 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"
* "اورنج جوس اور فالسے کا جوس۔"
50 "ملک میں دو تبدیلیاں ضروری ہیں؟"
* "میرے خیال میں ایجوکیشن سسٹم تبدیل ہونا بہت ضروری ہے اور سیاسی سسٹم بھی تبدیل ہونا ضروری ہے اور یہاں بھی جمہوریت کہنے کو ہے ورنہ تو خاندانوں کی سیاست چل رہی ہے۔"
51 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"
* "سجاد علی اور راحت فتح علی دونوں بہت سریلے ہیں۔"
52 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتے ہیں؟"
* "بس مجھے تو ایک ہی رسم اچھی لگتی ہے اور وہ مہندی کی رسم ہے۔"
53 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"
* "جب مجھے لگے کہ کوئی مجھے بے وقوف بنا رہا ہے، مجھے نظر انداز کر رہا ہے، مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔"
54 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"
* "اچھا سلا ہوا ہو اور میری پسند کا رنگ ہو۔"
55 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"
* "بارش میں بھیگنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس دیکھنا اچھا لگتا ہے۔"
56 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
* "کیڑوں سے نہیں ڈرتا، کیڑوں کو میں ڈراتا ہوں۔"
57 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"
* "پٹھان کی کڑاہی جو کہ کلفٹن میں ہے اور ایک میرے دوست کا ریسٹورنٹ ہے Ole وہاں کھانا کھا کر بہت مزا آتا ہے۔"
58 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"
* "پارک ٹاور اور فورم۔"
59 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟"
* "نیوز چینل اور اے آر وائی کیونکہ اس کے ساتھ میں زیادہ کام کرتا ہوں۔ بحیثیت پروڈیوسر میرا پہلا ڈرامہ بھی اے آر وائی سے چلا تھا۔"
60 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"
* "چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر سکوں، صبح جلدی اٹھ سکوں۔"
61 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"
* "سلاد اور سبزی۔"
62 "دو چیزیں جو آپ کے والٹ میں لازمی ہوتی ہیں؟"
* "میرے بچوں، میری فیملی کی تصاویر اور میرا آئی ڈی کارڈ۔"
63 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"
* "میں وزیراعظم اور صدر کو اغوا کروں گا اور تاوان میں ان سے ملک کے لوگوں کے لیے صاف پانی اور بجلی مانگوں گا۔"

☼ ☼

# صاحبہ سے ملیے

نایاب جیلانی

1 "تاریخ پیدائش/اسٹار؟"
"10 اپریل 1988ء/حمل۔"

2 "خدا سے تعلق؟"
"وہ کون سا مسلمان ہے جو اپنے رب سے تعلق کے بغیر زندگی کو زندگی سمجھتا ہے۔ جو اس لذت سے محروم ہے۔ وہ دنیا اور آخرت کی ہر نعمت سے محروم ہے۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ میں جو بات کسی سے نہیں کر سکتی' وہ اپنے رب سے کرتی ہوں اور یہ میری عادت ہے یا فطرت کہہ لیں۔ یہ بچپن سے میرا معمول رہا ہے۔"

3 "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
"جب میں فارغ ہوتی ہوں روز مرہ کے کاموں سے تو میں لکھتی ہوں۔ بے تحاشا لکھتی ہوں۔ لکھتے وقت رات اور دن نہیں دیکھتی۔ بس ایک خاص موڈ کے زیر اثر لکھنا شروع کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ایک ناول تین دن میں مکمل ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے بھی پہلے۔ فرصت کے لمحات مجھے کم میسر آتے ہیں۔"

4 "کون سی چیز خوشگوار تاثر قائم کرتی ہے؟"
"اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ کون سی چیز میرے موڈ کو خوشگوار کرتی ہے۔ جو مجھے خوشی بخشتی ہے" تو وہ چیز ہے دوستوں کے میسجز نبیلہ عزیز' زبیر تفضل' قصی اکرم' یاسمین افضل اور مدیحہ زاہد (کزن) کا ہمیشہ یاد رکھنا۔ یادوں میں' باتوں میں اور میسجز میں۔"

5 "وہ چیز جو موڈ خراب کردے؟"
"نیند سے جگایا جانا.... یا پھر غلطی سے ثاقب اگر اپنا کوئی ذاتی کام کہہ دیں۔" (قہقہہ)

6 "مشکل ترین لمحہ؟"
"آپریشن تھیٹر.... جب میرا سیزرین ہو رہا تھا اور میں بے ہوش نہیں تھی۔ ڈاکٹر سعدیہ آپریشن کر رہی تھیں اور شاید ڈاکٹر غلام فاطمہ بھی تھیں اور ڈاکٹر ظفر میرے سر کی طرف بیٹھے تھے اور بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے۔ میری زندگی کا سب سے مشکل ترین یہی لمحہ تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ آپریشن تھیٹر سے نکل کر دنیا کو پھر سے دیکھ پاؤں گی؟ اور یادگار لمحہ بھی وہ ہی تھا جب ڈاکٹر ظفر نے ہی سب سے پہلے مجھے بیٹی کی مبارک دی تھی اور میں نے ننھی (بیٹی) کا پہلا دیدار کیا تھا۔"

7 "بہترین تعریف جو وصول کی؟"
"بجیا! تیرا دماغ ہے یا کمپیوٹر۔" (از تنزیلہ شاہد)

8 "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
"گھوڑے بیچ کر سو جانا۔"

9 "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
"جب 30 جون کی سہ پہر داو شاہد (بھائی) کی فون کال آئی۔ "بجو! کرکٹ میچ کے دوران لڑائی ہوگئی ہے اور قلب عباس کو گولیاں لگ گئی ہیں۔ اس کا بچنا مشکل ہے اور مجھے لگتا ہے" آج کے بعد خدا کی زمین ہم پر تنگ ہو جائے گی۔ یہ میری زندگی کا خوفناک' وحشت ناک واقعہ ہے۔ جو کبھی بھول نہیں سکتا۔"

10 "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
"ایک سچی اور خاص مسکراہٹ۔"

11 "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
"محمد بن قاسم' سندھ کا فاتح اگر اس دور میں ہوتی تو ضرور ملتی۔"

12 "پسندیدہ ساتھی؟"
"جو زندگی کا ساتھی ہے.... سید ثاقب عباس ترمذی۔"

13 "پسندیدہ ہستی؟"
"آنٹی جان (ثمر افضل وڑائچ) اور آمنہ اور عذرا کی ممانی۔"

14 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"ڈاکٹر اگر وہ قصائی نہ بنے تو وہ کاندار ی نہ چمکائے' مسیحا بنے۔"

15 "بہترین کاوش؟"
"جلتے سلگتے (ہر جنگ میں ہمارے جنگجوؤں کی کسی نہ کسی حسن کی دیوی سے ملاقات ہوتی رہی تھی۔ (ماشاء اللہ)"

16 "پسندیدہ ملکیت؟"
"اولاد.... بہترین ملکیت ہے۔ جب تک چاہیں حکومت کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ بیٹے کی شادی نہ ہو۔"

17 "زندگی کی خواہش؟"
"زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ داو (بھائی) سے گلے ملوں' اس کا چہرہ چوموں' اس کے ہاتھ پکڑوں.... بس درمیان میں جیل کی سلاخیں نہ ہوں۔"

18 "پریشان کن لمحہ؟"
"جب اچانک کسی کو بھی بتائے بغیر ابو نے پولیس کو سول کپڑوں میں گھر بلوایا تھا اور داو کو ان کے حوالے کر دیا۔ پھر روئے اور بے تحاشا روئے.... اور اس سے بھی پہلے جب داو نے مجھ سے کہا۔ "بجو! مجھے آج یوں لگتا ہے کہ کچھ انوکھا ضرور ہوگا۔ ابو پراسرار دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے اچھے کپڑے نکال کر دو۔ میں نہا لیتا ہوں۔ چل تاعمل بھی لیتے ہیں۔ نجانے پھر ملنا کب نصیب ہو۔ مجھے لگتا ہے آج اسیری کا دن ہے۔" اس کی چھٹی حس نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ اور اس کی باتیں مجھے رلا رہی تھیں۔"

19 "جب موڈ آف ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
"جب موڈ آف ہوتا ہے تو لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔ بس موڈ خود بہ خود ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

20 "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
"امی۔"

21 "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
"اس وقت جب ثاقب اچھا سا ڈریس اپ ہونے کی فرمائش کر دیں اور ساتھ ہدایات بھی جاری ہوں۔ آج کل یہ "فن" ہے ایسا ہونا چاہیے اور میرے جیسے درویش کہتے ہیں کہ "یہ فیشن کس نے ایجاد کیا؟"

22 "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
"انسان کے دل کا تو نہیں پتا' البتہ میرا دل اس وقت ٹوٹ جاتا ہے۔ جب ثاقب جیب خرچ بند کر دیں!!!!"

23 "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
"میں ملکہ جذبات ہوں۔ جذباتیت مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ زیادہ اس وقت جذباتی ہو جاتی ہوں جب امی کے گھر جانے سے روکا جائے!!!!"

24 "زندگی کا یادگار دن؟"
"وہ انمول دن جب داو سے ملاقات ہوگی۔" ان شاء اللہ۔

25 "موسیقی میرے نزدیک؟"
"فتنہ ہے۔" قہقہہ

26 "پسندیدہ گانا؟"
اے میرے ہم نشین چل کہیں اور چل
اس چمن میں اب اپنا گزارہ نہیں
بات ہوتی گلوں تک تو سہہ لیتے ہم
اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں

27 "پسندیدہ فقرہ؟"
"تم جان ہو یا جہان ہو۔"

28 "پسندیدہ کردار؟"
"ایک ناول پڑھا تھا ہما کوکب بخاری کا۔ ان کے ناول کی ہیروئن ماہ پانو کا کردار بہت جاندار تھا۔"

29 "سب سے زیادہ قیمتی اور عزیز از جان اثاثہ؟"
"اولاد۔"

30 "اچھا اور خوب صورت موسم؟"

"موسم سرما... وجہ یہ ہے کہ سرما میں آندھیاں اور طوفان کم آتے ہیں۔ بارشیں کم ہوتی ہیں۔ درختوں کے پتے زیادہ نہیں گرتے۔ صفائی زیادہ نہیں کرنا پڑتی۔ ڈسٹنگ سے جان چھوٹی رہتی ہے اور سب سے بڑی بات دیواروں سے چپکی مخلوق بھی کونوں کھدروں میں جا چھپتی ہے۔"

31 "ناقابل فراموش واقعہ؟"
"اسے واقعہ بھی کہہ سکتے ہیں اور سانحہ بھی... کچھ بھی کہہ لیں... آئمہ اور عذیر کے پاپا کی بیماری اور وفات کے درمیان کا تمام عرصہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ دن وہ وقت اور لمحے سراپا آنسو تھے۔"

32 "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
"یہ کیا پوچھ لیا ہے۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ تھا۔ اکتوبر ہمیشہ سے میرے لیے لکی رہا ہے۔ میں بازار میں تھی۔ تایا ابو کی بیٹی کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ کرن خریدا اور کھڑے کھڑے دیکھ لیا اور اپنا نام لسٹ میں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔"

33 "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
"شادی کے بعد ہم اسلام آباد سے لاہور جا رہے تھے۔ یوں سمجھ لیں 'یہ ہنی مون کا پیریڈ تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہماری گاڑی گوجرانوالہ کے قریب خراب ہو گئی تھی۔ موٹر وے پولیس کی مہربانی سے نصف رات ایک ورکشاپ میں گزارنی پڑی۔ یہ رات میں نے روتے ہوئے اور دعائیں کرتے گزاری تھی۔ مجھے لگتا تھا۔ کوئی فلمی سین ہو کر رہے گا۔ ابھی کہیں سے ڈاکو نکل آئیں گے مگر اللہ نے اپنا کرم کیا تھا اور ہم بحفاظت لاہور پہنچ گئے تھے۔"

34 "میرا خواب؟"
"صف اول کی مصنفین کی لسٹ میں اپنا نام دیکھنا۔"

35 "پسندیدہ مزاج؟"
"اس کا جواب حس مزاح رکھنے والے زیادہ بہتر وضاحت سے دے سکتے ہیں۔"

36 "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
"وقت کی اداکاراؤں سے ... ہاہاہا... میرا بس چلے تو ان کے وارڈ روبز کو "تیلی" لگا آؤں۔"

37 "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
"خوشبو اس لیے پسند ہے کہ دلو خوشبوؤں کا دیوانہ ہے۔ جب وہ حوالات میں تھا تب وہ میسج بھیجا کرتا تھا کہ مجھے پرفیومز بھیجو۔ اس کی یہ خواہش پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ تب وہ پھولوں کے ہار اور گجرے منگوا لیتا تھا۔ اسے خوشبوؤں سے عشق ہے اور مجھے اس کے عشق سے عشق ہے۔"

38 "پسندیدہ خوشبو؟"
"Joy۔"

39 "آخری کتاب جو میں نے پڑھی؟"
"تاتکا پربت کے حضور۔"

40 "پسندیدہ جگہ؟"
"اپنے کینوؤں کے باغ۔"

41 "وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں گی؟"
"ایک زمانے میں ہم سب کزنز چھٹی گزارنے اپنے ڈیرے پر جایا کرتے تھے۔ جہاں ابو یا چاچو نے ٹیوب ویل چلایا ہوتا۔ ہم مالٹے توڑ کر کھاتے تھے پانی میں اچھلتے کودتے۔ گرما میں 'دربار مقدس' کے واحد عظیم الشان جامن کے پیڑ سے جامنیں توڑنے کے لیے بے قرار رہتے۔ آم کے درختوں پر چڑھتے۔ اب بھی کبھی کبھار بیتے وقت کی یاد کو تازہ کر لیا جاتا ہے۔"

42 "میری قوت ارادی؟"
"نہ بہت مضبوط ہے نہ بہت کمزور 'نارمل سی ہے۔'"

43 "گھر کا پسندیدہ کمرہ؟"
"اپنا بیڈ روم۔"

44 "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"
"شلوار قمیص ہم سکرٹ بھی پسند ہے۔"

45 "پسندیدہ رنگ؟"
"سرخ۔"

46 "پسندیدہ مصنف؟"
"اشفاق احمد۔"



47 "پسندیدہ شاعر؟"
"شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں۔"

48 "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"
"نفل ادا کروں گی... خیریت سے پہنچ گئی ہوں اور باحفاظت واپس جانے کی دعا کروں گی۔"

49 "خود اپنی بری عادت؟"
"شدید قسم کا غصہ آتا ہے۔ بہت بے صبری ہوں۔"

50 "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"
"اپنا کمرہ۔"

51 "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"
"اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو مصورہ ہوتی اور اگر مصورہ بھی نہ ہوتی تو پھر کچھ بھی نہ ہوتی۔"

52 "ایک لفظ جو مجھے واضح کر دے؟"
"دور بین (یعنی دور بین سی نظر رکھتی ہوں) آہم اتنا اچھو۔"

53 "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"
"بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔" (یہ میرا ذاتی تجربہ ہے)

54 "محبت کے بارے میں خیال؟"
"محبت خواب کی صورت... محبت شراب کی صورت۔" (کم بخت میٹر گھما کے رکھ دیتی ہے۔)

55 "پسندیدہ رشتہ؟"
"ماں کا۔"

56 "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"
"فیل ہو جائیں گے۔"

"پسندیدہ لو اسٹوری؟"
"حسنات بھائی اور عظمیٰ بھابھی کی لو اسٹوری سے میں بہت امپریس ہوں (ماشاء اللہ سے) حسنات بھائی نے پاشا کی طرح عظمیٰ بھابھی کے لیے آگ کا دریا عبور کیا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا حسنات بھائی۔"

58 "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"
"مستانا بھائی! یہ دلو (بھائی) کو بہت پسند تھی اور ہم نے کئی دفعہ دیکھی ہے۔"

59 "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"
"بہت کچھ بتاتے ہیں۔ ایک تو یہ میرا چہرہ ہے۔ نکا سا گول سا 'وادا' کتا ہے 'کینو مالٹے جیسا' کوئی راز 'راز نہیں رہنے دیتا۔'"

60 "شاعری کے بارے میں خیال؟"
"سر کے اوپر سے شوں کرکے گزر جاتی ہے۔"
61 "میری جستجو/میری کھوج؟"
"اس شہرت کو دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ جو رخسانہ نگار علی کر لکھنے کے لیے بیٹھتی ہیں۔"
62 "بہترین کامیابی؟"
"ثاقب کو کوریا جانے سے روکا تھا۔ یہ ایک بڑا معرکہ تھا۔ ایک جنگ تھی جو میں نے جیت لی۔" (واہ جی واہ)
63 "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"
"مجھے طرح طرح کے وہم لاحق ہیں اور میرے وہم میری ماں ہی دور کر سکتی ہے۔" (کیوں امی! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا)
64 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"ٹیلی فون۔"
65 "بدترین ایجاد؟"
"بدترین ایجاد بھی فون ہے۔ اگر اسے غلط استعمال کیا جائے۔"
66 "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"
"پردیسی ویر! بہت یاد آتی ہے تیری۔"
67 "بستر پر جانے سے پہلے آخری کام؟"
"ضحیٰ کے فیڈر میں دودھ بھرنا۔"
68 "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"
"میری استاد۔۔۔ جن سے جب بھی نشست رہی، انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔ "بچیا! نماز پڑھتی ہو؟ نماز کو اپنا معمول بناؤ نماز کی پابندی کیا کرو۔" ان کی یہ نصیحت ہمیشہ میرے لیے انمول رہے گی۔ اس کے علاوہ ان کی عبادت کا انداز۔ ان کا اللہ سے گہرا تعلق۔ اپنی ذات میں مکمل یونی ورسٹی ہیں۔ میری عزیز از جان استاد، جن کی بے شمار خوب صورت ترین نہ بھولنے والی باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور میں خالہ جان کنیز فاطمہ چدھڑ کو کرن کے توسط سے بتانا چاہتی ہوں کہ میں ان سے عقیدت کی حد تک محبت کرتی ہوں جنہوں نے مجھے "قرآن پاک" کی تعلیم دی اور اللہ نے انہیں کمپیوٹر جیسا دماغ دیا ہے۔ جس میں قرآن پاک کی ہدایت محفوظ ہے اور اللہ نے انہیں بے تحاشا حسن سے بھی نوازا ہے۔ جس پر میں فدا ہوں۔"
69 "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"
"بسمہ کی سالگرہ کا دن۔۔۔ ہماری زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔ اس سالگرہ میں داد بھی موجود تھا۔ اس دن سے اچھا کوئی دن میری یادداشت میں محفوظ نہیں۔ ہم نے بہت سی شرارتیں کی تھیں۔ اور داد چپکے چپکے میرے کان میں کہہ رہا تھا کہ یہ ساری برفی میں چراؤں گا اور آنٹی ناصرہ (بسمہ کی مما) سے بھی التجائیں کر رہا تھا کہ کیک میں جو جیلی سے دل بنا ہے وہ والا پیس میری پلیٹ میں رکھیں۔ وہ دن انمول تھے، نایاب تھے۔"
70 "پیغام قارئین کے لیے؟"
"عزیز از جان دوستوں! آپ ہیں تو ہم ہیں۔۔۔ آپ لوگوں کی رائے اور تبصرے ہمارے لیے کتنے انمول ہیں۔ میں خصوصاً "اقصیٰ ملک" نواب زادی سولنگی، نوزیہ ثمروش، سونیا ربانی، نوال شاہین، مسکان قریشی کی مشکور ہوں کہ جو کچھ میں نے لکھا، انہوں نے اسے کھلے انداز میں سراہا بھی، تنقید بھی کی اور میری اصلاح کے لیے یہ بہت اہمیت کے حامل تھے، بیٹھے، سیکھے، تبصرے قارئین سے میری التماس ہے کہ خصوصاً میری صحت کے لیے دعا کریں۔ عین نوازش ہو گی۔"
71 "کرن کے بارے میں رائے؟"
"کرن ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ کرن کے پلیٹ فارم نے بہت سی مصنفین کو متعارف کروایا۔ ہم سب ایک دسترخوان پر رکھی مختلف شہروں، علاقوں اور بستیوں سے تعلق رکھنے والی ڈشز تھیں۔ جنہیں کرن نے ٹیسٹ کیا، چکھا اور پاس کیا۔ کرن نے ہمیں متعارف کروایا، پہچان دی، نام دیا۔ کرن ہمیشہ قائم دائم رہے۔" آمین۔

☼ ☼



# شمع فردوس اور شہروز کا نیا سفر

حمیرا گل

ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ آپی مجھ سے سات سال بڑی ہیں اور پچھلے سات سالوں سے میرے دل میں ان کی شادی کا ارمان تھا جو کہ آخر اس سال پورا ہو گیا۔

یہ رمضان کی بات ہے ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں بیٹھی نمرہ احمد/ ثروت نذیر کا "میں عبدالقادر ہوں" جو کہ مجھے معمول سے لیٹ ملا تھا، پڑھنے میں منہمک تھی۔ جب دروازے پر ہونے والی دستک نے مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور مہمانوں کے ڈرائنگ روم میں وارد ہونے کے بعد دوبارہ ناول میں گم ہو گئی۔

کہانی ختم ہونے پر کمرے میں پھیلی نیم تاریکی پر مجھے احساس ہوا کہ وقت کافی بیت چکا ہے اور مجھے ابھی افطاری کی تیاری بھی کرنا تھی۔

مگر مہمان ہنوز ڈرائنگ روم میں براجمان تھے۔ اور مجھے امی کی سخت ہدایت تھی کہ تم نے باہر نہیں آنا اور جناب آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ایسے موقعوں پر اکثر بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کو پسند کر لیا جاتا ہے۔ مگر مجھے اپنے کالم کی فکر تھی سو میں باہر آ گئی مہمانوں سے ملاقات بھی ہوئی اور صد شکر کہ ان کا دل چھوٹی پر نہیں آیا سو خیریت رہی۔

امی تو دولہا بھائی کو پہلے ہی پسند کر چکی تھیں ادھر انہوں نے لڑکی پسند کی ادھر مہینہ بھر پہلے ہی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی گئی۔

مگر یہ مہینہ جو پہلے ہمیں خاصا طویل لگ رہا تھا شادی کی تیاریوں اور گھر کی صفائیوں میں پلک جھپکتے میں بیت گیا۔

مہندی سے سات روز قبل بڑے چاؤ سے ڈھولکی

بقیہ صفحہ 264 پر

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باذ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت غرور ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۸

آٹھویں قسط

بتول شاہ اس کی سمت بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ دل آور نے چند سیکنڈز میں ہی اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کرلیے تھے۔ تاکہ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کریں۔

"اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟" انہوں نے دل آور کے چہرے پہ فوکس کر رکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کام میں ماہر تھا۔ چہرے کے تاثرات چھپانا اور کسی کو نظر کا دھوکا دینا اس کے لیے مشکل تو نہیں تھا۔

"میں نے کب کہا کہ سوال مشکل ہے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اچانک زری کا خیال کیسے آیا؟" اس نے بڑی مہارت سے بات کا رخ بدل دیا۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ مدیحہ کا خیال آسکتا ہے، نبیل کا آسکتا ہے، عبداللہ کا آسکتا ہے تو پھر زری کا کیوں نہیں آسکتا؟ وہ بھی تو عبداللہ کی فیملی کا حصہ ہے، بہن ہے اس کی؟" وہ بھی اسی کی اماں تھیں چھوٹی سی بات سے بہلنے والی نہیں تھیں دل آور کو مزید سنبھلنا پڑا۔

"دراصل آپ کی زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

"تمہیں کس نے کہا کہ میری زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے؟" وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟" دل آور کو واقعی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جب ہی تو حیرانی ہو رہی تھی۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہی ہوئی ہے۔" انہوں نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا۔ دل آور کو یقین نہیں آیا تھا کہ ان کا آپس میں کانٹیکٹ ہے۔

"اچھا! کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟"

"کیوں تمہیں برا لگا؟"

"مجھے کیوں برا لگے گا؟" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"تمہارے چہرے سے تو یہی لگ رہا ہے؟"

"میرے چہرے پہ نہ جایا کریں، سراسر دھوکہ دیتا ہے۔"

"میں تمہاری ماں ہوں، تمہارے دھوکے بھی سمجھتی ہوں۔" انہوں نے یقین سے کہا۔

"تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ مجھے آپ کا اور زری کا کانٹیکٹ کس لحاظ سے برا بلکہ عجیب لگ رہا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس خالی کیا اور ذرا آگے جھکتے ہوئے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

"کیا تمہیں زری پسند نہیں ہے؟" ان کا یہ سوال واقعی مشکل تھا۔ لیکن جواب تو دینا ہی تھا، چپ رہتا تو وہ اقرار سمجھتیں۔

"پسند ناپسند کا قصہ ابھی رہنے دیں۔"

"کیوں رہنے دوں؟"

"بس ابھی دل سے اس کی پسند اور ناپسند پوچھی ہی نہیں۔" اس کا انداز ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔

"تو پوچھو نا۔"

"نہیں اماں! ابھی پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب آئے گا وقت؟"

"جب میں آپ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں گا۔" اس نے برملا کہا تھا اور بتول شاہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ لیکن آنکھوں میں قیامت ہلکورے لے رہی تھی، ان کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ اس قیامت کو



روکنا بھی چاہتیں تو نہیں روک سکتی تھیں، اب سب کچھ اختیار سے باہر تھا۔

"آپ بیٹھیں، میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ ان کی چپ سے دامن بچا کر کھڑا ہو گیا اور بتول شاہ اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

"کھانا لگا دوں بیگم صاحبہ؟" ملازمہ کی آواز پہ وہ چونک کر متوجہ ہوئیں اور اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بھائی۔"

"ہوں۔؟"

"آپ سے اجازت لینا تھی۔" اس نے دھیمے سے کہا، عدیل چونک گیا، وہ نہا کر اپنے کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، جب مریم اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

"کیسی اجازت؟"

"وہ کل فاطمہ کی برتھ ڈے ہے، اس نے فون کر کے انوائیٹ کیا تھا، میں نے جانے کے لیے ہامی تو نہیں بھری، لیکن وہ بہت اصرار کر رہی تھی۔" مریم نے آہستگی سے بتایا۔

"تو اس میں اتنا ڈرنے والی کیا بات ہے؟" عدیل کو حیرانی ہوئی۔

"آپ سے اجازت لینا تھی کہ کیا میں کل اس کے گھر جا سکتی ہوں؟"

"ہوں! لیکن ان کا فنکشن تو رات میں ہوگا؟" عدیل نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا۔

"جی۔" مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیسے جاؤ گی تم؟ آنے جانے میں مسئلہ ہوگا؟"

"وہ گاڑی بھیج دے گی۔"

"وہ گاڑی بھیج تو دے گی، لیکن تم رات کے وقت ڈرائیور کے ساتھ اکیلی تو نہیں آجا سکتیں؟" عدیل کو اس کے جانے کی نہیں بلکہ پک اینڈ ڈراپ کی فکر ہو رہی تھی۔

"تو پھر کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟" مریم کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔" اس نے مریم کو تسلی دی۔

"آپ؟ لیکن آپ کیسے چھوڑ کے آسکتے ہیں؟ آپ تو شام کو تھکے ہارے آتے ہیں، مجھے چھوڑنے کیسے جائیں گے؟ آپ کے ساتھ تو خود ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے۔"

"تم میرے مسئلے کو چھوڑو، اپنی فکر کرو، تم نے کل فاطمہ کے گھر جانا ہے تو بس فکر چھوڑ دو۔" وہ مریم کو ڈراپ کرنے کے لیے طریقہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ کی سوئی سلو کی موٹر سائیکل پہ جا کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے سلو سے موٹر سائیکل مانگ لیتا تو یقیناً وہ انکار نہ کرتا اور اس طرح مریم آسانی سے جا بھی سکتی تھی اور آ بھی سکتی تھی۔

"لیکن بھائی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن چھوڑو اور کل جانے کی تیاری کر لو۔" اس نے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے کہا اور مریم سر ہلا کر پلٹ گئی۔

"سنو۔" اس نے آواز دی۔

"جی؟" وہ ٹھہر گئی۔

"مگر اس کی برتھ ڈے پہ جانا ہے تو کچھ لے کر بھی تو جانا ہے؟" جو پریشانی مریم کو جانے کا سن کر ہوئی تھی وہ ہی پریشانی عدیل کو بھی ہوئی تھی۔

"جی یہ تو ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو کیا لے کر جاؤ گی؟" اس کے سوال پہ مریم نے چہرہ جھکا لیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئیں؟" عدیل اب پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"وہ در اصل اور کوئی گفٹ نہیں تھا دینے کے لیے' اتنے دنوں سے امی کا سلائی کا کام بھی ڈاؤن جا رہا ہے' اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کل جو سوٹ لائے تھے وہ میں فاطمہ کو گفٹ کر دوں گی' اتنا پیارا سوٹ ہے' اسے پسند آئے گا۔" مریم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور عدیل چپ ہو گیا۔

"کیا بات ہے آپ کو برا لگا؟" مریم پریشانی سے پوچھ رہی تھی' آخر وہ اتنی محبت اور اتنے شوق سے لے کر آیا تھا۔

"ظاہر ہے برا تو لگے گا۔"

"لیکن بھائی وقت بھی تو گزارنا ہے' گھر کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم اپنے فرینڈز کے لیے کوئی اچھا گفٹ خرید سکیں' یہ تو آپ اتفاقاً میرے لیے سوٹ لے آئے ہیں اور میں نے گفٹ دینے کا سوچ لیا' ورنہ یہ بھی نہ ہوتا تو میں کبھی جانے کا سوچتی بھی نہیں۔" اس نے عدیل کو وجہ بتائی۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی بار بھی میں نے اسے وش نہیں کیا تھا اور وہ ہمارے گھر آ کر کتنا خفا ہوئی تھی' اس بار بھی میں نے گفٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسے وش نہیں کیا تھا۔ اور بہانا کر دیا کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" مریم اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔

"لیکن پھر بھی اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو میں اسے منع کر دیتی ہوں کہ میں نہیں آ سکتی' کیونکہ گفٹ کے بغیر خالی ہاتھ جانا بھی تو مناسب نہیں ہے۔" مریم نے سعادت مندی سے کہا کہ اگر اسے پسند ہے تو ٹھیک' اگر نہیں تو وہ اپنا جانا کینسل کر دے گی۔ عدیل نے نظر اٹھا کے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور پھر آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں نا؟ ایک تو کیا دس' دس سوٹ لا کر دوں گا' تم اگر اپنی دوست کو گفٹ دے کر خوش ہو تو میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ یہ سوٹ میں نے تمہاری خوشی کے لیے لیا ہے' لیکن اگر تمہاری خوشی کسی اور طرح سے حاصل ہوتی ہے تو یوں ہی سہی۔" اس نے مریم کا سر تھپکتے ہوئے کہا تھا اور مریم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تھینک یو بھائی تھینک یو سو مچ۔" اس کے سر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"مینشن ناٹ ڈیئر۔" جواباً وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

"تو پھر میں کل کے لیے تیاری کر لوں؟"

"بالکل کر لو' لیکن اتنا بتا دو کہ آج ناشتا ملے گا یا نہیں؟" عدیل نے دلچسپی سے کہا۔

"وہ سوری بھائی' میں بس پانچ منٹ میں آپ کا ناشتا لگا رہی ہوں' آپ فوراً آ جائیے۔" وہ کہہ کے جلدی سے باہر نکل گئی اور عدیل بھی مسکراتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بے زاری سے بیٹھا میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا' جب اچانک ڈاکٹرز خیرو بابا کے چیک اپ کے لیے اندر آ گئے



اور آذر کی ہدایت کے مطابق وہ فوراً الرٹ ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم۔" اس نے سلام کیا تھا۔ ڈاکٹرز اس کے سلام کا جواب دے کر خیرو بابا کے چیک اپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کے زخم کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے چند دوائیاں تجویز کیں اور انہیں ڈسچارج کرنے کا کہہ دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" جودت ڈاکٹرز کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

"آج ان کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے' آپ انہیں گھر لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے خوشی کی خبر سنائی تھی۔

"رئیلی ڈاکٹر؟"

"آف کورس۔" ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" جودت نے بڑی گرمجوشی سے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔

"مسٹر آذر آفندی کہاں ہیں؟" ڈاکٹر کی آذر کے ساتھ واقفیت تھی' اس لیے اسی کا پوچھا تھا۔

"جی وہ کسی کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں' کل تک آ جائیں گے۔" جودت کا دل اندر ہی اندر قلابازیاں کھا رہا تھا کہ وہ اس اسپتال کی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تھی اور بوریت الگ سے۔

"ٹھیک ہے' آپ انہیں بتا دیجیے گا۔" ڈاکٹرز کہہ کر اپنے راؤنڈ پہ چلے گئے اور جودت خیرو بابا کو گھر لے جانے کا سوچنے لگا' لیکن وہ اکیلا انہیں لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا کسی دوسرے کی مدد ضروری تھی اور آذر کے بعد پہلا خیال دانیال کے سوا اور بھلا کس کا آ سکتا تھا؟ اس نے اپنا سیل نکالا اور دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا۔

"السلام علیکم۔" دانیال کی آواز خاصی مصروف تھی۔

"وعلیکم السلام دانیال بھائی' میں جودت بات کر رہا ہوں۔"

"جودت؟"

"جی اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔" اس کی اطلاع پہ دانیال چونک گیا تھا۔

"ہاں' کہو؟"

"وہ خیرو بابا کو ڈاکٹرز نے ڈسچارج کر دیا ہے' ان کو حویلی لے کر جانا ہے' لیکن میں یہاں اکیلا ہوں۔" اس نے مسئلہ بیان کیا۔

"ڈونٹ وری یار' تم ویٹ کرو' میں آ رہا ہوں۔" دانیال نے عجلت میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور اگلے چند منٹ میں وہ اس کے پاس اسپتال میں موجود تھا۔ اس نے آ کر تمام بلز کلیئر کیے۔ پھر دونوں مل کر انہیں سہارا دے کر گاڑی تک لائے' وہ کافی بہتر ہو چکے تھے۔ آہستہ قدموں سے چل پھر سکتے تھے' اسی لیے کوئی وہیل چیئر یا پھر اسٹریچر استعمال نہیں کیا تھا۔ دانیال کی گاڑی ڈرائیور واپس لے گیا تھا۔ اس لیے جودت کی گاڑی میں ہی خیرو بابا کو لے کر وہ گھر پہنچے تھے اور گھر میں خیرو بابا کی واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی' جتنی خوشی وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو ہوئی تھی' اتنی شاید خود خیرو بابا کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر کے فرد کی طرح ان کی آؤ بھگت کی تھی' یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان کے ملازم اور معمولی سے ڈرائیور ہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی اپنے اگلے پیپر کی تیاری کر رہی تھی' جب اسے اپنی کتاب پہ کسی کا سایہ پڑتا ہوا محسوس ہوا' اس نے چونک کر دیکھا سامنے وہ ہی سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا جو اس روز سب فرینڈز کے ساتھ مدیحہ کو ایئرپورٹ سی آف کرنے آیا تھا۔ زری کو اس کے نام کا پتا تھا' لیکن فی الحال یاد نہیں آ رہا

تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟" اور شاید وہ بھی زری کی الجھن بھانپ گیا تھا۔
"میں جبزی ہوں' میڈی کا دوست۔" اس نے مدحیہ کے حوالے سے ہی اپنا تعارف کروایا تھا۔
"جی کہیے؟"
"میڈی پاکستان میں ٹھیک تو ہے نا؟"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب یہ کہ ہم سب فرینڈز کو میڈی کے حوالے سے بہت پریشانی ہو رہی ہے' وہ ہم سے کانٹیکٹ کرنے کا وعدہ کرکے گئی تھی' لیکن اس نے ابھی تک کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا؟" جبزی' مدحیہ کے لیے حد سے زیادہ متفکر ہو رہا تھا۔
"تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے؟ کانٹیکٹ تو اس نے مجھ سے بھی نہیں کیا۔" زری نے بھنویں اچکائیں۔
"پریشانی والی بات کیوں نہیں ہے؟ پاکستانی لوگ اکثر لڑکیوں کو پاکستان لے کر جاتے ہیں تو ان پہ بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں' انہیں پاکستان میں رہنے پہ مجبور کرتے ہیں' ہو سکتا ہے کہ میڈی کے ساتھ ابھی ایسا ہی ہو؟" جبزی نے اپنی سوچ کا برملا اظہار کیا تھا' جس پہ زری کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور وہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"جسٹ فار یور کائنڈ انفارمیشن مسٹر جبزی' مدحیہ اپنی مرضی سے پاکستان گئی ہے' اگر اسے زبردستی پاکستان لے کر جانا ہوتا تو آج سے دو سال پہلے لے جاتے اس کی مرضی کا انتظار نہ کرتے' وہ پاکستان میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش باش ہے' آپ کو اس کے لیے فکر پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کے دماغ میں پاکستان کے خلاف جو زہر بھرا ہے پلیز وہ دور کر لیجیے' پاکستان ایسا بھی برا نہیں جیسا آپ نے بنا لیا ہے' اگر پاکستان میں بیٹیوں پہ ایسا ہی تشدد ہو رہا ہوتا تو میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتی جو پاکستان کے ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہوں۔" اس نے جبزی کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی تھی۔
"آئیم سوری' میرا مقصد آپ کو اموشنل کرنا نہیں تھا۔" جبزی نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔
"لیکن میرا مقصد آپ کو سمجھانا تھا' یقیناً" آپ سمجھ گئے ہوں گے۔" ہمیشہ کول کول رہنے والی زری اس وقت کافی تپی ہوئی لگ رہی تھی اور جبزی خاصا محتاط ہو گیا تھا۔
"اوکے آئی انڈر اسٹینڈ۔" اس نے سر ہلایا۔
"بائی دے وے میں مدحیہ کو آپ کا میسج دوں گی۔ ابھی اس کے پاس اپنا سیل نمبر نہیں ہے' جب ہو گا تو آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔" زری نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
"کیا اس ــــ کا لینڈ لائن نمبر مل سکتا ہے؟" جبزی کو کچھ زیادہ ہی بے چینی ہو رہی تھی۔
"مل سکتا ہے' ضرور مل سکتا ہے' لیکن اگر مدحیہ اجازت دے تو۔" زری نے سر ہلایا۔
"اجازت؟" اسے سمجھ نہ آیا۔
"جی مدحیہ سے پوچھے بغیر میں اس کا نمبر آپ کو نہیں دے سکتی۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"اوکے تو آپ اس سے پوچھ لیجیے۔"
"میں آپ کو کل بتا دوں گی' یا پھر مدحیہ آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔"
"تھینک یو میم۔" جبزی خوش ہو گیا تھا اور زری سر ہلا کر لائبریری کی سمت بڑھ گئی۔ وہ کتابیں ایشو کروا کے وہ واپسی کے لیے یونیورسٹی کے احاطے سے باہر نکل آئی تھی۔ عبداللہ اسے پک کرنے کے لیے پہنچ چکا تھا۔
"السلام علیکم بھائی۔" وہ ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔



"وعلیکم السلام! پیپر کیسا رہا؟" وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"ظاہر ہے مجھ سے پوچھیں گے تو میں اچھا ہی کہوں گی۔" وہ ذرا سا مسکرا کے بولی۔
"اور ظاہر ہے کہ پیپر تمہارا ہے تو تم ہی سے پوچھیں گے نا؟" عبداللہ بھی مسکرا کے بولا۔
"ہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔" زری ہنس پڑی۔
"نگارش بھابی چلی گئیں؟"
"ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ہی ڈراپ کر کے آیا ہوں' میرا پورا دن تو تم لوگوں کی ڈرائیوری میں گزر جاتا ہے' کام میں نے کیا خاک کرنا ہے؟" عبداللہ مصنوعی خفگی سے جھنجلا کر بولا تھا۔ زری اپنی مسکراہٹ دبا گئی۔
"آپ ہماری اتنی کیئر کرتے ہیں اللہ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابی عطا کرے گا۔ ان شاءاللہ اوپر والا آپ کو اجر دے گا' میرا کیریئر بنانے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے' ورنہ میں بھی آج باقی لڑکیوں کی طرح میٹرک پاس کر کے گاؤں کی حویلی کے ایک کونے میں پڑی ہوتی' آپ کا احسان تو میری پوری زندگی پہ محیط ہے۔" زری کہتے کہتے سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"ارے پاگل اس میں احسان کہاں سے آ گیا؟" عبداللہ نے اسے منع کرتے ہوئے سر جھٹکا۔
"احسان ہی تو ہے آپ نے میری خاطر سب سے ناراضی مول لے لی بھلا کون راضی تھا میرے یہاں آنے پر؟ بابا جان تو تعلیم کے خلاف تھے کجا کہ ہائر اسٹڈی کے لیے کسی دوسرے ملک جانا؟ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا' آج گاؤں کی لڑکیوں کے لیے اور حویلی کی لڑکیوں کے لیے میں ایک مثال ہوں کہ کوئی آگے بھی بڑھ سکتا ہے بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔" زری سنجیدگی سے بول رہی تھی۔
"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو' تعلیم ایک زیور ہے اور اس زیور کے لیے سب کو لڑنا چاہیے' اس زیور کا حصول سب کے لیے ضروری ہے' چاہے وہ گاؤں کی لڑکی ہو یا شہری۔" عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"لیکن بھائی اس زیور کے حصول کے لیے آپ جیسے بھائیوں کی بھی اشد ضرورت ہے ہمارے معاشرے کو جو اپنی بہنوں کی تعلیم کے رستے میں رکاوٹ نہ بنیں' بلکہ ان کے لیے ڈھال ثابت ہوں' کاش مشرقی مردوں کی سوچ آپ جیسی ہو جائے۔" زری نے حسرت سے کہا تھا اور عبداللہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں گھر پہنچ چکے تھے' نگارش آج اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دل آور شاہ واپس لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا' جب بتول شاہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔
"جا رہے ہو؟" ان کے لہجے میں کیا کچھ تھا' دل آور بخوبی سمجھتا تھا۔
"نہ جاؤں؟" اس نے پلٹ کر ان کو بغور دیکھا' لیکن ان کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے تھے۔ وہ اور سے اور ہو گئی تھیں' ان کے چہرے پہ سرد برف کے سوا اب کچھ بھی نہیں تھا۔
"میں نے کب کہا کہ تم نہ جاؤ؟" اب کی بار لہجہ بھی کچھ اور تھا۔
"تو پھر میری کامیابی کی دعا کے ہمراہ مجھے رخصت کیجیے۔"
"خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ' تمہاری کامیابی کے انتظار میں ہی تو اپنی آنکھیں پتھر کر لی ہیں' اب پتا نہیں یہ آنکھیں پھر سے دوبارہ آنکھیں کب بنیں گی؟" ان کا لب و لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا' ان کے اندر کا درد ان کی آواز میں گھل رہا تھا اور اذیت کی لہر دل آور شاہ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔
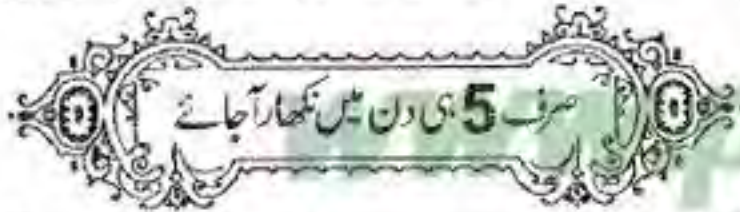
"آپ کی آنکھوں کو آنکھیں بنانے کے لیے میں پوری دنیا کو پتھر کردوں گا' یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" اس نے بتول شاہ کو کندھوں سے تھام کے اپنی گرفت کی مضبوطی کا احساس دلایا تھا۔

"تمہارے وعدوں پہ نہیں' تمہاری آس پہ جی رہی ہوں میری جان' اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے۔" انہوں نے دل آور کی پیشانی چوم لی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتے سے فارغ ہو کر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اب میں اسلام آباد نہیں آؤں گا' بلکہ اب آپ لاہور آئیں گی' اپنی تیاری رکھیے گا۔"

"ان شاءاللہ ضرور آؤں گی۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہاں سے مل کر گاڑی میں آبیٹھا اور پھران کو ہاتھ ہلا کر گاڑی نکال لے گیا۔ اس نے نبیل کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کل واپس آکر اس کے مسائل حل کردے گا' اس لیے وہ آج اسلام آباد سے جلدی نکل آیا تھا۔ لیکن ابھی اسلام آباد کی حدود سے نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے آتے ہوئے گاڑی روک دی' اسے بریک لگانے پڑے۔

"انسپکٹر شہناز آپ؟" وہ حیرانی سے کہتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا۔ انسپکٹر شہناز سڑک کے کنارے کھڑی ہیلپ مانگ رہی تھی۔

"دراصل میری گاڑی خراب ہو گئی ہے' میں لاہور جا رہی تھی' آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے ڈرائیور کو مکینک کے پاس بھیجے' لیکن ابھی تک نہیں آیا۔" وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

"کیا خرابی ہو گئی ہے گاڑی میں؟"

"پتا نہیں' انجن بند ہو گیا ہے۔"

"چیک کیا ہے؟"

"ہاں ڈرائیور سارا انجن چیک کرکے گیا ہے' مکینک کے بغیر ٹھیک ہونے والی نہیں ہے اور میں پریشان ہو رہی ہوں' مجھے ذرا جلدی لاہور پہنچنا تھا۔" انسپکٹر شہناز نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے ٹائم دیکھ کر کہا۔

"چلیے پھر آپ کی پریشانی حل کیے دیتے ہیں' آیئے میرے ساتھ چلیے۔" دل آور نے اسے آفر کی۔

"لیکن شاہ جی۔" انسپکٹر شہناز کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیوں کوئی ڈر ہے؟" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔

"ڈر ہونا بھی چاہیے' مرد کا کیا بھروسہ؟" وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔

"خیر بھروسے کی تو آپ بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے' بھروسہ تو عورت کا بھی نہیں ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیوں شاہ جی کون کم بخت دھوکہ کر گئی آپ کے ساتھ؟"

"دل آور شاہ کو دھوکہ دینے والی ابھی کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔" دل آور شاہ نے ہنس کر کہا تھا۔

"اور جو پیدا ہوئی ہیں' انہیں آپ نے نظر عنایت ہی نہیں بخشی۔"

"کوئی سراپا التجا بھی تو نہیں ہوا ابھی تک؟" وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شاہ جی آپ بہت بے رحم ہیں۔" انسپکٹر شہناز کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا اور دل آور شاہ یک دم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"کبھی کبھی کیوں لگتا ہے؟ یہ تو اکثر لگنا چاہیے۔" وہ اس کی بات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"اکثر تو آپ اچھے ہی لگتے ہیں' بس کبھی کبھی اچھی رائے بدل جاتی ہے اور لگتا ہے کہ آپ۔"

"آپ بہت برے ہیں۔" دل آور نے انسپکٹر شہناز کا ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔

"اب میں آپ کو برا بھی تو نہیں کہہ سکتی شاہ جی۔" انسپکٹر شہناز کا انداز خاصا دوستانہ سا تھا۔

"واہ کیا پالیسی ہے؟ بے رحم کہہ لیا لیکن برا نہیں کہہ سکتیں' آپ پولیس والوں سے بھی اللہ ہی پناہ دے آپ کے بھی اپنے ہی قانون ہوتے ہیں۔" وہ ابھی تک اس کی بات انجوائے کر رہا تھا۔

"اصل قانون دان تو آپ ہیں شاہ جی ہماری غلطیوں کو بھی سیگنٹ کی طرح پکڑ لیتے ہیں۔" انسپکٹر شہناز ہنسی تھی۔

"سلام میڈم! مکینک کو لے آیا ہوں۔" اس کے عقب سے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ جب تک مکینک نے اس کی گاڑی چیک نہ کی ڈرائیور کے ساتھ دل آور بھی وہیں کھڑا رہا۔

"میڈم ایک گھنٹہ لگ جائے گا گاڑی ٹھیک ہونے میں۔" مکینک نے اسے اطلاع دی۔

"اوہ تو۔" انسپکٹر شہناز نے سر جھٹکا۔

"آپ کا آج کا سفر میرے ساتھ لکھا ہے میڈم۔" دل آور نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیجیے گا شاہ جی میں آج پولیس والی نہیں ہوں۔" انسپکٹر شہناز نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا' وہ اپنی گاڑی ڈرائیور کے حوالے کر آئی تھی۔

"رعب تو اب بھی ہے نا۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"اب کیا پتا کہ آپ کا رعب مجھ پہ ہے یا میرا رعب آپ پہ۔" وہ ہنسی۔

"نہیں میڈم آپ کا ہی رعب ہے اور آج تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے انسپکٹر شہناز کو سر تاپا دیکھتے ہوئے تعریف کی تھی' وہ خوب صورت تو تھی ہی' لیکن آج رائل بلیو کلر کی بارڈر والی ساڑھی اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی گڈ لکنگ لگ رہی تھی۔ ورنہ اکثر وہ یونیفارم میں ہی نظر آتی تھی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"ویسے آپ آج اسلام آباد میں کیا کر رہی تھیں؟"

"میری کزن کی شادی تھی' میں دو روز سے اسلام آباد آئی ہوئی تھی' آج واپس جا رہی ہوں۔"

"تو ہمیں ہی شادی میں انوائیٹ کر لیتیں۔" اس نے افسوس سے کہا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ آپ بھی اسلام آباد کو رونق بخشے ہوئے ہیں؟"

"خیر آئندہ کسی کزن کی شادی ہو تو یاد رکھیے گا۔" دل آور خاصا موڈ میں تھا۔ انسپکٹر شہناز کو حیرانی ہو رہی تھی۔

"یہ آپ ہی ہیں نا شاہ جی؟" اس نے اپنی حیرانی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

"کیوں میڈم آپ کو کوئی ڈاؤٹ ہے؟" دل آور نے دلچسپی سے انسپکٹر شہناز کا چہرہ دیکھا۔

"ڈاؤٹ تو نہیں' لیکن آپ کو کبھی اتنے خوش گوار موڈ میں دیکھا بھی تو نہیں ہے۔"

"آج کل میرا بہت قریبی دوست پاکستان آیا ہوا ہے' شاید اسی کی ملاقات کا جشن منا رہا ہوں۔"

"اوہ یعنی آپ "جشن بہاراں" منا رہے ہیں؟"

"جشن بہاراں نہیں "جشن یاراں" منا رہا ہوں میڈم۔" اس نے خوش گواریت سے جواب دیا۔

"کیا میں آپ کے اس دوست سے مل سکتی ہوں؟" انسپکٹر شہناز نے کافی ایکسائٹمنٹ کا اظہار کیا تھا۔

"کیوں؟"

"اس خوش نصیب کی خوش نصیبی پہ رشک کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ آپ جیسی چیزوں سے دور بھاگتا ہے' پرہیز کرتا ہے' بہت سادہ دل انسان ہے۔" دل آور نے نبیل کی تعریف میں کہا۔



"آپ کا دوست سادہ دل؟" اس نے اچنبھے سے کہا۔

"آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میڈم؟" دل آور کے سوال پہ انسپکٹر شہناز قہقہہ لگا کے ہنسی تھیں اور جواباً" اس نے بھی مسکراتے ہوئے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"علیزے...!"

"جی پاپا؟" وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی' جب وقار آفندی کی آواز پہ قدم تھم گئے تھے۔

"کہاں جا رہی تھیں؟"

"بس ایسے ہی عائشہ پھوپھو کی طرف۔" اس نے کندھے اچکائے۔ وقار آفندی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے برابر آگئے اور اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

"بیٹھو۔" خود بیٹھے تو اسے بھی ساتھ بٹھا لیا تھا۔

"خیریت پاپا؟"

"ہاں بیٹا جانی سب خیریت ہے' وہ دراصل ہم نے تمہیں اطلاع دینی تھی کہ ہم نے تمہارے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے اور ان شاء اللہ آج آذر واپس آگیا تو تمہاری گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا' تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے علیزے کو پاس بٹھا کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا' علیزے کی جان میں ان کی جان تھی' اس کی پریشانی ان کا خون خشک کر دیتی تھی۔ ان کے دو بیٹے ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے' جتنی علیزے اہمیت رکھتی تھی' انہوں نے اپنی پوری عمر کی محبت صرف علیزے پہ لٹائی تھی' کبھی کبھی تو آسیہ آفندی ان کی اس قدر محبت پہ حیران پریشان رہ جاتی تھیں اور ان کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ علیزے کی آئندہ کی زندگی کا خیال ہوتا تھا' انہیں پتا تھا کہ باپ اتنی محبت دے گا تو وہ شوہر میں بھی اتنی ہی محبت تلاش کرے گی اور اگر ذرا سی بھی کمی بیشی ہوئی تو زندگی بھر کے لیے مسئلہ بن جائے گا اور اس چیز کا اظہار انہوں نے ایک بار وقار آفندی سے بھی کیا تھا' جس پہ جواباً" وہ مسکرا دیے تھے۔

"ہم اس کی شادی ہی اس سے کریں گے جو ہم سے بھی زیادہ محبت دے گا اسے۔" ان کا لہجہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"آپ جیسی محبت کون کر سکتا ہے اس سے؟" آسیہ آفندی کو یقین نہیں تھا۔

"وقت آنے پہ پتا چلے گا تمہیں۔" انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔

"آپ کی محبت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا وقار' کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے میں علیزے کی ماں ہوں' لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں میری محبت بھی آپ کی محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" آسیہ آفندی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور اس وقت بھی وہ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں کھڑی باپ اور بیٹی کا محبت بھرا انداز دیکھ رہی تھیں یوں ہی باپ سے باتیں کرتے کرتے علیزے کی نظریں ان کی طرف اٹھی تھیں۔

"ارے ماما آپ وہاں کیوں کھڑی ہیں؟" اس کی آواز پہ وقار آفندی نے بھی آسیہ آفندی کو دیکھا تھا۔

"آپ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔" وہ اندر آگئیں۔

"اس طرح چھپ چھپ کے تو آپ نے جوانی میں بھی نہیں دیکھا ہمیں۔" وقار آفندی مسکرائے' علیزے بھی ہنس پڑی تھی۔

"آپ نے جوانی میں کبھی دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا' ہمیشہ کاروبار کی فکروں میں ہی رہتے تھے' یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے' جس نے مجھے مصروفیت کے لیے تین عدد بچے دے دیے' ورنہ میں تو اب بھی بیٹھی آپ کا آفس سے

واپسی کا انتظار ہی کرتی رہتی۔" آسیہ آفندی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"تو گویا آپ کی بات کا یہ مطلب ہوا کہ اب آپ کو ہماری آفس سے واپسی کا کوئی انتظار نہیں ہوتا؟" وقار آفندی کافی اہم نقطہ اٹھا کے لائے تھے۔ آسیہ آفندی جزبز سی ہو گئیں۔ علیزے اپنے پیرنٹس کی ایسی دلچسپ بحث و تکرار سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"جانے دیجئے نا بیگم صاحبہ اب ہماری کوئی قدر نہیں ہے آپ کی نظر میں؟" انہوں نے آسیہ فندی کو بولنے پہ اکسایا تھا اور وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے وقار آفندی کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔

"آپ کی قدر یا تو آسیہ کا دل جانتا ہے یا آسیہ کا خدا۔" انہوں نے کتنی نرمی سے کتنی گہری بات کی تھی۔ وقار آفندی کا دل شانت ہو گیا تھا۔

"تھینک یو آسیہ۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور علیزے مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹا؟"

"آپ لوگ باتیں کریں میں انیکسی کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی اس کا رخ انیکسی کی طرف ہی تھا اور جیسے ہی وہ انیکسی میں پہنچی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا باقی لڑکیاں بھی اتفاقاً وہیں تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"علیزے۔" انوشہ لپک کے پاس آئی تھی' علیزے کبھی کبھار ہی تو اس طرف آتی تھی اور وہ بھی انوشہ کی وجہ سے۔

"کیسی ہو؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"آؤ نا' علیزے اندر آؤ۔" انوشہ نے اسے اندر آنے کا کہا' وہ اندر آ گئی۔

"ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سب پہ نظر دوڑائی۔

"دیکھ لیجئے کیا ہو رہا ہے۔" کومل کی آواز پہ علیزے نے چونک کر کومل کی سمت دیکھا۔

"کومل آپی کیسی ہیں آپ؟" علیزے کا لہجہ اور انداز نارمل' بلکہ اپنائیت لیے ہوئے تھا۔

"جیسی تم ہو' ویسی میں ہوں۔" کومل نے سر جھٹک کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ جیسے تم ٹھیک ہو' ویسے میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔" کومل کی وضاحت پہ باقی سب ہنس پڑی تھیں۔

"اوہ اچھا۔" علیزے نے سر ہلایا۔

"بڑی جلدی سمجھ آ گیا ہے؟"

"آپ کے سمجھانے کا طریقہ اچھا ہے۔" علیزے معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر ساری باتیں کیوں نہیں سمجھ لیتیں تم؟" کومل کے لہجے میں ہلکے طنز کا عنصر نمایاں تھا۔

"میں سمجھی نہیں کومل آپی؟" علیزے نے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"کچھ باتیں سمجھ لیتی ہو اور کچھ نہیں۔ عجیب بات ہے؟" کومل کا لہجہ ابھی بھی طنز لیے ہوئے تھا۔

"کومل۔" حرمت اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی' اس نے کومل کو سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا تھا۔

"ارے تو میں کیا کہہ رہی ہوں' اپنی سویٹ سی کزن سے باتیں ہی تو کر رہی ہوں؟" کومل نے تعجب سے دیکھا۔



"تو باتیں کرو نا طنز تو نہیں۔" حرمت نے دبے الفاظ میں خفگی سے کہا جسے صرف کومل ہی سن سکی تھی۔

"آؤ علیزے بیٹھو یہاں۔" کومل نے اپنے قریب صوفے پہ اشارہ کیا تھا' علیزے اس کے انداز کو بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی اور خاموشی سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

"آج کل تم گھر پہ نظر آ رہی ہو' کالج چھوڑ دیا ہے کیا؟"

"نہیں کالج کیوں چھوڑوں گی بھلا؟"

"تم مسلسل اتنے روز سے گھر پہ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید۔۔۔"

"وہ دراصل مجھے پک اینڈ ڈراپ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کوئی ڈرائیور تھا اور نہ ہی میری گاڑی تھی' لیکن پاپا نے کہا ہے کہ کل تک سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اس کا بتانے کا انداز اب بھی معصوم سا تھا۔

"یعنی کل تک نیا ڈرائیور اور نئی گاڑی ارینج ہو جائیں گے؟"

"جی' ان فیکٹ یہ مسئلہ آج بھی حل ہو سکتا تھا' لیکن آذر بھائی گھر پہ نہیں تھے' شوروم سے گاڑی انہوں نے ہی نکلوانی تھی' آج وہ آ جائیں گے تو ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" وہ بے فکری سے کہہ رہی تھی اور کومل کا خون جل گیا تھا۔ وہ آذر کا اس طرح ذکر کرتی تھی جیسے وہ ہی اس سے زیادہ قریب تھی' حالانکہ اگر کومل دل سے سوچتی تو علیزے ہی آذر سے زیادہ قریب تھی' وہ خود بھی تو اسی پہ زیادہ توجہ دیتا تھا اور علیزے اس کی لاڈلی اور چہیتی کزن بھی۔

"بائی دا وے وہ گئے کہاں ہیں؟"

"کراچی۔"

"کیوں؟"

"کام سے۔"

"آئیں گے کب؟"

"آج۔"

"اوہ اچھا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر چپ ہو گئی تھی' حرمت نے علیزے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نبیل۔ نبیل!" وہ اندر داخل ہوتے ہی نبیل کو آواز دینے لگا۔

"سلام صاحب۔" گل کچن سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

"وعلیکم السلام! گل کیسی ہو تم؟" ولی نور کا انداز خوش گوار رت لیے ہوئے تھا' وہ انسپکٹر شہناز کو ڈراپ کر کے سیدھا یہیں آیا تھا۔

"اللہ کا کرم ہے صاحب۔"

"گلاب خان کہاں ہے؟ کل آیا تھا نا؟"

"جی! صاحب آیا تھا۔"

"ملاقات ہوئی اس سے؟" اس کے سوال پہ گل کا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔

"گل بی بی میں نے صرف ملاقات کا پوچھا ہے۔" وہ اپنی بات پہ زور دے کر پوچھ رہا تھا۔

"یار کیوں اسے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے؟ کسی کو تو بخش دیا کرو۔" نبیل سیڑھیاں اترتے ہوئے قریب آ گیا

تھا۔
"کوئی خود ہی کٹہرے میں کھڑا ہونے والی باتیں کرے تو میں کیا کروں؟" وہ نبیل سے مصافحہ کرتے ہوئے شرارت سے مسکرا کے بولا۔
"جاؤ گل! اپنے صاحب کے لیے کچھ کھانے کے لیے لے کر آؤ۔" نبیل نے گل کو اشارہ کیا۔
"فی الحال کچھ نہیں چاہیے میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا۔" دل آور نے منع کر دیا۔
"تو پھر کچھ پینے کے لیے لے آ۔" نبیل نے دوبارہ گل کو مخاطب کیا تھا۔
"پینے کے لیے کیا؟" گل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"چائے لے آؤ۔" دل آور نے خود ہی کہہ دیا اور دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔
"اسلام آباد کا چکر کیسا رہا؟"
"بس یار اماں سے ملنا تھا مل کر آ گیا۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہا۔
"اماں کیسی ہیں؟"
"ٹھیک ہیں وہ تمہارا اور مدحیہ کا پوچھ رہی تھیں۔"
"ہوں! میں فون کروں گا انہیں' ویسے یار تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے تم انہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے آتے' ہم سب کی ملاقات ہو جاتی؟" نبیل نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔
"وہ مصروف ہیں آج کل۔" دل آور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"مصروف تو تم بھی ہو؟"
"ہاں یار! کام ہی کچھ ایسا ہے۔"
"کام ایسا نہیں ہے' تم خود ہی کچھ ایسے ہو' تمہیں کس نے کہا تھا کہ وکالت کی طرف جاؤ؟"
"یہ میرے بابا کا خواب تھا یار' انہیں شوق تھا کہ میں وکیل بنوں' وہ میرے نام کے ساتھ ایڈووکیٹ اور بیرسٹر کا لفظ دیکھنا چاہتے تھے۔"
"ماشاء اللہ اور تم نے ان کا خواب پورا کر دیا۔" نبیل نے مسکرا کے ستائشی لہجے میں کہا۔
"خواب تو پورا کر دیا' لیکن وہ خواب کو تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے' کاش کہ وہ دیکھ سکتے کہ میں نے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا ہے۔" دل آور کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا اور نبیل کو اس کے دکھ کا احساس ہو گیا تھا' لیکن اب بات کا رخ بدلنا بھی مشکل تھا۔
"بھائی۔" اچانک مدحیہ کی آواز سنائی دی' دل آور نے چونک کر سیڑھیوں کی سمت دیکھا اور نبیل نے شکر ادا کیا کہ چلو اس کا دھیان تو ہٹ گیا نا۔
"بھائی کی جان کیسی ہو؟" دل آور سر جھٹکتے ہوئے بہن کی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"بالکل بور۔" اس نے بیزاری کا بھرپور اظہار کیا تھا۔
"کیوں بھئی؟"
"وہ دن سے پاکستان آ کر اپنے بیڈ روم میں بند ہوں باہر نکلو تب بھی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ سامان نہیں ہے نہ موبائل' نہ گاڑی' نہ فرینڈز اور نہ ہی آپ۔ بوریت نہ ہو تو اور کیا ہو؟" اس نے ایک ایک چیز گنوا ڈالی۔
"او کے بابا او کے' اب میں آ گیا ہوں تو سب آ جائے گا' موبائل بھی' گاڑی بھی اور تمہاری بوریت کے لیے کمپنی بھی۔" اس نے مدحیہ کو تسلی دی۔
"آپ کہاں تھے میں نے آپ کے نمبر پہ فون بھی کیا تھا۔"



"سوری یار! میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔"
"ہوں! سنا ہے اسلام آباد بہت خوب صورت شہر ہے؟" مدحیہ آج ذرا اپنے خول سے نکل کر بات چیت کر رہی تھی۔
"خوب صورت تو نہیں ہے' بس جب میں جاتا ہوں تو تب ہو جاتا ہے۔" اس کی بات پہ نبیل یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدحیہ بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔
"یار تم تو جہاں بھی جاتے ہو چار چاند لگا دیتے ہو۔" نبیل ہنس رہا تھا۔
"کوئی شک ہے تمہیں؟" اس نے بھنویں اچکا کے نبیل کو دیکھا۔
"کوئی شک نہیں ہے یار' کوئی شک نہیں ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
"چلو پھر آج تم لوگوں کو لاہور دکھا لاؤں۔" اس نے نبیل اور مدحیہ کو آفر کی۔
"اس وقت؟" نبیل نے ٹائم دیکھا۔
"یار شام اور رات ہی تو لاہور کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی ہیں' آج ہی تو تم لاہور کے نظارے دیکھو گے۔" اس نے مسکرا کے کہا۔
"میرا کوئی موڈ نہیں ہے' تم مدحیہ کو لے جاؤ' اس نے پاکستان نہیں دیکھا اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔" نبیل نے انکار کر دیا۔
"کیوں تمہارا موڈ کیوں نہیں ہے؟"
"بس ایسے ہی۔"
"یہ جو "بس ایسے ہی" ہوتا ہے نا؟ یہ بہت "خاص" ہوتا ہے۔" دل آور نے معنی خیزی سے کہا۔
"سوری یار مجھے خیال نہیں رہا کہ میں ایک وکیل کے سامنے بات کر رہا ہوں۔" نبیل نے ہتھیار ڈال دیے' کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ باتوں باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکال لے گا اس کے سامنے انکار بھی فضول تھا۔

"چلو اٹھو پھر۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"لیکن وہ چائے۔" نبیل نے کپ کی طرف اشارہ کیا۔
"چائے پھر سہی۔" اس نے ٹال دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جاگ اٹھی تھیں 'پورے لاہور کی رونقیں عروج پر تھیں' مدیحہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے استاد! کچھ پریشان نظر آتے ہو؟" چھوٹا گاڑی کا پنکچر لگاتے ہوئے بار بار عدیل کو دیکھ رہا تھا اور جب پنکچر لگا کر فارغ ہو گیا تو سیدھا عدیل کے پاس آگیا۔
"ہاں یار! پریشان تو میں ہوں 'لیکن سمجھ نہیں آرہا کہ یہ پریشانی حل کیسے ہو گی؟"
"کیا مطلب ہے استاد؟ کھل کے بول۔" چھوٹے نے بڑا پن دکھایا۔
"یار وہ دراصل مجھے کل کچھ دیر کے لیے۔" عدیل کہتے کہتے رک گیا۔
"کل کچھ دیر کے لیے؟" وہ زیر لب دہرا کے بولا۔
"کیا چھٹی چاہیے؟" اس نے اندازا" پوچھا۔
"نہیں یار چھٹی نہیں چاہیے 'بلکہ۔" وہ پھر رک گیا۔
"ارے استاد بتاؤ بھی 'تم تو ایسے شرما رہے ہو جیسے لڑکی چاہیے؟" چھوٹے نے خفگی سے کہا تھا اور عدیل کو بتانا ہی پڑا۔
"یار مجھے نہ تو چھٹی چاہیے اور نہ ہی کوئی لڑکی چاہیے 'بلکہ مجھے بائیک چاہیے 'وہ بھی کل شام تھوڑی دیر کے لیے۔"
"بائیک؟" چھوٹے کو کافی حیرانی ہوئی تھی۔
"ہاں یار! بس کل شام کسی کام سے جانا ہے 'پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ تھا میں نے سوچا سلو سے کہوں گا اس کی بائیک ہے 'لیکن یار اب اسے کہتے ہوئے مجھے عجیب لگ رہا ہے 'دل نہیں مان رہا۔"
"استاد تیرا دل مانے یا نہ مانے 'لیکن میرا تو مانے گا نا؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب کہ میں اس سے کہتا ہوں 'تم بے شک نہ کہو۔" چھوٹے نے اس کی مشکل حل کرتے ہوئے اسے ٹینشن فری کر دیا تھا۔
"واقعی؟"
"اوئے آف کورس استاد۔" چھوٹے نے آف کورس کو بھی زبان سے خاصا رگڑ کے ادا کیا تھا۔
"تھینک یو یار 'تھینک یو سو مچ۔" عدیل کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور پھر واقعی دوسرے روز چھٹی سے پہلے چھوٹے نے سلو کی بائیک کی چابی لا کر عدیل کو تھما دی تھی اور عدیل اس کا بار بار شکریہ ادا کرتا ہوا بائیک لے کر گھر آگیا تھا 'وہ نہا دھو کر فریش ہوا تو مریم بھی جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔
"چلیں بھائی۔" وہ چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی 'ہاتھ میں فاطمہ کے تحفے کا شاپر تھا 'اس نے اس سوٹ کو کافی خوب صورت پیکنگ کی شکل دے دی تھی۔



"چلیں۔" عدیل امی 'ابو کو اللہ حافظ کہتا باہر آگیا اور دونوں بہن بھائی فاطمہ کے گھر کے جانے کے لیے روانہ ہو گئے اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ فاطمہ کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ عدیل نے بائیک باہر ہی روک دی 'حالانکہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مریم بائیک سے اتر گئی۔
"پک کرنے کے لیے کب آؤں؟" اس نے مریم سے پوچھا۔
"ابھی تو آئی ہوں 'مجھے کیا پتا کہ ان کی پارٹی کا کیا ٹائم ٹیبل ہے؟" مریم نے رسانیت سے کہا۔
"ٹھیک ہے میں آنے سے پہلے فون کر کے پتا کر لوں گا۔" اس نے سر ہلا دیا اور مریم پلٹ کر اندر آگئی۔
"السلام علیکم۔" فاطمہ اسے گیٹ پر ہی مل گئی تھی۔
"وعلیکم السلام 'کیسی ہو؟" فاطمہ مریم سے گلے ملی تھی 'آج وہ باقاعدہ چارلز سے تیار ہو کر آئی تھی 'اس کی خوب صورتی لشکارے مار رہی تھی 'مریم کو وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت اور پیاری لگی تھی۔
"میں ٹھیک ہوں 'تم سناؤ؟"
"میں کیا سناؤں؟ تم سناؤ کہ تم اکیلی آئی ہو؟" فاطمہ نے اسے اکیلے دیکھ کر ذرا مایوسی سے کہا تھا۔
"نہیں وہ عدیل بھائی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔"
"وہ گیٹ تک آکر چلا گیا؟ اندر بھی نہیں آیا؟" فاطمہ کو اور زیادہ ملال ہوا۔
"وہ کام سے تھکے ہوئے آئے تھے 'بس مجھے چھوڑنے کے لیے آگئے 'ابھی واپس جا کر انہوں نے کھانا بھی کھانا تھا۔"
"تو کیا یہاں اسے کھانا نہیں مل سکتا تھا؟" فاطمہ بحث کرنے کھڑی ہو گئی تھی 'اسے عدیل پہ رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔
"فاطمہ پلیز یار 'چھوڑو بھی 'کوئی اور بات کرو۔" مریم نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
"کیا یہ چھوڑنے کی بات ہے؟ اسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ مجھے اپنی زبان سے وش ہی کر دے؟" فاطمہ کے دل میں افسوس اور صدمہ ہلکورے لے رہا تھا۔
"وہ جلدی میں تھے یار۔"
"ہونہہ! اس کی جلدی میں بخوبی سمجھتی ہوں 'اسے صرف بھاگنے کی جلدی تھی 'خیر تمہیں پک کرنے بھی تو آئے گا 'دیکھ لوں گی 'تمہیں کیسے لے کر جاتا ہے۔" فاطمہ کے عزائم پہ مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی اور اتنے میں وہاں کھڑے کھڑے ہی اوپن ایئر جیپ اندر آرکی 'جس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں فاطمہ اور مریم نہا گئی تھیں اور ان دونوں نے ہی چونک کر دیکھا تھا 'جیپ سے تین چار لڑکے ایک ساتھ اترے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی طرف ہی بڑھ آئے تھے 'مریم نامحسوس انداز میں اپنی چادر درست کرتے ہوئے سمٹ گئی 'جبکہ فاطمہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

فرحین اظفر

**مکمل ناول**

"السلام علیکم اماں جی!" انتہائی آغاز صبح کے وقت، جب ابھی روشنی کے دور دور تک کوئی آثار نہ ہوتے۔ اماں جی کے کمرے میں او تھمتی زندگی گویا اسی نرم آواز کی محتاج ہوتی۔ اور یہ آواز گونجتے ہی جاگ اٹھتی۔

اماں جی پیر سمیٹ کر چشمہ ٹٹولتی اٹھ بیٹھیں۔

"زینی میری چپل۔"

"پلک جھپک ایک نازک وجود چشمہ تھمانے کے بعد چپل سیدھی کر دیتا۔ اور اماں جی کے لبوں سے دعاؤں کے سوتے پھوٹ پڑتے۔

پھر آنے والے تین گھنٹوں میں گھر کے کونے کونے سے بھانت بھانت کی آوازیں مختلف کاموں کے لیے پکارتی رہتیں۔ اور آگے پیچھے یہ نام جڑا ہوتا۔

"زینی! بھائی کے کپڑے پریس کر دیئے تھے۔" یہ بھابھی کی آواز ہوتی۔

"میرا دوپٹہ تو چھت پر سے لا دو زینی۔" یہ ندرت تھی۔ کم و بیش اس کی ہم عمر۔

"میں آج آملیٹ کھاؤں گی پر انڈا ذرا کڑک کرا دینا۔" بیلی باجی بڑی تھیں۔

"یار علی کی نانٹ تو لگا دو۔ تمہارے ہاتھ کی کریز اور ناشتہ۔"

عاصم کی آواز بھی سب سے الگ تھی۔ اور انداز بھی۔

وہ پھرکی کی طرح گھر بھر میں ناچتی ہونٹوں پہ مسکراہٹ، چہرے پہ نرمی ہر ایک کام بلا چوں چرا کیے نبٹاتی چلی جاتی۔ باہر جانے والے ایک ایک کر کے گھر سے نکلتے جاتے۔

عاصم اور اعظم بھائی آفس کے لیے۔ بے بی باجی ٹیچر تھیں۔ ثانیہ کالج جاتی تھی۔ اور بھابھی خیر سے ذرا دیر بعد محلے بھر کی خبر گیری کے لیے نکل جاتیں۔ اس کا کام کم ہو جاتا۔

سب سے آخر میں وہ اپنا ناشتا جو اکثر بچے ہوئے ٹھنڈے انڈوں اور پراٹھے کے ادھ کھائے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا لے کر اماں بی کے دلیے کے ساتھ ان کے تخت پر جا بیٹھتی۔

پھر وہ ہوتی، دادی ہوتیں اور ان کی باتیں۔

گھر کے کسی چھوٹے بڑے اور ہر فرد سے اس کی ایسی دوستی نہ تھی۔ ہو بھی نہ سکی۔ اس نے تو بہت کوشش کی۔ لیکن یہاں کسی کو اتنا انٹرسٹ نہیں تھا۔

گھر کے اکثر افراد کا اس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ صرف اور صرف کام کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اور کام کے لیے ہی یہاں لائی گئی ہے۔

اسے اس گھر میں لانے والے گھر کی نام نہاد کرتا دھرتا شخصیت اعظم بھائی نے کبھی تردید یا تائید نہیں کی۔

اس لیے بہت عرصے تک ان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد اس نے گھر میں خود ہی اپنی حیثیت کا تعین کر لیا۔ اور اس کی حیثیت گھر کی ملازمہ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ مگر وہ خوش تھی اور گھر

ہے کہ ہر فرد کی احسان مند ہو۔

ان لوگوں نے اسے صرف یہاں جگہ ہی نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا تھا۔ جو اسے خوش کرنے اور ان کا احسان مند بنانے کے لیے کافی تھا۔

گھر کے ہر فرد کی طرح ایک چھوٹا لیکن صاف ستھرا کمرہ جو پہلے اسٹور روم کہلاتا تھا اور چھت کے آخری کونے پر چند فٹ کی لمبائی چوڑائی پر مشتمل تھا۔ اس کے لیے بہت کافی تھا۔

کبھی کبھار' تہوار پر نئے اور اکثر بے بی باجی اور ندرت کے رد کیے ہوئے کپڑے 'جو نئے ہی ہوتے تھے۔ بس ہلم کی اترن کہلاتے۔

اسی طرح چپلیں' جیولری اور دو اور کتابیں بھی۔

لیکن اس سب سے بڑھ کر جو اسے یہاں سے ملا اور جس کا احسان وہ زندگی بھر نہیں چکا سکتی تھی۔ وہ تھی محبت جو ان سب کے دل میں اس کے لیے تھی۔ اور عزت بھی شاید کبھی کبھی' کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتی تھی۔ جو اپنے پچھلے گھر میں وہ کبھی مر کے بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

اسے یاد تھا آج بھی وہ دن' جب اعظم بھائی نے ابا کے انتقال کے بعد پہلی بار تعزیت کی غرض سے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔

ابا کی دوسری شادی کے بعد زندگی اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے تنگ ہی رہی تھیں۔

اس وقت بھی امینہ بیگم پلاسٹک کی انتہائی سخت چپل' کافی بے تکلفی سے اس کے چہرے اور کمر پر برسا رہی تھیں۔

اب یہ چپل کے ڈیزائن اور کوالٹی کا کمال تھا یا اس کی نازک اور حساس جلد کا کہ جب اعظم بھائی نے ایک کے لال کے چپتا ہوا ہاتھ تھاما اور اس کا چہرہ دیکھا تو وہی ورا اسی نیلے رنگ میں رنگا ہیں داہنی آنکھ کے نیچے جگمگا اٹھا تھا۔

بس وہیں فیصلہ ہو گیا۔

چھوٹی امی رہا' "یہاں لوگ کیا کہیں گے" کہتی رہیں۔ انہوں نے خاطر میں نہ لاتے ہوئے حشمت سے سامان باندھنے کا حکم دیا۔ اور وہ تو وقت پیدائش سے ہی حکم کی غلام تھی۔

اعظم بھائی جانتے تھے۔ چھوٹی امی اس جیسی مفت کی نوکرانی اتنی آسانی سے چھوڑیں گی نہیں۔ جب ہی کچھ دنوں کے وعدے پر ساہیوال جیسے چھوٹے سے شہر سے کراچی لائے تھے۔

یہاں آ کے وہ افراد خانہ کی محبتوں اور اعلا ظرفی کی قائل ہو گئی۔ (حقیقت یہ تھی کہ اعلا ظرفی اور محبت نام دونوں ہی چڑیائیں اس نے کبھی دیکھی نہ تھیں۔)

دنوں میں ہی اپنی خدمت گزاری اور زبان بندی کی پیدائشی عادت کی وجہ سے سب کا دل جیت لیا۔ مہینے بھر بعد اعظم بھائی نے اس کی گھر واپسی کی بات چھیڑی تو اسے ہوش سا آ گیا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

"دادی! ایک بات کہوں۔" اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔

"کہو بیٹا۔" دادی کو بھی اس سے انسیت سے ہو گئی تھی۔

"میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ مجھے یہیں روک لیں۔ اپنے پاس۔"

اس کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ دادی کا دل پگھل کر رہ گیا۔ اسے واپس بھیجنے کا اعظم حسین کا دل بھی نہیں مانتا تھا۔ وہ جلد ہی دادی کی بات مان گئے وہ بے طرح خوش ہو گئی۔

ساٹھ گز کے اس ڈربے سے اٹھ کر' چار سو گز کے اس ہوائی حویلی میں آنا اور پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو کر رہ جانا اس کے لیے ایک ایسا خواب تھا۔ جس کی تعبیر پانے کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ وہ اعظم بھائی کا جتنا بھی شکر کرتی کم تھا۔

البتہ عالیہ بھابھی اور بے بی باجی اس کے مستقل قیام کے فیصلے پر جز بز ضرور ہوئی تھیں۔

تب سے اب تک اس گھر میں رہتے ہوئے اگر اس نے بہت سی سہولتیں اور رعایتیں (جنہیں سہولت اور رعایت بھی صرف وہ خود ہی کہہ سکتی تھی۔) اپنے لیے حاصل کی تھیں۔ تو اپنی بے زبان خدمت کے بل بوتے پر۔ اور جو کبھی ذرا ترش یا کڑوی کسیلی سنی بھی پڑتیں۔ ان ہی دو خواتین کے منہ سے تو کیا ہوا۔ نرم گرم تو سگی ماں بہنوں میں بھی ہوتی ہی ہے۔ وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ ہمیشہ خدا کا شکر ادا کیا۔ اور اپنے دل کو سمجھا بجھا کر راضی بہ رضا گھر والوں کی خوشنودی کے لیے کمربستہ ہی رکھا۔

"کیا بات ہے آج بڑی خاموش ہو۔" دادی نے اس کی خاموشی نوٹ کر لی تھی۔

"نہیں تو دادی! بس سوچ رہی تھی شام کے لیے کچھ اہتمام ابھی سے کر کے رکھ لوں۔"

"عالیہ سے پوچھ لینا پہلے۔ اسے گھر کے خرچ کی بہت فکر رہتی ہے۔"

اس عمر میں بھی ان کے لہجے میں ساسوں والی مخصوص جلن تھی۔ وہ ہنس دی۔

"تو ٹھیک ہے نا اماں جی۔ ان کی سختی کی وجہ سے ہی خرچے قابو میں رہتے ہیں۔ ورنہ مہنگائی کا پتا ہے نا آپ کو۔"

وہ بڑی رغبت سے ٹھنڈا چکنا آملیٹ اور پراٹھے کا بچا ہوا ٹکڑا نوالے بنا بنا کے نگل رہی تھی۔

"کبھی اپنے لیے بھی کچھ تازہ بنا لیا کر۔ گھر بھر کے لیے بناتی ہے۔" انہوں نے موضوع پلٹا۔

"کیا ضرورت ہے۔ اچھا ہے' رزق ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔" اس کا اطمینان ہنوز تھا۔ اماں جی عادی تھیں۔ بس میٹھی نظروں سے اسے تکتی رہیں پھر بولیں۔

"صبح اٹھ کر یہ تلخ گرم چائے اتنی۔ ساری رنگت جھلس جائے گی۔ پھر کوئی بیاہنے نہیں آئے گا۔"

"ارے!" وہ پھر سے ہنس دی۔

"تو کسے پڑی ہے بیاہ کی فکر۔ میں تو اپنی دادی کے پاس رہوں گی ہمیشہ۔"

"ہشت پاگل ایسا بھی ہوتا ہے کیا کبھی۔ خدا تجھے جلد سے جلد اپنے گھر کا کرے بس۔"

"اُفوہ! اتنی جلدی کیوں دادی! کیا میرے ناشتے کے لیے بور ہو گئی ہیں۔" اس کے لبوں پر شرارت چمکی۔

"میں کیوں بھلا تجھ سے تنگ ہوں گی۔ تیرے سوا مجھے یہاں پوچھتا ہی کون ہے۔" انہیں اپنا دکھڑا یاد آ گیا۔

"پر بیٹیوں کا اصلی گھر تو ان کا سسرال ہی ہوتا ہے نا۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے اس سے کس کو انکار۔"

اس بار وہ چپ رہی۔ سوچ کی پرچھائیں میں کسی قریبی شخص کا عکس تھا شاید۔

"اب دیکھو نا آج بے بی کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہاری اور ندرت کی ہی تو باری آئے گی۔"

دادی کی آواز اور انداز گفتگو بہت نرم اور پر اثر ہوتا تھا۔ اس کا دل چاہتا گھنٹوں سنتی رہے۔ عالیہ بھابھی اور دادی کے درمیان روایتی ساس' بہو والا رشتہ اگر کبھی ان کی شادی کے اوائل دنوں میں رہا بھی تھا۔ تو بچوں کے جوان ہونے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ دادی کے پاس زیادہ وقت نہیں گزارتی تھیں۔ وہ نہ ان کی پوتیاں۔ دادی ٹھیک ٹھاک بھرے پرے گھر میں تنہائی کا رونا روتی تھیں۔

زینب نے آ کے ان کی تنہائی بانٹ لی تھی۔ انہیں اس کی ہر بات بہت پسند تھی۔ وہ اس سے پیار کرنے

لگی تھیں۔ جبھی چاہتی تھیں اس کی حیثیت بدلے۔ چاہے گھر کے اندر ہی کسی رشتے کے حوالے سے گو کہ فی الوقت یہ بڑی ناممکن سی بات تھی پھر بھی وہ چاہتی تھیں وہ یہاں نوکرانی بن کر نہ رہ جائے۔

”کبھی چپکے سے ایک آدھ کپ دودھ بھی پی لیا کرے۔“

اس نے ان کے مشورے پر ہنسی لبوں میں دبا کے کھٹکے پر مڑ کے دیکھا۔

”زینی! ناشتہ ملے گا۔“ دروازے پر ارحم کھڑا تھا۔

”جی ابھی۔“ اس کا ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔

چائے کے آخری تین چار بڑے بڑے گھونٹ حلق میں اتارے۔ اور اس کی گلابی پوروں کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھتی ٹرے اٹھا کے باہر نکل گئی۔ جو دادی کے جھریوں بھرے سانولے ہاتھ ہتھیلی میں دبائے کچھ اور بھی گلابی لگ رہی تھیں۔

”کیا بنا رہی ہو۔ کباب ہیں۔“ وہ کچھ دیر بعد چلا آیا۔

”ختم ہو گئے۔“ وہ مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔

”تو پھر جو ہے وہی دے دو۔ پہلی سے کہا بھی تھا کہ بنا کے رکھ دینا۔“ وہ جھنجلایا نہیں تھا۔ پھر بھی اسے شرمندگی ہوئی۔

”بے بی باجی کچن کا کوئی کام نہیں کرتیں۔ کچھ چاہیے ہو تو مجھ سے کہہ دیا کریں۔“ ان کا لہجہ سادہ تھا۔ پھر بھی وہ رک کے اسے دیکھنے لگا۔ اسے لگا فوراً وضاحت دینی چاہیے۔

”وہ... اسکول سے آکے تھک جاتی ہیں نا۔ ندرت کالج سے تھکی ہوئی آتی ہے۔“

”اور تم کچن سے نہیں نکلتیں۔“ بات بے ساختہ تھی۔ وہ گڑبڑا کے چپ ہو گئی۔

اعظم بھائی کے بڑے بھائی معظم۔ جنہیں وہ سب کی دیکھا دیکھی تایا ابا بلاتی تھی۔ ان کی پہلوٹھی کی اولاد تھے یہ صاحبزادے ارحم حسین جن کے بارے میں وہ گھر والوں سے غائبانہ کافی سن چکی تھی۔

صاف گوئی اور بدلحاظی؟ اس کی وہ پہلی اور آخری خصوصیات تھیں جو باقی خصوصیات اور خوبیوں کو پیچھے چھپا لیتی تھیں۔ اور گو کہ اس کو آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ لیکن یہ دونوں خصوصیات اور صاف گوئی ذرا بڑھ کے شخصیت پر پوری طرح حاوی دکھائی دیتی تھی۔

”بوائل کر دو انڈہ، سلائس پر جیم لگا دو، ایک کپ چائے۔“

”جی اچھا۔“ وہ تابعداری سے سر ہلاتی مصروف ہو گئی تھی۔

بہ سلسلہ روزگار اسے کراچی آنا پڑا۔ یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن چچی کا اصرار اور محبت وہ مجبور سا ہو گیا۔

”آپ آج آفس...“ بولتے ہوئے وہ چپ کر گئی۔ احساس ہوا حد سے باہر ہی نہ نکل جائے۔ بلاوجہ کچھ سننا پڑے۔

”چپ کیوں ہو گئیں؟“ اس کا لہجہ نارمل ہی تھا۔

”ایسے ہی۔“ اس نے پھیلے ہوئے کچن سے گندے برتن سمیٹ کر سنک میں ڈالنے شروع کر دیے۔ ناشتے کا پرسکون دور گزر چکا تھا۔ اب تین اہم کام اس کی توجہ کے منتظر تھے۔ گندے برتن کچن کی صفائی جو ہر حال میں بھابھی کی آمد سے پہلے مکمل کرنی تھی۔ وہ روز کا سودا خود خرید کر لاتیں اور زیر ہدایت پکواتی تھیں۔ آج مصروفیت کا گراف اونچا ہی رہنا تھا۔ بے بی باجی کو دیکھنے چند خواتین کی آمد متوقع تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد شام کی تیاری بھی خاص کرنی تھی۔ اور صفائی خاص الخاص۔ وہ ناشتا کر کے ارحم کو چھوڑ کر تیزی سے مصروف ہو چکی تھی۔ چونکی جب جب اس نے اسے تیار ہو کر آفس کے لیے نکلتے دیکھا۔ اس کی شخصیت ——— ممتاز نظر آتی تھی۔ عالیہ بھابھی اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

”سب تیار ہے نا۔“

”جی بھابھی۔“ اس نے لوازمات سے سجی ٹرالی پر آخری نگاہ ڈالی۔

بازار سے لائی گئی اشیاء کے علاوہ ایک بڑا کیک اور نان خطائیاں اس نے گھر پہ بیک کرلی تھیں۔ یہ بیکنگ اسے ندرت نے باقاعدہ کورس کرکے سیکھنے کے بعد سکھائی تھی۔

اس نے یہ کورس کچن میں اپنا رنگ روپ خراب کرنے کے لیے نہیں، صرف ٹائم پاس کرنے کے لیے کیا تھا۔ کوئی ان خوش ذائقہ چیزوں سے محروم نہ رہے اس لیے احسان کرنے کے سے انداز میں زینی کو خاص طور پر سکھائی تھیں۔ زینی نے خوشی خوشی سب سیکھا۔ ندرت جانتی تھی زینی کو سکھانے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وہ ناصرف دل لگا کے سیکھے گی۔ بلکہ بعد میں سب کو بنا بنا کے کھلائے گی بھی اور سب کے سامنے فراخدلی سے قبولے گی بھی کہ اسے کچھ نہیں آتا تھا۔ سب ندرت نے سکھایا ہے۔

احساس برتری کا جو سرٹیفکیٹ اسے زینی کے ذریعے سب کے سامنے ملتا رہتا۔ وہ زینی کے ہاتھ کی بنی تمام خوشبودار، خوش رنگ اور خوش ذائقہ چیزوں کے علاوہ تھا۔ وہ سب کو محنت سے بنا بنا کے کھلاتی اور داد وصول کر کے کسی تمغے کی طرح ندرت کے سینے پر سجا دیتی۔

خود اسے تو پتا نہیں ندرت کی اس خود غرضی کا شعور تھا یا نہیں۔ البتہ بے بی باجی سے ضرور ندرت نے اپنی اس کار آمد ترکیب پر داد وصول کی تھی۔

عالیہ بھابھی البتہ اکثر غیر جانبداری کا مظاہرہ کر جاتیں۔ اس میں بظاہر کوئی نقصان بھی نہ تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے اسے دل نہ چاہتے ہوئے بھی تیار ہونے کی ہدایت دی۔

”صبح سے کچن میں لگی ہو اپنا حلیہ دیکھو۔“

اور وہ سادہ دل ان کی اتنی سی بات پر ہی نہال ہو گئی۔ تھکن زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جھٹ پٹ تیار ہونے اوپر چل دی۔

”ہاں جی آ زینی اوپر سے آئے تو اسے یہیں بلا لیجیے

گی۔"

اب وہ دھیمی آواز میں دادی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی ایک بالکل الگ ہی ہدایت جاری کر رہی تھیں اور وہ بھی بڑے رازدارانہ انداز میں۔

دادی نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ وہ دادی کی ناپسندیدگی سے واقفیت کے باوجود اپنے تئیں مجبور تھیں۔

"کیا کروں اماں جی۔ ندرت اور وہ تو عمر لڑکیاں اور اوپر سے بے بی کی رنگت' آج کل ہر ایک کو گوری لڑکی چاہیے۔ ایک تو بے بی کی عمر زیادہ ہے۔ چلو اتنی بھی زیادہ نہیں' ناصم سے صرف دو سال ہی تو بڑی ہے۔ مگر سانولا رنگ تو لڑکی کو اچھی خاصی عورت بنا دیتا ہے۔ کیا کروں' اسی میں اس کی بہتری ہے۔" انہوں نے ہر بار کی طرح نئے سرے سے وضاحت دی۔

دادی مصلے پر بیٹھی تھیں۔ بنا جواب دیے منہ پھیر لیا۔ بھابھی کا منہ بن گیا۔

"ہونہہ۔ سب جانتی ہیں' پھر بھی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی پلٹ گئیں۔

"تم بھی تو جانتی ہو' جو جس کا نصیب ہو گا مل کے رہے گا۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں' ہم تم جیسوں کی کیا اوقات' گناہ گاروں کی کیا بساط۔" وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئیں۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔

لوگ آتے بے بی کے لیے اور پسند ندرت کو کر کے چلے جاتے۔ اور جس کی نظر اس پہ پڑ جاتی تو پھر وہ توں بہتیں ہی نظر آنا بند ہو جاتیں۔ لوگ اسی کے لیے دست سوال دراز کر دیتے۔

شروع میں ایک' دو بار تو عالیہ بیگم بہت سٹپٹائیں۔ پھر اس کے بعد ندرت کو خاص طور پر آنے والی خواتین کے سامنے آنے سے روک دیا گیا۔ زینی کو صاف صاف اس لیے نہیں کہا گیا کہ کہیں وہ اپنے آپ کو کسی بھی معاملے میں اس گھر کی لڑکیوں سے آگے نہ سمجھ لے۔ خواہ وہ خدا کی دین ہی کیوں نہ ہو۔

یہ زندگی کتنی عجیب ہے۔

اکثر لوگوں کے ساتھ یہ حرکت کرتی ہے۔ جھولیاں بھر بھر کے نعمتیں عطا کرنے کے بعد کوئی ایک ایسی چیز واپس لے لیتی ہے کہ انسان اس کے لیے اپنے جیسے ہی دو آنکھوں اور ایک زبان والے کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو کے رہ جاتا ہے۔

وہ تیاری کے نام پہ محض منہ دھو کے اور کپڑے بدل کے ہی آئی تھی۔ پھر بھی دادی نے اسے آواز دے کر اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

وہ ان کے پیر دباتی سوچ رہی تھی کہ چائے اور دوسرے لوازمات لے جانے کے لیے ابھی اس کے نام کی پکار پڑے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے بے بی باجی کو چائے لے کر ڈرائنگ روم میں جاتے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی۔

نگہت عرف بے بی کچن کے کام کرنا بے عزتی کے مترادف سمجھتی تھیں۔ ایسے نازک موقع پر بھی خود سے کام کرنے کے بجائے وہ ندرت یا زینی کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔ اس وقت زینی کو خوش گوار حیرت ہوئی' دادی غنودگی میں جا رہی تھیں۔ جب دروازے پر ایک باوقار سی خاتون کو کھڑا دیکھ کر اس نے دھیرے سے ان کے پیر ہلائے۔

خاتون' دادی کو سلام کرتی ان کے پاس بیٹھ چکی تھیں۔

وہ مودب سی کھڑی تھی۔ جبکہ ان کے پاس کھڑی بھابھی نے اسے اشارے سے کمرے سے باہر جانے کا کہا۔ وہ نا سمجھی کے انداز میں انہیں دیکھتی باہر نکل گئی۔

اس بات سے بے خبر کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

☼ ☼ ☼

قصور اس کا نہیں تھا۔ عالیہ بھابھی بولتیں بھی تو کیا۔ لیکن بے بی باجی کے لیے یہ بات ہضم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ حیرت زدہ سی ان کے بدلتے رویے پر دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔

"دادی! اس میں میرا کیا قصور۔"



آج ناشتے میں انڈے نہیں تھے۔ رات کا بچا ہوا قیمہ سب نے ناشتے میں ختم کر دیا تھا۔ وہ سوکھی روٹی چائے کے ساتھ حلق سے اتار رہی تھی۔ دل تو اس سا تھا۔

"ائے ہے' تیرا قصور کیا ہوتا ہے۔ یہ اپنی عالیہ اور نگہت تو موٹی عقل کی ہیں۔"

"ابھی تو ان کی طرف سے جواب نہیں آیا نا' کیا پتا بے بی باجی پسند ہی آگئی ہوں۔"

مہمانوں کو آئے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ سبھی مایوس ہو گئے تھے' سوائے خود اس کے۔

"چل تو دل برا نہ کر' آج کیا پکائے گی۔"

صبح صبح دادی کا دل چاہتا دن بھر کی باتیں ابھی کر ڈالیں۔

"ہوں۔" وہ ذرا ابھر کے سوچ میں ڈوب گئیں۔

"کریلے کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

"تو بھرے کریلے پکا دوں آپ کے لیے۔" اس نے تیزی سے انگلیاں چٹخائیں۔

"اسے رہنے دے' وہ ابھی پکانے دے گی تجھے۔"

دادی کا اشارہ بھابھی کی طرف تھا' ان کے دل جلے انداز پر اس کی ہنسی نکل گئی۔ دادی نے دل ہی دل میں نظر اتاری۔ اس کی ہنسی تھی بھی تو ایسی' جھرنوں کی طرح مترنم۔ صرف دادی ہی نہیں دروازے میں کھڑا کوئی اور وجود بھی مسحور ہو کے رہ گیا۔

"ارے ارحم بیٹا آؤ نا' وہاں کیوں کھڑے ہو۔"

دادی کی آواز پر اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ فوراً" دوپٹہ سمیٹ کر برتن اٹھائے۔

"آج آپ کباب لیں گے ناشتے میں۔" اس کے سر ہلاتے ہی وہ باہر نکل گئی۔

ارحم آفس دیر سے ہی جاتا تھا۔ باقی سب نکل چکے تھے۔ صرف عالیہ بھابھی گھر پہ تھیں۔

"ارے بھابھی' کیا ہوا۔" وہ کچن میں کھڑی تھیں۔ چہرہ سوچا ہوا تھا۔

"سر میں درد ہے۔" آواز بھی بھاری سی تھی۔

"تو مجھے بتاتیں نا' آپ تو صبح سے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔" اس نے برتن رکھ کے ان کا ماتھا چھونا چاہا۔

"ارے ہٹو' اپنا کام کرو۔" بھابھی نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بھابھی بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ وہ ان کا منہ دیکھتی رہ گئی' جھلائے ستم دروازے میں ارحم کھڑا تھا۔ وہ پلٹ کے ناشتا بنانے لگی۔

"کہیں اس نے بھابھی کی حرکت دیکھ تو نہیں لی۔" بے عزتی کا احساس اس گھر میں نیا نیا تھا۔ اس لیے تکلیف بھی زیادہ ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

فضا میں خنکی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ دن میں گرمی' رات میں معاملہ بالکل الٹ تھا۔ چادر اوڑھ کے سونے میں بھی بے چینی لگی رہتی' اس کا کمرہ تو تھا ہی چھت پہ۔ کئی بار کروٹیں بدلنے پر بھی چین نہ ملا تو دادی کے پاس جانے کا خیال کر کے وہ کمرے سے نکلی تھی۔

"ارحم بھائی۔" دھیمی سی آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور منڈیر پر سے ہاتھ ہٹایا۔

"تم سوئی نہیں۔"

"نہیں' بس سردی لگ رہی تھی۔" ارحم کچھ کہے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ کنفیوز سی ہو گئی' رکے یا بڑھے۔

"سردی لگ رہی ہے تو چائے پی لو۔" اس نے سہولت سے مشورہ دیا۔

"جی۔" وہ سر ہلا کے آگے بڑھی۔ اس کا اس مشورے پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"اور سنو' ایک کپ مجھے بھی دے دینا۔"

"جی۔" وہ پلٹی' چہرے پر حیرت تھی' ارحم نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ پورے چاند کی تیز روشنی میں اس کا وجود بہت سحر انگیز تھا۔ وہ نظریں چراتی سیڑھیاں اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

"تو یہ اتنی بے عزتی کی بات ہے۔"

وہ کچن میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئی۔ سامنے ندرت اور بے بی باجی کھڑی تھیں۔ بے بی باجی نے دانت پیس کر ایک کٹیلی نگاہ اس پہ ڈالی۔ وہ اس انداز پر جھجکتی ہوئی آگے چائے رکھنے لگی۔ سب چاہے لاکھ مل کر اسے یقین دلاتے کہ یہ گھر اس کا ہے اور وہ یہاں ایک فرد کی طرح ہے۔ لیکن اجنبیت کا احساس خاطر میں نہ لانے کے باوجود کبھی کبھی جھلک دکھا ہی دیتا تھا۔ جیسے ابھی اس کا انداز "رکا" رکا سا تھا' اور بے بی باجی کی گھورتی نظریں۔

"کس کے لیے بن رہی ہے یہ بے وقت چائے۔"

"جی وہ ارحم بھائی نے مانگی ہے۔"

"اور یہ دوسرا کپ۔" ندرت بھی بول اٹھی۔

"یہ۔ یہ آپ لے لیں۔ میں نے تو یوں ہی نکال لی۔" اس سے جواب نہیں بن پڑا۔

"معلوم بھی ہے کیا حساب چل رہی ہے پتی اور دودھ۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ اب وہ وقت نہیں ہے' یوں ہی بلا' ایسے ہی نکال لیا۔"

ان کے بے وقت لیکچر کی وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی تو تھی۔ پھر بھی اس نے بے پناہ خفت محسوس کی۔

بے بی باجی نے وہ کپ اٹھا کے ندرت کو تھما دیے۔

"لو تم جا کے دے آؤ یہ چائے اور تم ذرا میرے کپڑے پریس کر دو۔ بھولتی جا رہی ہو کیا کام سونے سے پہلے کرنے ہیں' اور کیا جاگنے کے بعد۔" اب کی بار وہ اس سے مخاطب تھیں۔

انکار کرنا تو خیر اسے آتا ہی نہ تھا۔ لیکن اس وقت آنکھوں کی دہلیز پر پذیرائی کی منتظر کھڑی نیند کی پری کو ٹھلانا معمول سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔

ایک تو صبح سب سے پہلے مطلب دادی سے بھی پہلے' یعنی فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی جاگنے اور سب کو ناشتا دینے کی ذمہ داری۔

ایک لمحہ کو دل چاہا کہہ دے۔ "اپنے کپڑے آپ خود پریس کر لیں۔" آخر کو اسکول سے آ کے وہ سارا دن آرام ہی تو کرتی تھیں۔ لیکن پھر اسے یاد آ گیا کہ آج کل وہ دو بھی ہیں' موڈ بھی ٹھیک نہیں اور تیور بھی۔

اپنی عزت اپنے ہاتھ کے مصداق وہ ان کے پیچھے قدم بڑھاتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"زینی تم ذرا اٹھو۔ مجھے اماں جی سے کچھ بات کرنی ہے۔"

حسب معمول دادی کے گھٹنے سے لگی۔ ناشتے کے وقت کی فراغت کو انجوائے کر رہی تھی۔ بھابھی کی غیر معمولی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے کھسکنے میں ہی عافیت تھی۔

"زینی کیا یار' مجھے بھی تم کو یاد دلانا پڑے گا کیا۔ پرسوں سے کپڑے رکھے ہیں۔" عاصم نے کمرے سے نکلتے ہی اسے پکڑ لیا۔ زبان سے کچھ کہتا تھا آنکھوں سے کچھ۔ زینی کو رونا آتا تھا۔ اسے آفس جانے کی جلدی تھی۔ لیکن اتنی مہلت میں بھی اس نے زینی کا مسکراتا چہرہ نگاہوں میں اتار لیا۔

"میں لیٹ ہو رہا ہوں' پلیز جانے دو۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"میں نے کب روکا ہے۔"

"اچھا آج ضرور کر دینا پریس ہاں۔" وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے کمرے کے کھلے دروازے سے نظر آتے کپڑوں کے ڈھیر پر نظر ڈالی۔ آج اسے گھر بھر کے کپڑے دھونے بھی تھے۔ اس نے پہلے دھونے کا ارادہ کر لیا۔ یوں بھی سب کے کپڑے پریس کرنے تھے تو دھونے کے بعد اکٹھا ہی سہی۔ وہی روز والے کام تھے وہی مصروفیات۔ لیکن پھر بھی ایک سستی اور کسلمندی طبیعت پر سوار تھی۔ اس نے سوچا بھابھی سے کہوں واشنگ مشین کل لگاؤں گی۔ فیصلہ کر کے اس نے مطمئن سا ہو کے دوبارہ سے دادی کے کمرے تک کا سفر کیا۔ لیکن دروازے پر اپنا نام سن کے رکنا پڑا۔

"کیا کہوں میں زینی کو' بے بی کو خوا مخواہ۔"

"ارے تمہاری اپنی اولاد ہے' رام کر لو۔"

"کیسے اماں جی۔ بات ہی ایسی کہہ دی اس کی دوست نے۔ جس کے توسط سے وہ آئی تھی عورتیں اس دن۔"

"کیا کہہ دیا ایسا۔" دادی کو بھی تجسس ہوا۔

"وہ کہہ رہی تھیں۔ لڑکیوں سے اچھی تو گھر کی ماسی ہے۔" بھابھی دل جلے انداز میں بولیں۔

"ہائے یہ واقعی بات تو ایسی ہے۔ بے بی کے تو دماغ پر لگی ہو گی۔"

وہ ہنسی روکتی کچن کی سمت بھاگی۔ کچن میں داخل ہوتے ہی اندر ارحم کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر ہی ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ ارحم چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کھنکتی ہنسی' آنکھوں میں پانی اور نم گالوں میں شرارتی بھنور۔ اسے لگا دل کے تاروں کو کسی نے دھیرے سے چھیڑا اور چاروں اور ایک مدھم سی دھن بج اٹھی۔ جبکہ وہ اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا رہی تھی۔

"میں تو بھی آج گئے کام سے۔" اس پر حد درجہ شوخی سوار تھی۔ ورنہ عام دنوں میں وہ اس سے ذرا ریزرو ہی رہتی تھی۔

"اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟" وہ ذرا جھینپا' پھر سنبھل کے پوچھنے لگا۔

"اور! ہاں وہ۔" وہ اسے دلچسپی سے پوری بات بتا کے پھر ہنسنے لگی۔

"تو تمہیں ہنسی کیوں آ رہی ہے۔" اب کی بار وہ سنجیدہ تھا۔

"کیوں۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔" زینی نے ذرا کی ذرا غور سے اسے دیکھا۔

"ایک خاتون جو تمہاری اس گھر میں حیثیت سے واقف تھیں۔ تمہیں گھر کے دوسرے افراد کے سامنے ماسی کہہ گئیں اور تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔"

اس کا اشارہ شاید بے بی باجی کی دوست کی طرف تھا۔ زینی کے مسکراتے لب لمحوں میں سکڑ گئے۔

"سیلف ریسپکٹ نام کی کسی چیز سے واقف ہو تم۔" اس کا انداز صرف سنجیدہ تھا۔ نہ طنزیہ نہ خفا' اسے جانے کیوں محسوس ہوا۔

"میں تو بے بی باجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"بہت سوچی ہو تم اس گھر کے لوگوں کے بارے میں۔" وہ سنجیدگی سے ناشتے میں مگن تھا۔

"وہ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں' کبھی پتا کیا ہے۔" زینی کو لگا وہ بے سوچے سمجھے بول رہا ہے۔

"مجھے سو فیصد یقین ہے کہ جو لوگ نگہت کو دیکھنے آئے تھے' ان کے سامنے کسی نے تمہاری حیثیت کی تصحیح نہیں کی ہو گی۔" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا اٹھا اور اسے ایک طرف ہٹا کے سنک میں ہاتھ دھونے لگا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ جو بات اس نے ابھی ابھی کہی تھی۔ اسے ایک آئینہ دکھا رہی تھی۔ ایک ایسا آئینہ جس میں اس کا عکس ہیچ کیا تھا۔ وہ ہاتھ دھو کے اطمینان سے باہر چلا گیا۔ جبکہ وہ سوچ رہی تھی کہ بھابھی نے ارحم کے ناشتے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سے لی کیوں بھلا؟

☼ ☼ ☼

نگہت عرف بے بی اور ندرت کے مشترکہ کمرے میں بہت عرصے انتظار اور فرمائش کے بعد اے سی لگا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ یہ اے سی بے بی باجی نے اپنی تنخواہ میں سے بچت کر کے خریدا تھا۔

ان کی خوشی دیدنی تھی۔ خوش تو زینی بھی تھی۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دن قائم نہیں رہ سکی۔ جب ایک دن ذرا سا دروازہ کھلا رہ جانے پر بے بی باجی نے اسے بری طرح دھتکار کے رکھ دیا۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے باہر نکلی اور نم آنکھوں کو حیرت سے صاف کیا۔ پھر سامنے دیکھا تو عاصم بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی نظروں اور چہرے پر اس کے لیے صرف ترحم تھا۔ زینی نے بے ساختہ ایک شکایتی نظر اس پہ ڈالی۔

"سیلف ریسپکٹ نام کی کسی چیز۔"

کوئی آواز یادداشت کے گمشدہ خانوں سے اسے بلانے لگی۔ عاصم بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ وہ تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ ابھی عاصم نے آفس سے

آ کے چائے مانگی تھی۔ اور اس نے بہت دل سے بنا کے دی تھی۔ لیکن ابھی عمر بھر کے لیے چائے بنا کے ان کے کمروں میں پہنچانا تھی۔

"تم تمکنت کی باتوں کو زیادہ مائنڈ نہیں کیا کرو زینی۔ اس کی تو عادت ہی بنتی جا رہی ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنا اور بے عزت کرنا۔"

عاصم پیچھے کھڑا نرم آواز میں کہہ رہا تھا۔ اسے اس کے آنے اور یہ بات کرنے سے ایک دم خوشی کا احساس ہوا۔ دل میں ابھی ابھی پیدا ہوا اس کے اور بے بی باجی کے خلاف معمولی سا شکوہ بھی دم توڑنے لگا۔

"میں ان کی کسی بات کا برا نہیں مانتی۔" یہ کہتے ہوئے اندازہ ہوا کہ عاصم اس کی بات پر یقین نہیں کر رہا۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں بس دھیرے سے ہنس کے پلٹ گیا۔

بھابھی ادھر ہی آ رہی تھیں۔ وہ پلٹ کے چائے کا پانی رکھنے لگی۔ یہ دیکھے بغیر کہ عالیہ بھابھی نے کچن میں عاصم اور اس کی موجودگی کو کس قدر محسوس کیا ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کو خنکی اسے پھر تنگ کر رہی تھی۔ لیکن آج اسے کل کی طرح پریشانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ کل کی طرح باہر کوئی کسی کام کے لیے اس کا منتظر نہیں تھا۔ اس نے کل رات ہی بے بی باجی کے تین سوٹ اکٹھے پریس کر کے دیے تھے۔ شام کے بعد عاصم کے کپڑوں اور وارڈ روب کی صفائی کی تھی۔ یہاں تک کہ آج وہ سونے سے پہلے ارحم کے کمرے میں چائے بھی پہنچا آئی تھی۔ بے حد اطمینان سے اپنی چادر اور تکیہ اٹھائے اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ ارحم اپنی روز والی جگہ پر موجود تھا۔

چاروں جانب پڑتی اوس نے دور کے سب مناظر دھندلا دیے تھے۔ اجلی چاندنی اور کہر کی دھندلاہٹ میں اس نے کل بھی ارحم کی شخصیت کو چمکتے ومہکتے محسوس کیا تھا۔ آج بھی وہی حال تھا۔ دراز قد چوڑے شانے اور گھنگھریالے بال' پشت سے ہی اس کی

شخصیت کی مضبوطی اور کشش کی نمائندگی کرتے تھے۔ اور وہ کل ہی کی طرح نظر بچا کے گزرنا چاہتی تھی۔ جب وہ ایکدم مڑ کے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے قدم میکانکی انداز میں تھم گئے۔

ارحم نے اپنے برابر میں منڈیر تھپتھپا کے اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

"جی۔"

"آج بغیر کہے ہی چائے بھجوادی تم نے۔ میرا پینے کا موڈ نہیں تھا۔ پھر خیال آیا تمہاری محنت ضائع ہوگی۔"

"ایک کپ چائے بنانے میں کچھ محنت نہیں لگتی۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔

آخری سیڑھی پر ندرت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔

"سوری میں تو چائے پی چکا۔"

ارحم کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مسکراہٹ تو چند لمحے پہلے تک ندرت کے چہرے پر بھی تھی۔ مگر اب نہیں۔

"تم یہ چائے زینی کو دے دو۔ اسے سردی لگ رہی ہے۔"

"آپ کو پتا تھا کہ اسے سردی لگ رہی ہے تو اپنی چائے کیوں نہیں دے دی۔" بہت کوشش کے باوجود بھی اس کا لہجہ سادہ نہیں رہ سکا۔

"میں دے دیتا۔ لیکن جب تک یہ اٹھ کے آئی۔ میں چائے پی چکا تھا۔"

"اوہ! تو یہ سونے جا چکی تھیں۔ دوبارہ اٹھ کے آئی ہے۔" اس نے [illegible] انداز میں سراہا۔

"مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میں دادی کے کمرے میں جا رہی تھی۔" تکیے اور چادر کو سینے میں مزید بھینچ کر اس نے وضاحت دی۔ جانے کیوں؟ ارحم ایک گہری سانس بھر کے باہر دیکھنے لگا۔

"اب تو میں یہ چائے بے بی باجی کو دینے جا رہی ہوں۔ زینی کو اس ٹائم چائے پینے کی عادت تو نہیں ہے لیکن اگر عادت بگڑ بھی گئی ہے تو زینی خود بنا کے پی



لے۔ اور بگڑی ہوئی عادت کو ٹھیک بھی کر لے ورنہ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔ زینی کا منہ اور ارحم کے تاثرات۔

"کل کلاں کو شادی کے بعد مشکل بھی پیش آ سکتی ہے۔" انداز بہت کچھ جتاتا ہوا سا تھا۔ ارحم کی ایک دم ہنسی نکل گئی۔

"تو پھر تو تمہیں اپنی بہت سی عادتیں سدھارنی پڑیں گی۔" ندرت کے چہرے سے تپش نکلنے لگی۔ اسے احساس ہوا ہوگا کہ ارحم کے سامنے بات کرنے میں اتنی بے احتیاطی ٹھیک نہیں۔ وہ غصے میں تیزی سے مڑی اور سیڑھیاں اتر گئی مگر آواز لگانا نہیں بھولی تھی۔

"تم بھی جلدی نیچے آؤ۔ صبح اٹھنا بھی ہے۔ ورنہ پھر مہارانیوں کی طرح پڑی رہو گی۔" اس نے ندرت کی بات پر گھبرا کے ارحم کو دیکھا۔ پھر تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی۔

☼ ☼ ☼

دن سست روی سے آگے پیچھے گزرتے رہے۔ اس کے وہی معمولات تھے۔ بھابھی کا غیر جانبدارانہ لیکن اکتایا ہوا رویہ' اعظم بھائی کی کبھی کبھی کی خبر گیری' بے بی باجی کی تلخ ترش اور ندرت کا دھوپ چھاؤں کا سا انداز۔ ہاں اگر کچھ بدلا تھا تو صرف اور صرف ارحم کے انداز۔ جو ایک نرم سی تپش اور اپنی معنی خیزی لیے اسے بوکھلانے کے لیے کافی تھے۔

اس نے کئی بار ندرت کے لہجے اور انداز میں ارحم کے لیے واضح نرمی محسوس کی تھی۔ بھابھی کا مستقبل میں اگر دونوں کے بارے میں کوئی ارادہ نہیں بھی تھا۔ تب بھی ندرت کا جھکاؤ اسے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ وہ ارحم کو مزید آگے بڑھنے سے روکے۔ عاصم اور اس کا بے نام سا تعلق اس کے علاوہ تھا۔ مسلسل تین دن رات صرف چھت پر اس کی موجودگی سے وہ اتنی بے چین رہی کہ باوجود سردی لگنے کے کمرے سے نہیں نکلی۔

پانچویں دن اس نے دادی کے کمرے میں ہی بستر لگا لیا۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض ہوتا بلکہ اسے محسوس ہوا اس عمل سے ندرت بھی ذرا پرسکون ہو گئی تھی۔ اس نے بھی اطمینان محسوس کیا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح عارضی اطمینان۔

کچھ عرصے بعد گھر میں پھر خاص مہمانوں کی آمد کا شور اٹھ رہا تھا۔ اور اس بار بے بی باجی نے صاف الفاظ میں جتلایا تھا کہ وہ مہمانوں کی آمد سے پہلے ہی کام نمٹا کر اوپر اپنے کمرے میں چلی جائے گی اور جتنی دیر وہ گھر میں موجود رہیں گے وہ نیچے نہیں آئے گی۔

اس نے تابعداری سے سر ہلا کر انہیں اپنی غیر موجودگی کا یقین دلایا تھا۔

"اور ہاں کباب ضرور بنا لینا۔ صرف دہی بڑوں اور بسکٹوں سے کام نہیں بنتا۔"

ان کی آواز کراری تھی نہیں۔ دن بدن ہوتی جا رہی تھی۔

گھر میں بنائے جانے والے آئٹمز میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ پہلے تو صرف بسکٹ' دہی بڑے اور کیک ہی بنتا تھا۔ آج کبابوں کے بھی آرڈر آ گئے تھے۔

اسے وقت سے پہلے چیزیں تیار کر کے اوپر چلے جانا تھا۔ دوپہر کا کھانا الگ تھا۔

اس لیے جب وہ تمام کام سمیٹ کر اوپر اپنے کمرے میں پہنچی تو جسم تھکن سے چور ہو رہا تھا۔

"زینی' سو گئی ہو کیا۔" ندرت کی آواز بے وقت آئی تھی۔ جھلنگا پلنگ پر آڑے ترچھے پڑے پڑے ہی اس نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔

"بابا آ گئے ہیں۔ ان کو کھانا دے دو۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف مت آنا۔" وہ عجلت میں حکم سنا کر چل پڑی تھی۔

ہمیشہ کی طرح اس نے اٹھ کر کچن میں چلے جانا چاہا۔ لیکن کسی کی آواز کوئی بات یاد آ کے ستانے لگی۔

"اگر ان لوگوں کی بھی نظر مجھ پر پڑ گئی اور مجھے ماسی سمجھ لیا تو۔۔۔"

دل میں ابھرتا عجیب سا احساس' بہت چبھن آمیز

تھا۔ لیکن اتنی ہمت وہ بہرحال نہیں تھی کہ وہیں پڑی رہتی۔ حکم جاری ہو گیا تھا۔ تعمیل کرنا اس کی مجبوری تھی۔ اور خوشی خوشی کرنا اس کی فطرت۔ اس وقت بھی دل پر ایک نادیدہ بوجھ تو تھا لیکن وہ اعظم بھائی کا کام تو کبھی بھی بے دلی سے نہیں کر سکتی تھی۔
مہمانوں کے سامنے سے ریفرشمنٹ اٹھایا جا چکا تھا۔ کچن میں بکھرے بے شمار جھوٹے برتن اور بکھری بے ترتیب کھانے کی چیزیں دیکھ کے اسے اندازہ ہوا۔
"یعنی مہمان جانے ہی والے ہیں۔" اسے کچھ سکون سا ملا۔ اب یہ سکون کتنے لمحوں کا تھا۔ اس نے سوچا نہیں تھا۔ عین اس وقت جب وہ کھانا اور بچ جانے والے لوازمات سے بھری ٹرے لے کر اعظم بھائی کے کمرے میں جانے کے لیے کچن سے نکلی۔ عین اسی ٹائم آنے والے مہمان خصوصی سے سامنا ہو گیا۔ وہ اپنی سانسوں کی طرح وہیں تھم گئی۔ جیسے وہ لوگ اسے دیکھ کر تھم گئے تھے۔ بے بی باجی وہاں نہیں تھیں۔ لیکن ندرت اور بھابھی کے بدلتے تاثرات نے اسے گنگ کر دیا۔
"یہ بچی کون ہے؟" بزرگ خاتون کے سوال میں شوق اور دلچسپی نمایاں تھی۔
"یہ ہماری ملازمہ ہے۔" اگلا جملہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ندرت کے منہ سے نکلا۔ جو یقیناً" اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ تو وہ بھابھی بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ مہمان خواتین اچھا اچھا کر کے آگے بڑھ چکی تھیں۔ ندرت تیزی سے ان کے پیچھے چلی گئی۔ عالیہ بھابھی بھی چند لمحے اسے دیکھتی رہیں۔ اس کی نظریں زمین میں گڑی تھیں۔ ایک لمحے کو ان کا دل چاہا ابھی اس کے پاس جا کر ندرت کے اس تکلیف دہ جملے کا ازالہ کریں۔ لیکن ندرت انہیں آواز دے رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اس سمت بڑھ گئیں۔ اس نے بھی اپنے من من وزنی قدم گھسیٹے اور اس گھر میں سب سے پہلے محسن اعظم بھائی کو کھانا دینے ان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں زینی کو آج ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔" عالیہ بھابھی کے دل میں شام والی بات کی شرمندگی رات تک موجود تھی۔ وہ کھانے کے بعد لڑکیوں کے کمرے میں آگئیں۔
"کیوں ایسا بھی کیا کہہ دیا میں نے۔" ندرت کا لہجہ سرسری تھا۔
"کیا سوچے گی زینی۔ یہ حیثیت ہے اس کی ہمارے گھر میں۔"
"تو اس سے بڑھ کے کچھ ہے کیا۔ ویسے بھی میرا مقصد اس کا دل دکھانا نہیں تھا۔ حالات اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ آج اسے کچھ ایسی حیثیت سے متعارف کروایا جائے کہ آج آنے والی خواتین بھول کر بھی اس کے بارے میں نہ سوچیں۔"
"ہم اسے دور پرے کی رشتہ داری بھی کہہ سکتے تھے۔ یتیم بچی ہے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔" ان کے دل سے ملال نکلا نہیں تھا۔
"اوہو امی! آپ بات نہیں سمجھتیں۔ اس طرح تو وہ لوگ فوراً" زینی کو پسند کر لیتیں بلکہ فوراً" رشتہ مانگ لیتیں۔ آپ ان کے دل میں بچی کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتی تھیں۔" اب کی بار بے بی باجی بول پڑیں۔ اور بچی پر خاصا چبا کر زور ڈالا۔
"نہیں خیر اب میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی۔"
"تو بس پھر میں نے جو ٹھیک لگا کیا۔ باقی کسر اس کے ماسیوں والے حلیے نے پوری کر دی۔" ندرت نے ہنس کے بے بی باجی کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ وہ غالباً" انہیں پوری بات بتا چکی تھی۔
عالیہ بھابھی گہری سانس بھر کے بنا کچھ کہے انہیں دیکھتی رہیں۔ جو کچھ بھی تھا۔ انہیں ندرت کی بات قطعاً پسند نہ آئی ہو۔ اور دل میں کہیں زینی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا موہوم سا احساس بھی ہو۔ لیکن وہ ندرت کی مصلحت پسندی سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ ندرت شکل صورت اور رنگت میں ذرا دبتی ہوئی تھی۔
یہی وجہ تھی کہ اس کے رشتے کے لیے انہیں بہت



تگ و دو کرنی پڑ رہی تھی۔ اب ایسے میں اگر ایک ایسی لڑکی کی وجہ سے اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکل جاتا۔ جس کو انہوں نے محض ترس کھا کے پاس رکھ لیا تھا۔ اور جس کی غیر موجودگی میں اس کی جگہ یقیناً" ایک کل وقتی ملازمہ پوری کرتی تو یہ کچھ ایسی خوش خیال بات نہیں تھی۔
"ٹھیک ہے وہ اس گھر کی ملازمہ نہیں لیکن ملازمہ سے بڑھ کے بھی اگر کچھ ہے تو وہ ہماری جگہ تو نہیں لے سکتی نا۔ برابری تو نہیں کر سکتی ہماری۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ بہت خوش فہم ہے۔ لیکن اسے ذرا حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔"
یہ وہی ندرت تھی جو جوانی کی سرحدوں کو چھونے سے پہلے اکثر اس سے دوستی کا دعوا کرتی تھی۔ اب اگر وہی دوست اسے اپنے راستے کا کانٹا لگ رہی تھی۔ تو اسے اس کی اوقات یاد دلا دینا ہی بہتر تھا۔ اور اس کے خیال میں اس نے ایسا کوئی برا کام یا زیادتی نہیں کی تھی۔

☆ ☆ ☆

چاند کی سترھویں تاریخ تھی۔ پھر بھی چھت پر ہر طرف چاندنی کی حکومت تھی۔ اس نے ایک قدم کے فاصلے پر رک کر اس کی پشت دیکھی۔
اسے یقیناً" اس کی موجودگی کا گمان گزرا تھا۔ جبھی وہ یکدم پلٹا۔
"ارے زینی! تم آج بھی اوپر سوؤ گی۔ سردی بڑھ رہی ہے۔" اس کا لہجہ سرسری سا تھا۔
"میں سونے نہیں آئی۔" اس کا بھرا ہوا گلا اور سنجیدہ انداز۔ وہ چونک گیا۔
"میں کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاؤں۔" ایک اور چونکانے والی بات۔
"کیوں نہیں ضرور۔" اس نے گہری سانس بھر کے کہا۔ وہ ایک قدم کا فاصلہ پاٹ کے اس کے برابر آ بیٹھی۔
چند لمحے خاموشی ان کے بیچ بیٹھی چہروں پہ لفظ لکھتی رہی۔ پھر اس نے زبان کو زحمت دی۔
"آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا اس دن۔"
"میں نے۔" اس کی آواز میں حیرت تھی۔ لیکن وہ خود غیر مرئی نقطے کو گھورتا رہا۔
"کب۔۔۔ اور کیا؟"
"یہی کہ مجھے اپنی عزت نفس کی کوئی پروا ہے نہ خیال۔" اس کا دل بھر آیا۔
"کیوں کیا ہوا؟" اب کی بار اس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ کانپتے لب' لرزتی پلکیں' چاندنی کا اجلا پن جیسے اس کے چہرے پر اتر آیا تھا۔
اس کے دل میں دھڑکن نے ایک دم ہی اپنا احساس دلایا تھا۔ اور وہ اس احساس کے بوجھ تلے اپنے دل کو بہلاتا رہ گیا۔ دل نے جو ایک نیا راستہ یکدم ہی پکڑا تھا۔ اور دھڑکنوں نے جو ایک نیا گیت گایا تھا۔ اس راستے میں کئی پتھر سہی اور گیت کے سر بہت مشکل سہی۔ لیکن نہ دل پھر راستہ بدلنے کو تیار ہوا نہ دھڑکن نے کوئی اور دھن چھیڑی۔
وہ دھیرے دھیرے بولتی۔ اسے اک اک بات بتاتی چلی گئی۔ بے بی باجی کا رویہ' شام والا واقعہ اور بھابھی کی چشم پوشی۔ دل دکھانے کے اسباب کوئی کم تو نہ تھے۔ وہ کہتا بھی کیا چپ چاپ سنے گیا۔ دل بہلانے کو کوئی خیال سجھائی نہ دیا۔ نہ تسلی کے لیے الفاظ نوک زبان سے آزاد ہو پائے۔ یہاں تک کہ وہ بات مکمل کر کے چپ ہو گئی۔ اس نے ایک گہری سانس بھری۔ پھر بولا۔
"مجھے ان لوگوں کے رویے پر بہت افسوس ہے۔ لیکن میں تم سے اس کے لیے ان لوگوں کی طرف سے معذرت نہیں کر سکتا اور اس کا تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہو گا۔"
"میں آپ سے معذرت کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی۔" وہ گھبرا سی گئی۔
"میں جانتا ہوں تم کہہ بھی نہیں سکتیں۔ نہ مجھ سے نہ یہ بات کرنے والی سے نہ ان سے جنہوں نے اس کی ایسی تربیت کی کہ اسے مناسب' غیر مناسب

اچھے اور برے کا خیال نہیں ہے اسے صرف موقع سے فائدہ اٹھانا آتا ہے بس۔" زینی نے چپ چاپ اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"تمہارے ساتھ فی الحال سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تم مجبور ہو۔ اور جب انسان مجبور ہوتا ہے تو بے بس ہوتا ہے۔ اور جب بے بس ہوتا ہے تو اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کو چپ چاپ سنے۔ برداشت کرے اور بھلائی کرنے والوں کو دعا دے۔"

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ تیزی سے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجبوری سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ اللہ ہر وقت اپنے بندے کے لیے کھلا رکھتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے اسے کھوجنے میں تمہیں کتنا وقت لگتا ہے۔"

جاتے جاتے اس نے ارحم کی آخری بات سنی اور سیڑھیاں پھلانگ گئی۔ چائے کا کپ لے کر اوپر کی طرف آئی ندرت کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے۔

☼ ☼ ☼

"امی! زینی کے کچھ زیادہ ہی پر نکل رہے ہیں آج کل۔"

ندرت نے عاصم کے سامنے عین اس وقت یہ بات چھیڑی۔ جب وہ آفس سے واپسی پر تازہ دم ہوکے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟؟" بات ہی ایسی تھی۔ نگہت، عاصم اور بھابھی سبھی چونک گئے۔

"روز رات میں بیٹھکیں لگتی ہیں ارحم کے ساتھ۔"

"نہیں!" عالیہ بھابھی کا منہ کھلا رہ گیا۔ بے بی کی حالت بھی دیدنی تھی۔

"کئی بار دیکھ چکی ہوں میں۔ پہلے تو چائے کا بہانہ تھا۔ اب بنا کسی بہانے کے ہی۔" وہ زہر خند ہوکے بول رہی تھی۔

"اور تم اب بتا رہی ہو۔ اتنے دن کی حرکت ملاحظہ کرنے کے بعد۔" بے بی تو جل ہی گئی۔

"پہلے میں نے اتنا غور نہیں کیا تھا۔ لیکن کل جب میں اوپر جانے لگی تو وہ تیزی سے وہاں سے نکل بھاگی۔"

وہ اس بات کو مکمل طور پر فراموش کرچکی تھی کہ ارحم کو متوجہ کرنے کی چند ایک کوششیں تو وہ خود بھی کرچکی ہے۔ ان ہی میں وہ چائے بھی شامل ہے جو وہ روز ارحم کے منع کرنے کے باوجود اسے دیتے جاتی ہے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر خود بھی پیتی ہے۔

یہ نگہت کا مشورہ تھا کہ ارحم کی ضروریات کا خیال وہ خود رکھے اور زینی کو زیادہ آگے پیچھے نہ ہونے دے۔

"پاگل ہو تم ندرت! ایسی بات کررہی ہو۔ زینی کی اتنی ہمت ہوسکتی ہے۔ بھلا۔"

عاصم کے بدلے ہوئے لہجے نے ماحول پر چھایا معنی خیز طلسم توڑ دیا۔ اس کی بے پروا آواز پر تینوں ہی جیسے کسی خواب سے جاگیں۔ عاصم خود بھی دل کی بے چینی کے ہاتھوں زور سے ہی بول پڑا تھا۔

"ارے آج کل کچھ بھروسہ نہیں نکلے نکلے لوگ اپنی اوقات دکھانے چل پڑتے ہیں۔ زمانہ کا چلن کیسا ہوتا جارہا ہے۔ پتا نہیں۔" نگہت کو یکدم معاملہ سنگین کا اور اک ہوا۔

"ندرت! مجھے نہیں لگتا اس بات میں کچھ حقیقت ہے۔" عاصم نے سب سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا بھابھی ٹکر ٹکر اولادوں کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے خود دیکھا ہے تب ہی یہ بات کہہ رہی ہوں۔" ندرت تنک گئی۔

"اور تمہیں اس قدر ہمدردی کیوں ہورہی ہے۔" نگہت بھی چڑ گئیں۔

"تم لوگ خوامخواہ اس بے چاری کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ ارحم کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ لکھ لو۔" وہ بات ختم کرکے کمرے میں چلا گیا۔

نگہت اور ندرت اسے دیکھتی رہیں۔ پھر اس کے جانے کے بعد عالیہ بھابھی کے سر ہو گئیں۔



"جتنی آپ نے اس کی باتیں۔ ابھی سے نکیل ڈال لیں۔ بے چاری لگ رہی ہیں میڈ!" نگہت تپ چکی تھیں ندرت چپ تھی۔ عاصم کی آخری بات دل کو لگی تھی۔ ارحم کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا مستقبل میں ارحم کو اس گھر کا داماد بنانے کا خواب صرف اعظم کا ہی نہیں عالیہ کا بھی تھا اور اس میں خود ندرت کی خواہش کا بھی دخل تھا۔

اگر وہ اسے اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھتی تو یہ کوئی ایسی انہونی نہیں تھی۔ اور نہ ہی زینی سے اس معاملے میں بدگمانی رکھنا ہی کوئی انوکھا عمل تھا۔

انوکھی بات تو یہ تھی کہ ارحم کی پسندیدگی کے کسی بھی خانے میں فٹ نہ ہونے کے باوجود اس بات کی سو فیصد امید رکھتی تھی کہ ارحم اسے ہی پسند کرے گا اور اس کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کی طرف کبھی دیکھے گا بھی نہیں۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ اتنا ہی وہ اس کی صاف گوئی سے خائف بھی رہتی تھی۔ اور اس راست گوئی سے بھی گھر بھر کی بے زاری کا علم ہونے کے باوجود اس کی پسندیدگی اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔ باوجود اس آگہی کے کہ ارحم نے اسے اپنی طرف سے بھی کسی پسندیدگی کا ہلکا سا اشارہ تک نہ دیا تھا بلکہ وہ تو اس بے ضرر سی کوشش پر بھی اپنی سرد مہری سے کئی بار پانی پھیر چکا تھا جو وہ ہر رات اسے چائے پلا کر متاثر کرنے کے لیے کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ اوھ کھلی کھڑکی سے آتے دھیرے دھیرے نم جھونکے جسم و جاں میں عجیب گدگدی سی مچا رہے تھے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کروٹیں لیں۔ پھر اٹھ بیٹھا۔ لاکھ سر جھٹکنے کے بعد بھی ندرت کی شام والی بات اس کے ذہن سے نکل نہیں سکی تھی۔

"کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ زینی اور ارحم؟"

"اور ارحم ــــــ" دل ہے کہ مانتا نہیں والی صورت تھی۔

"ہونہہ۔ پیچ۔" اس نے سر جھٹکا۔

ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ زینی اور ارحم کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ جوڑ تو خود اس کا اور زینی کا بھی نہ تھا۔ گھر میں اس کی موجودہ حیثیت کو دیکھا جاتا تو۔

پھر بھی وہ ایک شجر ممنوعہ کی چھاؤں تلے ستانے کی خواہش کر بیٹھا تھا۔ ایک ایسا خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

وہ اپنی بہنوں کا اکلوتا بھائی اور والدین کی واحد اولاد نرینہ۔ تھی امیدوں کا تنہا مرکز۔ عالیہ جتنی بھی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتیں۔ لیکن وہ جانتا تھا وہ کبھی اتنی اعلا ظرف نہیں ہوسکتی تھیں کہ ایک ایسی لڑکی کو اکلوتے بیٹے کے لیے پسند کرلیتیں۔ جسے انہوں نے خود ترس کھا کے اپنے گھر میں رکھا تھا۔

جس کی حیثیت ماضی میں نہ سہی لیکن اب آہستہ آہستہ گھر کی ملازمہ جیسی ہوتی جارہی تھی جس کے پاس نہ اعلا تعلیم تھی۔ نہ خاندانی حسب نسب۔ نہ اسٹیٹس اور نہ جہیز کی فراوانی کی امید۔ کیا تھا اس کے پاس۔ فقط ایک بے لوث دل ایک مضبوط کردار اور ایک من موہنی صورت ئی زمانہ تینوں ہی چیزوں کی کسی کو ضرورت نہیں تھی اور جن کو تھی شاید ان کی کوئی سنتا نہیں تھا۔ اس نے تھک کے اپنا سر تکیے پر گرادیا۔

یہ وہ خواب تھا جسے اس کی آنکھوں کی نیندیں اڑا کر' دل کا لوبی کر' زندگی کا سکھ چین کھا کے بھی خواب ہی رہنا تھا۔ کبھی حقیقت میں نہیں بدلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ جو اس دن عورتیں آئی تھیں بے بی کو دیکھنے۔ انہوں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔"

عالیہ بھابھی کے لہجے میں ایک بوجھل مایوسی تھی۔ اعظم بھائی کے چہرے پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئیں۔

"سمجھ نہیں آتا کہاں ہے اس کے نصیب کا جوڑ..." حد سے سوا اداسی میں مایوسی کا رنگ شامل تھا

دادی کے کمرے میں رات کے کھانے کے بعد کی محفل جمی تھی۔ عاصم دادی کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

"اور سے یہ زینب کم بخت۔" روانی میں ان کے منہ سے نکلا۔

"ہوں ہوں۔" اماں جی نے فوراً سے پہلے ٹوکا۔

"اب اس بے چاری کا کیا قصور۔" پوچھا تو اعظم بھائی نے تھا۔ لیکن وہ چونک کے عاصم کو دیکھنے لگیں۔

"ارے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں نے پوچھا ہے۔ آخر اس نے کیا کر دیا۔"

"ارے ہے۔ وہ کیا کرے گی۔ بس آنے والیوں کی آنکھوں میں وہی سما جاتی ہے اور کیا؟"

"ایک حل ہے میری نظر میں۔ پر تمہارے لیے شاید قابل قبول نہ ہو۔" دادی گھر کے کسی معاملے میں مداخلت تو دور؟ اپنی رائے دینے میں بھی احتیاط کرتی تھیں۔

"وہ کیا اماں جی۔"

"سوچ لو تمہیں میری بات ناگوار نہ گزرے۔" عالیہ بھابھی کو گویا ہو گئیں۔

"نہیں نہیں۔ ہمارے لیے آپ کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اماں جی۔ آپ کہیں نا۔" اعظم بھائی نے جذبات کا اظہار کے طور پر ان کے پیر دبائے۔

"تو بس پھر اس مصیبت کو اپنے لیے راحت بناؤ۔ اسے عاصم سے بیاہ دو اور کیا۔" اماں جی نے پٹاخہ چھوڑا۔ عاصم اچھل کے رہ گیا۔ باقی افراد کو سانپ سونگھ چکا تھا۔

"اماں جی مگر۔" اعظم بھائی نے تھوک نگل کے بھابھی کو دیکھا۔ حسب توقع وہ کھا جانے والی نظروں سے انہیں گھور رہی تھیں۔ سالوں بعد دکھایا جانے والا "تابعداری" کا عملی مظاہرہ یوں گلے میں اٹکے گا انہیں کیا خبر تھی۔

"دیکھو بھو! بات تو تمہیں بھی کوئی اچھی نہیں۔ پر تم سوچو تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ بلکہ الٹا تمہارا فائدہ ہی ہے۔" اماں جی اب کے آگے ہو کر راز داری سے بولیں۔

"تمہارے خاندان برادری میں واہ واہ ہو جائے گی۔" وہ جانتی تھیں۔ انہیں اپنی بہو کو کس ہتھکنڈے سے زیر کرنا ہے۔

"ہاں۔ آں۔ آں اور کیا تمہاری بیٹیوں کے راستے کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔" اعظم بھائی نے ہمت کی۔

"آنے والوں کے آگے اپنی بڑائی کے گن گانا کہ جیسی میں اعلا ظرف ویسی ہی بڑے دل کی میری بیٹیاں۔" دادی تابوت میں بڑے نشانے پر کیلیں ٹھونک رہی تھیں۔ عالیہ بھابھی منہ کھولے کبھی دادی کو دیکھتیں تو کبھی اپنے خاوند کو۔ عاصم کی طرف کسی کا دھیان ابھی تک نہیں گیا تھا۔ ورنہ اس کے دل کا راز پہلی فرصت میں عیاں ہو جاتا۔ جو صدقے جانے والی نظروں سے دادی کو دیکھ رہا تھا۔

"بے زبان گائے کی طرح خدمت کرے گی۔" دادی کی بات غلط نہیں تھی۔

"اور پھر باہر سے آنے والی اپنے ساتھ جہیز اور ڈگریاں لائے گی۔ تو کیا الگ گھر بھی لائے۔ اور تمہاری ایک نہ سنے۔" اعظم بھائی نے ہولناک نقشہ کھینچا۔

"کیا خبر آنے والی تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کو کروائے ہی نہ۔ تمہارا بیٹا ہی تم سے چھین لے گی تو جہیز کیا چاٹو گی بیٹھ کے اور وہ کون سا تمہارے جانے کے لیے چھوڑے گی۔"

اماں جی پیچھے ٹیک لگا کے فرصت سے بیٹھیں اور بڑی تولتی نظر سے بھابھی کے تاثرات دیکھے۔ بھابھی نے تھوک نگل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"اماں جی خاندان کوئی آگا پیچھا۔" وہ تقریباً چت ہو چکی تھیں۔

"لو یہ تو تمہارے اپنے خاندان کی ہے۔ اس سے اچھا کوئی خاندان ہو گا کیا۔" اعظم بھائی ترت بولے۔

"اے بھٹ پڑے وہ سونا۔ جس سے ٹوٹیں کان۔ سب کے لیے ہو ہو گی۔ لیکن تمہاری تو ساری زندگی بے دام خدمت کرے گی۔ سر نہیں اٹھا سکے گی تمہارے احسان کے سامنے ہاں۔"



تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا چکی تھی۔ بھابھی عالیہ کا چہرہ طرح طرح کے رنگ بدلنے کے بعد اب پھیکا پڑ چکا تھا۔

"لیکن عاصم سے تو پوچھا ہی نہیں۔" دل سے قائل ہونے کے باوجود وہ اپنی پسپائی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"میں آپ کی اور اپنی بہنوں کے بہتر مستقبل کی خاطر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں امی۔"

عاصم نے لہجے کو حتی المقدور غمزدہ اور سنجیدہ بنا لیا۔ ان کی نظروں میں تحسین اور ندامت کے چہرے گھومنے لگے چیختے چلاتے شور مچاتے۔

"لڑکیوں کی تم فکر نہ کرو انہیں میں سمجھا دوں گی۔"

انہیں زندگی میں پہلی بار اپنے اور اعظم کے بیچ ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوئی تھی۔ بمشکل کھینچ کھانچ کے وہ ایک رضامند اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر لانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔

☼ ☼ ☼
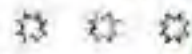
"فی الحال سادگی سے نکاح کریں گے۔ تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ یہ ہی ہمارے گھر کی بہو ہے۔" وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی مستقبل کا فیصلہ سن رہی تھی۔

اس نے کب سوچا تھا زندگی میں کبھی ایسا موڑ بھی آئے گا۔ اس کے خیال میں تو جیسی چل رہی تھی۔ سدا ویسی ہی رہنی تھی۔ لیکن اس سیدھے سادے راستے پر اس کے لیے کتنے موڑ اور گڑھے لکھے تھے اسے کیا خبر تھی۔ یہ تو ایک فطری سا جذبہ تھا۔

عاصم کی نیک فطرت و اطوار اور نرم لب و لہجہ اس کی کمزوری بن گیا اور اس کی حسین موہنی صورت عاصم کی نگاہوں میں آن بسی۔ یہ ہوا کب تھا۔ اس بارے میں تو دونوں ہی لاعلم تھے۔ آپس میں نہ کوئی عہد تھا' نہ پیماں۔ تنہائی میں کبھی دونوں نے میل ملاقات کی کوششیں نہیں کیں۔ نہ جسارت' نہ جرات' نہ گستاخی۔ اسے کمال اطمینان عاصم کی شرافت کی طرف سے حاصل تھا۔ حالانکہ اسے پا لینے کا یقین نہ تھا۔ لیکن کھو دینے کی کسک کے ساتھ اور اسی کے لوٹ آنے سے ہی جگنو کا بھی یا گیا تھا۔

جس میں کچھ اکا دکا تعریفی فقروں کے سوا' دونوں ہی کے دامن میں کوئی کھٹی میٹھی یادیں نہ تھیں' نہ تنہائیوں کی ملاقاتوں کی ——— سنسنی' نہ سیل فون پر رنگ برنگے پیار لٹاتے پیغامات کی جھلمل' نہ جذبات کے اظہار کی سہولت۔ بس ایک خاموش معاہدہ محبت تھا۔ جو کس دن طے پایا تھا دونوں اس بات سے بھی لاعلم تھے اور کب تک سلامت رہنا تھا' یہ بھی پتا نہ تھا۔

عاصم کے دل میں اگر اسے پا لینے کی کوئی خواہش' کوئی جستجو تھی بھی تو کم سے کم زینب ایسا نہیں سوچتی تھی' وہ جانتی تھی اس گھر کے لوگ اس کے محسن تھے' اور ان کے بہت احسانات تھے اس پر۔ وہ ان ہی کا بوجھ ڈھونے سے قاصر تھی۔ اس کے نزدیک عاصم کی محبت پا لینا ہی کافی تھا۔ چاہے وہ محبت کتنی ہی خاموش کیوں نہ ہوتی۔

اس کی ہم سفری کی تمنا تو استطاعت سے بڑھ کے اوقات سے آگے کی کوئی چیز تھی۔

اور اب یہ تمنا پوری ہونے جا بھی رہی تھی تو کس قدر سپاٹ انداز میں۔ نہ آنکھوں میں سپنے تھے' نہ سانسوں میں ہلچل' نہ خیتوں میں جل تھل۔

دل کی کیفیت عجیب سی تھی' خالی خالی' ایک سونا پن بول رہا تھا۔ نہ کوئی امید تھی' نہ آرزو کے دیے' نہ خواہشوں کے جگنو۔ اس نے اس حکم کی تعمیل بھی ویسے ہی کی' جیسے دن بھر دوسرے کاموں کے لیے "کھانا پکاؤ' کپڑے دھو دو' برتن پڑے ہیں' گھر گندہ ہو رہا ہے' کپڑے پریس کر دو۔ ویسے ہی۔ "شادی کر لو' ہم نے تمہارے لیے ہم سفر ڈھونڈ لیا ہے۔"

پہلے بھی صرف "جی اچھا" سے کام چل جاتا تھا۔ اس وقت اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ صرف سر جھکا دینا ہی کافی تھا کہ مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں' دادی کے کمرے میں صرف تحسین نہیں تھیں' یہ نیا فیصلہ قبول کرنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔

کل تک جس لڑکی کو ذرا برابر اہمیت نہیں دی تھی۔ آج وہ ایک اہم رشتے پر فائز ہوتے جا رہی تھی۔ اس کی نام نہاد رشتے داری ایک گہرے حوالے میں بدلنے جا رہی تھی، وہ ان کے اکلوتے بھائی کی ہونے والی بیوی تھی، یعنی بھاوج۔ وہ جتنا سوچتیں اتنا ہی جل بھن جاتیں۔ پر سوائے پیر پٹخنے کے کچھ کر نہیں پاتیں۔ یہاں ایک دل اور تھا جس کے لیے یہ خبر بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ اس نے سن کر سر جھکا لیا اور کہتا بھی تو کیا؟ نہ کوئی یقین دہانی تھی، نہ کوئی وعدہ، کوئی اشارہ تک نہ تھا، نہ اس طرف، نہ اس طرف، اور اس طرف تو پتا نہیں ایک موہوم سی پسندیدگی بھی تھی کہ نہیں، جو کچھ تھا یکطرفہ تھا۔ وہ کسی چیز کے بارے میں پریقین نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ بہت خوش شکل ہی سہی، لیکن جانے انجانے میں ایک معصوم دل کے ساتھ ایک اور زیادتی ہونے جا رہی تھی، وہ صرف تماشائی تھا۔ اسے تالیاں بجانی تھیں، ہنسنا تھا، مٹھائی کھانی تھی اور بس۔

اور اس وقت دادی کے کمرے میں ایک کونے میں بیٹھا وہ یہی کر رہا تھا۔

اک درد کو کھویا ہے تو احساس ہوا ہے
دل پا کے وہ بے چینی بہت چین سے تھا

نکاح کی تقریب بہت سادگی سے عمل میں آئی۔

اس کا دل تب بھی بے یقینی اور خاموشی کی کیفیت کے بیچ ڈانواڈول ہی رہا۔ خوشی کا احساس انتہائی دبا دبا اور مدھم سا تھا جتنی اس کی سانسیں۔ ارحم کے گھر والے اسلام آباد سے آئے تھے۔ صرف وہی مہمانان گرامی تھے۔ جو گھر کے افراد کے علاوہ اس نکاح میں مدعو کیے گئے تھے۔

"ایسے بڑے ظرف والی سو ہے میری۔ یتیم بچی کے سر پہ ہاتھ رکھا، تو بس اسے اپنا ہی بنا لیا۔ اپنے گھر کی عزت بنا لیا اس نے تو۔"

دادی اپنا تیار کردہ منصوبہ کامیاب کرنے کے لیے اپنے ہی پروپیگنڈے پر زور و شور سے عمل پیرا تھیں۔ ایجاب و قبول کے مراحل طے ہونے کے بعد دعاؤں کا ایک مختصر سا سلسلہ تھا، جلد ہی اختتام پذیر ہوا،

سب سے پہلے دادی نے ہی اسے گلے سے لگایا۔

اس مہربان آغوش کی حدت ہی اور تھی، الگ ہی خوشبو تھی، اور گرمجوشی کا بڑا جدا سا احساس اس کی رگ جاں میں ذرا ذرا سکون اتر گیا۔

نگہت عرف بے بی باجی طوعاً و کرہاً ذرا دیر ہی وہاں بیٹھیں۔ پھر اپنے کمرے میں جا گھسیں۔ اسلام آباد سے آئی ارحم کی والدہ اور بہن نے اسے کریم اور نفیس چکن کا سوٹ دیا۔

نکاح کا ٹکے سے کام کا جوڑا بمعہ نقلی زیورات بھابھی خود پسند کر کے لائی تھیں۔ بقول ندرت۔

"لے ان باتوں کا سینس کب ہے امی! کیا کلر فیشن میں ہے، کیا اسٹائل، کون سا کام؟"

اس نے چنداں اعتراض نہ کیا۔ جو بھی لائیں ٹھنڈے دل سے پہن لیا، اور شکر تھا کہ ان کے دل میں ابھی اتنا خوف خدا تھا کہ وہ اس کے لیے ڈھنگ کی چیزیں ہی لائی تھیں۔ خدا کی عطا کردہ صورت تھی کہ جو کچھ بھی اوڑھ پہن لیتی، سج جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ عاصم کے ساتھ ساتھ کسی اور کے دل کی مکین بنی بیٹھی تھی۔ بہت چپکے سے وہ ہار مان کے اس کے برابر آن بیٹھا۔

"یہ میری طرف سے آپ کے لیے۔"

خوب صورت سفید نگینوں سے چمکتا بریسلیٹ، ڈبے سے نکل کے اس کی گلابی پوروں میں جگمگایا، پھر عاصم کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔

"پہنا دو۔" اس نے بہت ناز سے فرمائش کی تھی۔ جی چاہتا تھا فوراً "اس کی کلائی کی زینت بنا دے۔" عاصم اس کی کلائی تھام کے پہنانے لگا۔

کیمرے کی فلش لائٹ چمکی اور ایک خوب صورت منظر ہمیشہ کے لیے یادوں کے خانے میں قید ہو گیا۔

دائیں طرف عاصم، بائیں طرف ارحم اور درمیان میں دونوں کے دل کی مکین سر جھکا کے بیٹھی وہ۔

☆ ☆ ☆

"زیبی بھائی کے کپڑے پریس کر دیے۔"



"زیبی! میرا یونیفارم۔"

"زیبی۔ مجھے پہلے ناشتا دے دو، جلدی جانا ہے۔"

دوسرے دن صبح سے روزمرہ معمولات اپنی ڈگر پہ آ گئے، وہی گھر والے تھے اور وہی اس کی مصروفیات۔

پچھلی رات یادوں اور سوچوں کے سمندر میں پہروں ڈوبنے ابھرنے کے بعد بھی دل کسی فیصلے، کسی موڑ تک پہنچنے میں ناکام ہی رہا۔ عاصم اس کے دل کی خوشی تھا۔ یہ سچائی اپنی جگہ، لیکن جانے کیوں، ایک باقاعدہ رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد بھی وہ ایسے خوش نہیں ہو پائی تھی، جیسے حقیقتاً ہونا چاہیے تھا۔ شاید سب کچھ بے حد غیر متوقع، اچانک اور ناقابل یقین تھا یا شاید ایک خوشی کے گرد مستقبل کے اندھیروں اور وسوسوں کا اتنا گہرا حصار تھا کہ اس کا وجود مدھم پڑ گیا تھا۔ سنجیدہ یا سپاٹ تاثرات کے ساتھ صبح سے رات تک کام، کام اور بس کام۔

ہاں جو ایک ذرا سا بدلاؤ آیا تھا تو صرف عاصم کے رویے میں، جو حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔ اس کی باتوں، لہجے، انداز اور گرفت میں استحقاق در آیا تھا۔ محبت بھرا استحقاق، اس کی بدلتی ہوئی نظریں کیا کچھ کہہ جاتی تھیں، مسکراتے لب اور کبھی کبھار کوئی معنی خیز جملہ، وہ کبھی مسکرا دیتی اور زیادہ تر گھبرا جاتی۔

اسے اس لب و لہجے کی، استحقاق کی عادت تھی ہی کہاں، اور کچھ دن پہلے تک تو وہ یہ عادت ڈالنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر عادت بدلتے بدلتے ہی جاتی ہے اور پڑتے پڑتے پڑ ہی جاتی ہے۔

وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح ناشتے کی ٹرے لے کر اس کے کمرے میں جاتی تھی۔ لیکن دل کی کیفیت عجیب ہوتی تھی۔ کبھی وہ ٹرے تھامتے ہوئے اس کے ہاتھ چھو لیتا۔ کبھی وہ ٹرے میز پر رکھ کے پلٹتی تو اسے اپنے عقب میں پاتی، ایک، دو بار اتنے نزدیک کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اگر عاصم خود ہی تھام نہ لیتا تو یقیناً اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف سیدھے ناشتے میں ہی جاتے اور کمرے کی معنی خیز خاموشی میں تلاطم بپا ہو جاتا۔ دوسرے دن سے اس نے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔

گستاخیاں یہیں تک رہتیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن ان دونوں کے بیچ جو رشتہ معرض وجود میں آ چکا تھا، وہ اسے اس حد سے بڑھا بھی سکتا تھا اور زیبی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے منع کرے یا اس کی ناراضی مول لے، یا کسی بھی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے گھر والوں کی نظروں میں آ جائے۔

ابھی تو صبح ندرت اور نگہت دونوں ہی عاصم سے پہلے گھر سے نکل جاتی تھیں۔ بعد میں کچھ بعید نہ تھا کہ باقاعدہ پہرے داری شروع کر دیتیں۔ یا بے جا قسم کی پابندیاں لگا کے اسے اس کی نظروں میں شرمسار کرتیں۔

اسے معلوم تھا وہ دونوں ہی بہنیں اس رشتے کے خلاف تھیں اور وہ کسی بھی قسم کی بے احتیاطی دکھا کر کھلم کھلا اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ سو بہتر یہی تھا کہ عاصم سے جتنا ہو سکے دور رہا جائے۔

عالیہ بھابھی اس کا گریز سمجھتی تھیں، سو بنا کسی اعتراض کے اس کے لیے رات کا کھانا اور ناشتا خود سے لے کے جانے لگیں، اور وہ بھی باخوشی۔ اس کے کپڑے کمرے سے اٹھا کے استری کے لیے اسے لا تھماتیں۔

"تم میرے کمرے میں کیوں نہیں آتیں زیبی۔" کافی دن یہ حرکتیں ملاحظہ کرنے کے بعد ایک دن کچن میں اس نے زیبی کو جا پکڑا۔

"ایسے ہی۔" اس کے پاس جواب نہ تھا، بس گھبراہٹ تھی۔

"کیا تمہیں میری کوئی بات، کوئی حرکت بری لگی ہے تو بتاؤ مجھے۔" وہ اس وقت زیبی کے بالکل پاس ہی کھڑا تھا، جب پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی۔

"اوہ! ارحم، میں زیبی سے چائے کا کہنے آیا تھا۔" اس نے پلٹ کے دیکھا اور بے وجہ وضاحت دی۔

"میرا بھی چائے کا موڈ ہے، اگر زیبی بنا دے تو۔" وہ دروازے میں ہی رک کے اسے دیکھنے لگا۔

"میں ابھی پوچھتی ہوں۔" وہ اٹک اٹک کے بولی۔
"میرے کمرے میں لا دینا۔" عاصم کی جتاتی ہوئی آواز میں واضح اشارہ تھا۔ ارحم وہیں بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگا۔

"یہ سب کہاں ہیں؟" اس نے بھابھی اور لڑکیوں کا پوچھا۔

"کسی کے گھر گئے ہیں ملنے۔" اس نے کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ذرا کی ذرا اسے دیکھا اور پلکیں جھکالیں۔ یہ ادا! اور یہ حیا! یہ ہی لوٹ کر لے گئی تھی اس کا دل اور ایمان۔ اس نے سر جھٹک کر کپ تھاما۔ (اب وہ کسی کی امانت تھی) اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"عاصم کی چائے اس کے کمرے میں دے آؤ۔ اور سن لو جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ اس گھر میں اب اس کا ہی حق ہے سب سے زیادہ تم پر۔"

وہ نظریں اٹھا کے اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہاں تک کہ وہ چلا گیا اور عاصم نے کمرے سے اسے آواز دے ڈالی۔ اس نے دھیرے سے دستک دے کر دروازہ وا کیا اور چائے رائٹنگ ٹیبل پر رکھی۔ عاصم دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ زینی! میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"مجھے معلوم ہے آپ مجھے نہیں کھا سکتے کیا کہنا ہے، جلدی سے کہیے۔" کمرے کی خاموش فضا میں پلکیں جھکائے تابعداری سے کھڑی وہ عاصم کو بے حد اچھی لگی۔ پھر کچھ اس کے ہمیشہ دبائے رکھے گئے جذبے اور کچھ اپنے رشتے سے حاصل شدہ حقوق اور امنگ۔ اس نے پاس جا کے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ زینی کے روم روم میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"کچھ نہیں کہنا مجھے زینی بس! مجھ سے یوں کتراتی ہوئی کیوں رہتی ہو۔ میں پاس آتا ہوں تم دور چلی جاتی ہو، ایسا کیوں کرتی ہو کیا مجھ سے ڈرنے لگی ہو۔" اس نے ایک ہاتھ سے اس کی تھوڑی اٹھائی۔

زینی اس کی قربت کی حدت سے پگھلنے لگی، تنہائی، قربت اور اس کی لو دیتی نظریں۔

"تم تو جانتی ہو نا میں۔ میں تم سے کیا کہوں، زینی بس اتنا جان لو کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ بہت پہلے سے تو نہیں، لیکن یہ احساس کچھ نیا بھی نہیں اور پھر یہ جو رشتہ بن گیا ہے، تمہارا شاید اس کا اثر ہے کہ میں..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر دور ہو گئی تھی۔ اس کا تنفس تیز تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے تعجب سے دیکھا۔

"کچھ نہیں بس مجھے جانے دیں۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"میری بات تو سن لو پوری۔" وہ اس کے راستے میں آیا۔

"مجھے نہیں سننا کوئی آجائے گا۔" اسے گھبراہٹ سے پسینے آنے لگے تھے۔

"کوئی نہیں آئے گا زینی۔ کوئی نہیں ہے گھر میں۔" یہ تنہائی کا احساس ہی تھا۔ جس نے اس کی روح فنا کر دی تھی۔ اور یہ تنہائی کا احساس ہی تھا جس کی دلفریبی سے مغلوب ہو کر عاصم نے اسے تھاما اور اس کے بازو اس کی کمر میں حمائل ہو گئے۔

"پلیز۔" پھر وہ اس کی گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔

"خدا کے لیے۔" اب کے اس کی آواز ہلکی چیخ سے مشابہ تھی۔ عاصم نے ناسمجھی کے سے انداز میں اسے چھوڑ دیا، وہ دور ہٹ کے رو پڑی۔

"کیوں بھرے گھر میں میرا تماشا لگوانا چاہتے ہیں آپ۔" قربت کے ان لمحات کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ان کی لطافت کو محسوس کرنا تو بہت دور کی بات تھی، بے پناہ خوف کا احساس، حیا اور شرم پہ بھی غالب آگیا تھا۔

"میں تمہارا تماشا کیوں لگواؤں گا۔"
"تو پھر یہ سب کیا ہے؟"
"یہ میرا حق ہے۔"

"حق ہے تو سب کے سامنے مانگیں نا، سب سے چوری چھپے کمرے میں بلا کر، مجھے اچھا نہیں لگتا یہ سب۔" وہ چند لمحے سسکتی رہی۔ اس سے بات کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ عاصم دکھ اور حیرت سے گنگ اسے تک رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کسی غلط ارادے سے نہیں بلایا تھا، میں تو صرف۔" اس نے کہنا چاہا، لیکن زینی نے اس کی بات نہیں سنی۔

"کیا چاہتے ہیں آپ، آپ کی ماں اور بہنیں میرے کردار پر کیچڑ اچھالیں، بہت اچھا لگے گا آپ کو یہی چاہتے ہیں آپ۔" وہ روتے ہوئے مشکل بات کر پا رہی تھی۔

"نہیں باخدا نہیں، زینی میں تو بہت سچے اور صاف دل سے، نیک نیتی سے تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں، تمہارے دل میں اپنی محبت سے گھر کرنا چاہتا ہوں، صرف تمہاری تھوڑی سی توجہ، محبت اور... اور بس۔"

"تو ٹھیک ہے رخصتی کا انتظار کریں پھر مگر۔" اس نے انگلی اٹھائی۔

"اس سے پہلے۔ آپ مجھے آئندہ کبھی بھی اپنے کمرے میں بلائیں گے، نہ اپنے رشتے سے حاصل شدہ حقوق کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔" بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی، عاصم نے اپنی آنکھوں میں معمولی سی نمی محسوس کی اور ادھ کھلے دروازے کو تا دیر وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔

دور صحن کے کونے میں بنی سیڑھیوں کے پاس، وہ موتیے کے پھولوں کی نرمی اپنی گلابی پوروں پر اتار رہا تھا، جب اس نے چونک کر بہت دھیان سے زینی کو تیزی سے پاس سے گزر کے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور رخسار نم۔

سرمئی شام کے ملگجے جھٹپٹے دھندلکے میں کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے اس پار ایک وجود تھا اور اس پار بھی ایک وجود تھا۔ دونوں کے سینے میں دل تھا، دل میں پچھتاوا تھا۔ اس طرف اپنی بات کے کھو جانے کا پچھتاوا، دوسری طرف اپنی بات کے مان لیے جانے کا پچھتاوا۔

اس نے سوچا میں نے کیوں زینی سے کہا کہ عاصم کی بات سن لو مجھے کیوں کہنا پڑا، وہ خود ہی سوچ لیتی۔
اور ان دلوں میں کچھ اور بھی تھا، زینب کے لیے
شاید۔
محبت!

☆ ☆ ☆

"کیا بکواس کر رہے ہو، ہوش میں تو ہو۔" اسے اسی رد عمل کی توقع تھی اس لیے سکون سے بیٹھا رہا۔
"بکواس کیسی، ایک نہ ایک دن تو یہ کام ہونا ہی ہے، تو پھر ابھی کیوں نہیں۔"
"ارے! تمہارا دماغ ٹھکانے پہ ہے یا نہیں۔" اب کے وہ زور سے چیخیں۔
"بہنیں بن بیاہی بیٹھی ہیں اور انہیں رنگ رلیاں سوجھ رہی ہیں۔" انہوں نے طیش میں اپنے میاں کو دیکھا، جو سکون سے بیٹے کا اٹل لہجہ جانچ رہے تھے۔
"امی کینیڈا کے ویزے کے لیے اپلائی کر چکا ہوں، آپ کو پتا ہے نا ویزا آگیا تو جانا ہی پڑے گا۔"
"ہاں تو۔" تجاہل عارفانہ کا عالم سوا تھا۔
"تو میں اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"
"کیا بکواس کیے جا رہا ہے، رٹو طوطے کی طرح، اعظم دیکھیں اسے۔" اب کی بار خاوند سے زبانی مدد مانگی۔
"اس میں بکواس کیا ہے امی، میں پھر پوچھتا ہوں، ایک لڑکی سے شادی کرنے کی نیت سے آپ نے میرا نکاح کیا تھا نا، اب میں کہہ رہا ہوں رخصتی کر دیں تو کیا اعتراض ہے آپ کو۔"
"کیا اعتراض کے بچے بھول گیا، کس لیے میں نے تیرا نکاح کیا تھا اس کے ساتھ، یہ پتھر سا کلیجہ کر کے میں نے صبر کا گھونٹ پیا کہ چلو میری بیٹیوں کے بھی گھر بسیں اور لوگ اس پر سے نظریں ہٹا کے ان کو دیکھیں، مگر یہاں تو چال ہی الٹی ہو گئی بھیا، بہنیں کنواری بیٹھی ہیں اور اسے ہری ہری سوجھنے لگی۔" انہوں نے زیر لب زینی کو دو گالیوں سے نوازا۔ اعظم صاحب کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی تھی۔

"اسے کچھ مت کہیں' ہم نے کچھ نہیں کیا۔ امی یہ میں کہہ رہا ہوں' میں آپ سے۔" وہ بے طرح آگیا اور وہ تو بلبلا ہی گئیں۔

"ارے یہ میں کیا سن رہی ہوں' نگہت' ندرت کہاں ہو تم لوگ' سنتی ہو' کیا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے اس حرافہ کا۔"

عاصم کے منہ سے نکلے اس کی طرف داری کے دو جملے انہیں سر سے پیر تک آگ لگا گئے تھے۔ یہ وہ ہی بھابھی تھیں جو کبھی غصے میں بھی اسے سخت سست کہنے سے پرہیز کرتی تھیں۔ آج ان کے منہ سے مغلظات ابل پڑے۔

لمحوں میں سارا گھر وہیں اکٹھا ہو گیا۔ اسی پبلک رش میں کہیں وہ خود بھی تھی۔ جو سب سے زیادہ مجرم بھی تھی۔ سب سے زیادہ بے قصور بھی اور قصوروار بھی۔

"للہ کے لیے امی! بس کریں' ختم کریں یہ واویلا' شور شرابا' ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کے رکھ دیا۔" عاصم تنک کے اٹھا اور غصے میں بلکتا جھلکتا کمرے میں بند ہو گیا' پیچھے وہ رہ گئی۔۔۔ اس کے غائب ہوتے ہی تمام چہرے خود بخود زینی کی طرف گھوم گئے۔ قہر برساتی' گھورتی نگاہیں' ناراض چہرے' بظاہر خاموش' فضا میں خاموشی اور سناٹے نے یک دم ہی تل کھلایا تھا۔ بت کی مانند ساکت اعظم بھائی کے وجود میں حرکت ہوئی' وہ اس کے پاس آکے رک گئے۔

"فکر مت کرو بیٹا' تمہاری خواہش ہم جلدی پوری کردیں گے۔" وہ کچھ کہنے نہ کہنے کی بندشوں میں جکڑی' منہ کھولے انہیں دیکھتی رہ گئی' وہ رکے بغیر تھکے تھکے قدموں سے گھر سے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اور رات کے ساتھ ساتھ بڑھتی ٹھنڈک۔

لیکن آج اسے اس ٹھنڈک کا کوئی احساس نہ تھا۔ نہ کمرے کے اندھیرے کا' نہ تنہائی کا۔ صرف ایک احساس ذلت ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔

"تو کیا صرف اس لیے میرا نکاح کروایا عاصم سے۔" سوچ نیزے کی انی کی طرح دل میں سوراخ کیے دے رہی تھی۔

"تاکہ میں ان کی بیٹیوں کے رشتے کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکوں۔" ایک سسکی لبوں پہ دم توڑ گئی۔

"صرف یہ مقصد تھا میرے نکاح کا' اور میں سمجھتی تھی' مجھے عزت دینے کے لیے' اپنانے کے لیے' اچھے خاندان کا حصہ بنانے کے لیے' اُف میرے خدا۔"

آنسو مچل مچل کے پلکوں کی دہلیز پھلانگتے رہے اور وہ بے بسی کی تصویر بنی رب کے حضور اپنی قسمت کے اس بھونڈے مذاق پر شکوہ کناں رہی۔

"کیوں مجھے ماں' باپ نہیں ملے' سب کو تو مل جاتے ہیں' پہلے ماں چھین لی' پھر باپ' پھر گھر۔" آج اسے اپنا گھر بہت بری طرح یاد آیا تھا' جہاں وہ روز پٹتی تھی' گالیاں کھاتی تھی' لیکن اتنی تکلیف وہاں کبھی محسوس نہیں کی' جتنی آج یہاں اعظم بھائی کے سامنے۔۔۔ "اور اعظم بھائی آپ بھی۔۔۔ آپ بھی آگئے سب کی باتوں میں۔ کیا میں اتنی ہوس پرست لگتی ہوں آپ کو' اتنے سالوں میں بس اتنا ہی جان پائے آپ مجھے۔ کیوں' کیوں بدگمان ہو گئے' کیوں وضاحت نہیں مانگی' اپنے بیٹے کی بات پر یقین کر لیا' مجھے بھی تو اولاد بنا کر لائے تھے' پھر وہ محبت کے دعوے کیا ہوئے' وہ اعتبار اور مان جو اس گھر سے مجھے ملا' سب میری عزت کی دھجیوں کے ساتھ ہی ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گیا۔"

گرم گرم آنسو اس کے یخ بستہ ہاتھوں پر گرتے رہے۔

کمرے کی ٹھنڈک کو گرمائش میں بدلتے' بے وقعت موتیوں کی طرح پلکوں سے ٹوٹ کر ٹھنڈے بستر میں جذب ہوتے رہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جانتا تھا' وہ جاگ رہی ہوگی۔ مگر آج سے پہلے کبھی اس نے بے وجہ اسے مخاطب نہیں کیا تھا تو آج کیسے۔

شام کو آفس سے واپسی پر گھر میں پیش آنے والا واقعہ' اس کی آمد تک ٹھنڈا ہو چکا تھا' مگر اثرات باقی تھے' تب لب لباب دادی سے پتا چل گیا۔

دادی کو نم آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر بے ساختہ ایک شکوہ کناں نظر ان پر ڈالی تھی۔

وہ سمجھتا تھا دادی اس کے حال دل سے واقف ہیں۔ اس کی بدلتی نظریں پہچانتی ہیں' مگر بعد میں انہوں نے خود ہی تجزیہ بتایا تھا کہ عاصم سے نکاح کے لیے عالیہ چچی کو راضی کرنے میں زیادہ ہاتھ ان ہی کا تھا اور اب یہ پچھتاوے کے آنسو بے قیمت ———— ہی تھے۔ مشورہ ان ہی کا تھا اور اعتراف بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ ارحم کے سامنے' مگر بہت جلدی کہ یہ فیصلہ انہیں اب ٹھیک نہیں لگ رہا۔

ارحم نے اب کی بار ان کی بات کا اعتبار کرنے میں ذرا احتیاط ہی برتی تھی۔ یوں بھی ان بے چاری کا کیا قصور تھا' اپنی طرف سے تو انہوں نے زینی کا بھلا ہی چاہا تھا۔ اسے ہر وقت گھر میں رہتے مس فٹ ہونے کا احساس تنگ کرتا تھا۔ شام کے بعد سے یہ احساس اور شدت اختیار کر گیا' اسے لگا اس سارے قصے کے پیچھے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ہاتھ خود اس کا اپنا بھی تھا۔ اسی نے کہا تھا' جا کے عاصم کی بات سن لو اور چند ہی منٹوں کے فرق سے وہ پچھتایا بھی تھا۔

عاصم نے زینی سے کیا کہا تھا۔ وہ لاعلم تھا' زینی نے کیا جواب دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا' اسے پتا تھا تو صرف یہ کہ اس شام ان دونوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی تھی۔

زینی نے اس سے کوئی شکوہ گلہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی انصاف پسند طبیعت ہی اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

"زینی میری بات مان کر عاصم کے پاس گئی۔ اور پھر عاصم نے چچی سے یہ سب کہا' کیوں؟"

کڑیوں سے کڑیاں ملانا اتنا ہی مشکل تھا' جتنا کسی الجھی ریشم کو سلجھانا اور وہ بھی ایک ایسے معاملے میں جس میں وہ از خود انوالو ہوا تھا۔ ورنہ تو کسی کو گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس کی اور زینی کی کوئی بات بھی ہوئی ہوگی۔

ایک گہری سانس بھر کے اس نے دور کھجور کے درخت سے جھانکتے زرد اداس ادھورے چاند کو دیکھا۔

"میں تمہیں اتنا کیوں سوچتا ہوں' معصوم لڑکی! تمہارا اور میرا رشتہ ہی کیا ہے۔"

اسٹور روم کے بند دروازے کو دیکھتا وہ کتنی دیر سوچے گیا' مگر کب تک' صبح اسے اسلام آباد جانا تھا اور دیر سے سونے کا مطلب دیر سے جاگنا۔ اس نے اٹھ کر ہاتھ جھاڑے' ایک آخری الوداعی نظر اپنے پیچھے اس بند دروازے پر ڈالے اور سیڑھیاں اتر گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں تو اسی دن کھٹک گئی تھی' جس دن اسے چائے لے جاتے دیکھا۔"

ندرت' ارحم کو اترتے دیکھ کر کمرے میں واپس آگئی' چائے ہاتھوں میں ——— تھی اور وہ خود ٹھیک ٹھاک تپ گئی تھی۔

سلگتے مزاج کو بھڑکانے میں نگہت کو ہمیشہ سے تو نہیں لیکن عمر کی سیڑھیاں طے کرتے ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔

"ہمارے گھر میں رہتے' ہماری دیوار میں نقب زنی۔" اسے اپنی بات کے بے تکے پن کا اندازہ نہ تھا۔

"ارے چھوڑو نا' ہمارے پاس کیا فالتو ٹائم ہے جو یوں فضول لوگوں کی ڈسکشن میں ضائع کرتے پھریں۔"

"پھر بھی' تم نہ دیکھتیں ارحم کو۔ بالکل سوکھا ہوا سیب لگ رہا تھا۔" ندرت کی تشبیہ پر نگہت نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"اچھا سنو! ادھر آؤ میرے پاس۔" وہ پراسرار انداز میں آگے جھکیں۔ ندرت تجسس کے مارے چائے کا کپ ٹکا کر تیزی سے پاس آئی۔

"اب اس قصے کو یہیں ختم کرو' کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ یوں بھی اب وہ عاصم کے نکاح میں ہے۔"

جو خطرہ تمہیں اس سے پہلے تھا' اب وہ نہیں رہا تو خوامخواہ میں بات کو چھیڑ کر اپنا امیج اس کی نظروں میں خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اسے کاملیالی کے ساتھ پسند کے خانے میں گوٹ فٹ کرنے کے طریقے بتا رہی تھیں۔

خاندان کے وہ سبھی لڑکے جو ان کے ساتھ کے تھے' شادی شدہ ہو گئے تھے۔ کسی کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت ان کی یاد نہیں آئی۔ وہ ایک کے بعد ایک بلاوتی بریانیاں اور ولیمے کے میٹھے کھاتی' دل کو بہلاتی اور تسلیاں دیتی رہیں اور آج تک بے خبری کے عالم میں جی رہی تھیں۔ ایک وقت آتا ہے جب دل کی تلخی چہرے سے جھلکنے لگتی ہے۔ انسان کے خیالات میں رچی تلخی بغض اور کینہ چہرے پر دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ لہجے بے لچک اور رویہ کھردرا بنا رہتا ہے۔ پھر آپ لاکھ جھوٹی مسکراہٹ اور بناوٹی اداؤں کے خول چڑھا کے لوگوں سے ملیں' کوئی آپ کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

کیونکہ انسان اپنے چہرے پر نرمی اور خوش اخلاقی کا ماسک لگا کر چند گھنٹے' چند دن تو گزار سکتا ہے مگر پوری زندگی نہیں اور جب وہ اپنا ماسک اتار کر سخت دل اور دراڑوں بھرے چہرے کے ساتھ لوگوں سے ملتا ہے تو کوئی انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی اور ان کے اپنے جیسا شخص بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

پوری رات جگار کے بعد طبیعت ست' سر بھاری اور آنکھیں متورم تھیں۔ گھومتے سر کو تھام کر بمشکل سیڑھیاں اور صحن عبور کر کے اس نے کچن میں قدم رکھا۔ آج اسے جاگنے میں دیر ہو گئی تھی' دن کافی چڑھ آیا تھا۔

اور اس گھر میں آنے کے بعد زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ کسی دن وہ یوں صبح دیر تک سوئی ہو۔ اسے ایک دم سے فکر نے آگھیرا۔

پتا نہیں کسی نے ناشتا بھی کیا ہو گا یا سب بھوکے ہی چلے گئے۔ سامنے ہی کچن کے دروازے کی طرف پشت کیے بی بی جان چائے نکال رہی تھیں۔

"ارے سبحی باجی! آپ اسکول نہیں گئیں۔"

اس نے روز کی طرح لہجے کو بشاش کرنا چاہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اور سب نے ناشتا کر لیا کیا؟ لائیں چائے میں نکال دوں۔" اس نے کیتلی ان کے ہاتھ سے لینی چاہی۔ جسے انہوں نے بری طرح جھٹک دیا۔

"رہنے دو بی بی اپنے یہ چھوٹے ڈھکوسلے کسی اور کو دکھاؤ جا کر' پہلے ہی اتنے سال کی خدمت ہم سے وصول کر لی اچھی طرح' اب مزید احسان مت کرو' چکانے کی طاقت نہیں ہے ہمارے اندر۔" ان کا لہجہ درشت تھا۔ وہ شرمندگی سے وہیں زمین میں گڑ گئی۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ جیسا آپ سوچ رہی ہیں' نہیں نے عاصم سے ویسا کچھ بھی۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے بارے میں کچھ سوچنے کی' میرے پاس نہ تو اتنا فالتو ٹائم ہے نہ دماغ' تمہاری فکر کرنے کو ایک وہی عاصم کافی ہے' جسے چار دن میں قبضے میں کر لیا تم نے' سمجھیں۔" ان کا انداز سیدھا تک آمیز تھا۔ وہ بھرے دل سے چائے کا کپ لے کر دادی کے پاس آبیٹھی۔

"اٹھ گئی میری بچی۔" دادی کی وہ ہی آواز تھی' مشفق اور مہربان۔

"اور میرا ولیہ کہاں ہے؟"

"اوہ دادی! سوری۔ میں سمجھی سب نے ناشتا کر لیا ہے تو۔"

"تو میں بڈھی جان بھی خود سے کر لوں گی۔"

"نہیں نہیں' دادی بس ابھی لاتی ہوں۔"

کمرے سے نکلی تو ندرت ولیہ لیے آ رہی تھی' اسے نظر انداز کر کے سیدھی اندر چلی گئی۔



"دادی آپ کا ولیہ۔" سعادت مندی کے سابقہ سارے ہی ریکارڈ توڑتے ہوئے بے حد مودب انداز میں اس نے ولیہ دادی کے سامنے رکھا اور ایک شرربار نظر اس پر پھینکتی باہر چلی گئی۔

"اوں ہوں۔ بالکل بے ذائقہ بھلا میری بچی کے ہاتھوں والی لذت ان میں کہاں؟"

"آپ کو کیا پتا دادی' آپ تو پرہیزی کھاتی ہیں۔" ایک پھیکی مسکراہٹ زبردستی سجائی۔

"ارے کل رات بھی کھایا تھا پرہیزی' دلہن نے بنا کر دیا تھا' ارایانی پت' نہ نمک نہ مرچ' صرف چوسی گنڈیری سی مرغی' بے رنگ پانی میں ڈبکیاں لگاتی اور میں پلیٹ میں اسے کبھی ادھر سے پکڑ کبھی ادھر سے پکڑ' تھک کر چور ہو گئی۔" اماں جی کا انداز دلچسپ تھا' وہ مسکرا دی۔

"زور سے ہنس دے میری بچی' تیری ہنسی سننے کو کان ترس گئے' ہنسا بولا کر' یہ لوگ تو عاقبت نااندیش ہیں' نہیں کیا پتا اپنی زیادتی کا' تو دل پر نہ لے' اللہ سے امید لگا' دن پھر جائیں گے۔ عاصم دل کا برا نہیں۔" انہوں نے دل جوئی کی خاطر کہا۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ (یہ ہی تو مسئلہ ہے کہ وہ دل کا برا نہیں' اچھا ہے۔)

"دل کا کوئی برا نہیں ہوتا دادی' سب رویے اور زبان کے برے ہوتے ہیں' دل چیر کے کس نے دیکھا ہے بھلا' جو زبان کہتی ہے سب وہ سنتے ہیں اور جو آنکھیں دیکھتی ہیں سب اس کا یقین دلاتے اور کرتے ہیں اور سب کی عزت' بے عزتی' دوسروں کی باتوں' رویوں اور برتاؤ سے جڑی ہوتی ہے۔ باقی کس کے دل میں کیا ہے' کسی کو کیا معلوم؟" وہ گم سم سی بولے ہی چلی جاتی' لیکن۔۔۔

اعظم بھائی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے تیزی سے آنکھیں رگڑیں اور باہر نکل گئی۔ وہ وہیں کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔

"کہیں انجانے میں ہم سے زیادتی تو نہیں ہو رہی۔" ایک سوچ دماغ کے کسی گوشے میں پل بھر کے لیے ابھر کر معدوم ہو گئی اور دادی سوچ رہی تھیں۔

"دنوں میں اس کے خیالات' عمر کے کتنے سال آگے بڑھ گئے۔"

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے بہت محویت سے اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف عاصم' ایک طرف وہ خود اور درمیان میں چھوٹی موٹی سی زینب۔

"بھائی صاحب چائے۔" ثانیہ کی آواز پر اس نے جلتی آنکھیں موندیں تو ان میں ہلکا سا نمی کا احساس تھا۔ اسے حیرت نے آگھیرا۔

کتنی دیر وہ چٹ لیتا گلابی پوروں پر چمکتی نمی کو دیکھتا رہا۔

"بھائی صاحب۔" ثانیہ کی آواز نے چونکایا۔ چائے کے بھاپ اڑاتے مگ کے ساتھ وہ اس کی توجہ کی منتظر تھی۔ وہ اٹھ کے سیدھا بیٹھا۔

"یہ تصویر۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے مگ تھاما۔

"تمہارے پاس کہاں سے آئی' کب کھینچی تم نے۔"

"کیا مطلب کب' جب عاصم بھائی زینی کو رنگ پہنا رہے تھے تب ہی تو۔" ثانیہ کو بولتے ہوئے احساس ہوا وہ کہیں اور جا پہنچا ہے۔ وہ یوں ہی چند لمحے اپنے بھائی کو دیکھتی رہی۔ ان دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ صرف چہرہ دیکھ کر مزاج کی شگفتگی اور برہمی بھانپ لینے والے بھائی' بہن میں بھلا کوئی بات کیسے چھپ سکتی تھی۔

"بھائی صاحب! ایک بات پوچھوں' سچائی شرط ہے۔" اس نے گہری سانس بھر کے ثانیہ کو دیکھا اور ہولے سے بولا۔

"مت پوچھو' پلیز۔" وہ مسکرا دیا تھا۔ ثانیہ اس کا اشارہ سمجھتی تھی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ زینی کا بندھن وہاں جڑا ہو اور

یہاں کچھ ٹوٹ گیا ہو۔" اس نے ارحم کے سینے پر بائیں طرف انگلی کی پور چھوئی۔ کچھ لمحے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر اس نے تھک کے نگاہیں ہٹالیں۔

"اگر کچھ ٹوٹ بھی گیا ہے تو اب جڑ نہیں سکتا اور توڑنے والے کو خبر بھی نہیں۔" اس کا لہجہ بھی ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ ثانیہ نے بے اختیار اس کے کندھے پر ہلکے سے دباؤ ڈالا۔

"خیر!" اس نے گہری سانس بھر کے اس بوجھل احساس سے اپنے آپ کو نکالا۔

"معاملہ یکطرفہ تھا۔ مگر بہت بڑھا نہیں تھا صد شکر پلٹنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔" اس نے مسکرا کے اپنی بہن کو دیکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن مجھے تو کسی گڑبڑ کا احساس ستا رہا ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"عالیہ چچی نے امی سے آپ کے اور ندرت کے لیے بات کی ہے۔"

"کیا؟" اس کے لیے یہ خبر کسی شاک سے کم نہیں تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو تو بہت آسانی سے سکتا ہے کیونکہ انہوں نے امی کو یقین دلایا کہ ندرت اور آپ نا صرف ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس میں آپ کی مرضی بھی شامل ہے۔"

"اور یقیناً" انہیں یہ یقین دہانی کروانے والی ندرت کے سوا اور کون ہو سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اب کے حیران ہونے کی باری ثانیہ کی تھی۔

اس نے تصویر اٹھا کے اپنی ڈائری کے صفحات کے بیچ میں دبالی۔

"مطلب یہ کہ انسان کو اپنی عزت نفس کی حفاظت ہر حال میں کرنی چاہیے 'خاص طور پر صنف نازک کو' اس وقت اور بھی زیادہ جب معاملہ صنف مخالف سے ہو۔"

"اور آپ کے خیال میں ندرت کو اس بات کا احساس نہیں۔" وہ بات کی تہ تک پہنچ چکی تھی۔

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر میں امی کو منع کر دوں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"تیری مہربانی۔" اگلے ہی پل دونوں کی ہنسی کمرے میں بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

ندرت اپنی کھولن پر قابو پانے کی کوشش کرتی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"مل گیا سکون ماں کا سر نیچا کر کے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا' وہاں سے امید مت رکھو۔ وہ پہلے ہی اونچے دماغ کے لوگ ہیں' پر تمہیں' نواب زادی کو کچھ نظر آئے تب نا۔"

عالیہ بھابھی کچھ پہلے ندرت اور ارحم کے حوالے سے دیکھے گئے مستقبل کے خوابوں کو بالکل بھول چکی تھیں' ندرت کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

اس نے اپنی ماں کو وہاں بات کرنے پر اتنا نہیں اکسایا تھا جتنا نگہت نے۔

"اور یہ بے بی کی بچی آجائے ذرا آج میں اچھی طرح پوچھوں گی اس سے۔ اسی نے روکا کیا تھا مجھے کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے گی' لو رہ گئی گھر میں گھر کی بات۔ اب تو پورے خاندان میں نہ اچھل جائے تو میرا نام نہیں' ہم تو تیلی والے ہو کر خود سے منہ پھوڑا اور وہاں سے کیا جواب ملا' چٹا انکار۔"

وہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں' لیکن اس وقت چھری سبزی پر چلنے کے بجائے ندرت کی آنکھوں کے آگے زیادہ چل رہی تھی۔

"کچ کچ۔" غصے میں بھناتے ہوئے انہوں نے لوکی کے دو چار بڑے بڑے ٹکڑے کیے۔

"اس عمر میں یہ بے عزتی سہنا کوئی آسان کام ہے۔



اعظم نے منع بھی کیا تھا' میں ہی پاگل تھی جو تم دونوں چلتروں کے کہنے میں آگئی۔ بس ہو گئی جی بھر کے جگ ہنسائی۔"

اس بار وہ اپنی اولاد سے خوب ہی عاجز آگئی تھیں۔

ان کی امیدوں پر بڑا برفیلا پانی پڑا تھا۔ اس ٹھنڈے موسم میں' ان کا عتاب دل بھر کے ندرت کے سر پہ برس رہا تھا۔ چلتر کا خطاب اپنی ماں سے پاکے تو خود پر قابو پانا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔

"جاؤ لے جا کر جھونک دو اپنی ماں کی عزت کی طرح انہیں چولہے میں۔" انہوں نے بے ہنگم انداز میں کٹی لوکی اس کی طرف بڑھا دی۔

"ایک وہ مہارانی ہیں' ایک دن ہم نے کچن کیا دیکھ لیا دوسرے دن سے انہوں نے جھانکا تک نہیں۔ کام کر کر کے ہڈیاں گھسی جا رہی ہیں۔ پر تم دونوں ہڈ حراموں کو آئینہ تکنے سے فرصت ملے تو ماں کو دیکھو نا۔"

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ندرت کو کچا چبا جاتیں' برسوں سے سنبھال کر رکھی گئی عزت ان کے اپنے خیال میں مٹی میں مل گئی تھی۔

ایک تو ان کی جیٹھانی نے ارحم کا نام لے کر انکار کر دیا کہ اس کی مرضی نہیں ہے۔

وہ ندرت کی پسندیدگی کا اپنی طرف سے اظہار کر بیٹھی تھیں۔ ان کی بات سن کر گونگی بن بیٹھیں۔ جیٹھانی جہاندیدہ عورت تھیں اور مقصد اپنی دیورانی کی دل آزاری تھا بھی نہیں۔

وہ جانتی تھیں عالیہ دل کی بری نہیں۔ بس اولاد کے چڑھاوے میں جلدی آجاتی ہیں۔

"ارے بھابھی! آپ فکر مت کریں۔ ندرت جیسی آپ کی بیٹی' ویسے ہی میری۔ میں خود بہت اچھی جگہ دیکھ کر رشتہ کرواؤں گی اس کا' ہاں ارحم' لیکن ابھی مانتا نہیں' بات ندرت کی نہیں' وہ تو بس شادی کے لیے ہی تیار نہیں۔"

عالیہ مرے مرے انداز میں ہوں ہاں کرتی رہیں۔ اصل مرچیں تو انہیں اس بات سے ہی لگی تھیں کہ "بات ندرت کی نہیں ہے۔"

"اور پسند و شہد کی کیا بات ہے' آج کل تو لڑکے لڑکیوں کی پسند بھی کپڑوں کی طرح بدلتی ہے' میں نے ارحم سے پوچھ کر پوری طرح تسلی کرلی ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

اب وہ انہیں کیا بتاتیں' یہ غلط فہمی انہیں ہی نہیں اس گھر کی بھی عورتوں کو لاحق تھی' لالہ جی کو چھوڑ کر۔ بے دلی سے فون بند کر کے انہوں نے جلالی انداز میں ندرت کو پکارا تھا۔ اور تب سے اب تک اس کے سر پہ برس رہی تھیں۔ ندرت کچن میں کھڑی آنسو پونچھتی رہی۔

اسے امید نہیں تھی اتنے دن کی محنت یوں بے کار چلی جائے گی۔ ارحم اتنا سنگدل نکلے گا۔ کئی دنوں سے سنبھال کر رکھی گئی جمع پونجی خرچ کر کے اس نے بڑے ارمانوں سے ارحم کی پسند کے رنگوں کے سوٹ یوں ہی بے موقع بنائے اور گھر میں پہنے تھے۔ حالانکہ متوسط طبقے کے بیشتر گھرانوں کی طرح یہاں یہ بات بالکل تصور نہیں کی جا سکتی تھی' نہ افورڈ۔

وہ باتوں باتوں میں بے شمار بار اسے جتا چکی تھی کہ وہ مستقبل کے حوالے سے اسے کیا سمجھتی ہے' لیکن اس کے گریز اور سرد مہری کو کبھی خاطر میں نہیں لائی تھی۔ اپنی جیت کا یقین جو تھا' اور اب جو یقین ٹوٹا تھا تو اسے لگ رہا تھا وہ گھر کے کسی فرد کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہی ہے۔

یہاں تک کہ زینی جسے وہ گھر کی نوکرانی سے زیادہ گردانتی نہ تھی۔ اس کے سامنے اپنی بات کے ضائع جانے کا زیادہ ہی احساس تھا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے ہی دن سے روز و شب معمول پہ آگئے تھے۔

گھر میں کسی کو یوں کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے کی عادت زینی کی آمد سے پہلے بھی نہیں تھی۔ اس کے آنے کے بعد تو اس نے سب ہی کو خوب آرام کرایا تھا۔ اب دو' چار دن جو سب کو اپنے کام اپنے ہاتھ سے

کرنے پڑے تو عقل ٹھکانے پر آگئی تھی اور گھر کی اکثر چیزیں بے ٹھکانہ ہو گئی تھیں۔ جن کو ٹھکانے سے رکھنے کا ہنر صرف زینی کو یاد رہ گیا تھا اور کسی اور کو اگر یاد بھی تھا تو اب فرصت قطعی نہیں تھی۔ کیونکہ بے بی باجی نے گھر کے سبھی افراد کو مصروف کر ڈالا تھا۔ ان کے اسکول کی ایک کولیگ کے توسط سے ان کے لیے پروپوزل آگیا تھا۔ گھر کے سبھی افراد کی خوشی دیدنی تھی۔

عالیہ بھابھی ندرت کے سلسلے میں جو عزت افزائی کروا چکی تھیں اس کا غم بھی غلط ہونے لگا۔ یوں بھی اس واقعے کے بعد ارحم نے اس گھر میں آنے اور غیر معینہ مدت کے لیے طعام و قیام کے ارادے سے گریز ہی کیا تھا۔

اسے معلوم تھا اس کے انکار کے بعد سے گھر میں اسے جو خصوصی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ اس سے تو ہاتھ دھونے ہی پڑتے۔ لیکن اصل مسئلہ ندرت کا تھا جس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اکیلے میں یا سب کے سامنے ہی اس سے سوال جواب کرنے کھڑی ہو جاتی۔

لہٰذا کراچی آنے کے بعد اس نے کرائے کے مکان کو ہی ترجیح دی تھی اور صرف ایک بار اپنا ضروری سامان لینے ہی وہاں آیا تھا۔

صد شکر کہ اس وقت گھر پہ عالیہ چچی کے سوا کوئی نہ تھا۔ دادی اپنے کمرے میں تھیں۔ اس نے وہاں سے چلتے وقت ان کے ہاتھ چومے تو ان کی خفیف سی لرزش دل کو بہت محسوس ہوئی۔

وہ بھی عاصم ہی کی طرح ان کا پوتا تھا۔ ایک بیٹے کی اولاد عاصم تو دوسرے کی وہ خود۔ پھر دادی نے اس کے اوپر عاصم کو ترجیح کیوں دی۔ وہ کبھی جان نہیں پایا۔ شاید دادی کے بارے میں اپنے راز دل سے واقفیت کا خیال اس کی غلط فہمی ہی تھا۔ اور شاید خیال بھی کہ وہ خود دادی کو عاصم سے زیادہ عزیز ہے۔

چلتے وقت اس نے زینی کو کپڑوں کا ایک ڈھیر اٹھائے باہر کی جانب واش روم کی طرف جاتے دیکھا۔ کپڑوں کی دھلائی کا تمام کام چاہے وہ ہاتھ سے ہو یا واشنگ مشین سے اسی کونے میں نمٹایا جاتا تھا۔ جانے کتنے دن سے دوسری مصروفیات میں لگ کر اسے کپڑے دھونے کا ٹائم نہیں ملا تھا جو اب یہ ڈھیر اس کی نظر کرم کا انتظار کرتے کرتے گندگی کا پہاڑ بن گیا تھا۔ بے پناہ دکھ اس کے دل کے کسی کونے میں ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہو گیا۔

عزت نفس کی پامالی کے جس اندیشے نے اس کا آب و دانہ اس گھر سے اٹھایا تھا اور عزت نفس کا کوئی احساس نہ رکھنے والی ندرت کو جس وجہ سے اس نے رد کر دیا تھا اسی عزت نفس کو دن رات مجروح ہونے اور اس منت کی چاکری سے ہی تو بچانا چاہتا تھا وہ اسے صد افسوس ایسا ممکن نہ تھا۔

تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ اس سے کوئی بات کیے بنا ہی وہاں سے چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

نگہت عرف بے بی کا رشتہ بخیر و خوبی طے پایا۔ گھر کے سبھی ذمہ دار افراد نے اپنے شانوں کو ایک نادیدہ بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ عاصم بھی سمجھتا تھا نگہت جلد سے جلد اس گھر سے رخصت ہو تو اس کی بھی راہ کھلے۔ وہ اور گھر کے دیگر لوگ جوش و خروش سے تیاریوں میں لگے تھے۔ رشتے میں بظاہر کوئی برائی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ سلیم انصاری صاحب اپنے نام ہی کی طرح سنجیدہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ پروقار شائستہ گو۔ بے بی باجی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ نوکری بھی مناسب تھی تعلیم اور تنخواہ بھی۔ یوں کئی مناسب چیزوں نے مل کر اس پروپوزل کو پہلے قابل غور اور بعد میں قابل قبول بنا دیا۔ شادی کی جلدی یہاں تو خیر تھی ہی' اُدھر سے بھی دیر مناسب نہیں سمجھی گئی۔

بہت جلد وہ دن بھی آیا جب ان کے گھر کی بزرگ اور خواتین تاریخ طے کرنے تشریف لائیں۔ کھانے کا انتظام تو بازار سے کروایا گیا تھا۔ لیکن ان کے آمد کے ساتھ ہی پیش کی گئی چائے کے ساتھ رکھے تمام ہی



لوازمات زینی کے باکمال ہاتھوں کے کرشمے تھے۔

وہ رشتے کی بات چلنے سے لے کر اب تک کچن میں پڑنے والی ہر ضرورت کے لیے پیش پیش رہی تھی نا صرف کچن کے اندر بلکہ کچن سے باہر بھی' متواتر اس کی خدمت جھلک دکھاتی رہی' لیکن مہمانوں کے سامنے وہ خود گئی نہ کسی نے یاد کیا۔

عاصم نے بھی اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی تھی' یوں بھی اس کے اور زینی کے تعلقات میں گرمجوشی تو کبھی نہیں تھی۔ لیکن اب وہ اک ذرا سی معنی خیزی سے بھی گیا اور اس کی جگہ نگاہوں اور لہجے کی سرد مہری نے لے لی اور کبھی زینی کو لگتا اس سرد مہری میں کہیں ناراضی کا رنگ بھی شامل ہے۔

فی الحال تو اس نے خاموشی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ شاید عرصے بعد گھر میں اٹھنے والے خوشی کے رنگ میں بھنگ نہیں ملانا چاہتا تھا۔

زینی کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی کلم' پریڈ' اس کی محنت اور دوسروں کا کریڈٹ' کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا' سوائے بے بی باجی کے رویے کے' ہاں اب وہ بھی کبھی آرڈر جاری کرتے وقت معمولی سا مسکرا دیتی تھیں۔

عاصم سے وہ خود ہی کتراتی پھرتی تھی' اسی میں اس کی بہتری تھی یا شاید دونوں کی۔ ایک بڑا مرحلہ بخیر و خوبی طے پایا اور ایک' دو ہفتے کے بعد کی کوئی تاریخ ٹھہرائی گئی۔ بھابھی ایک پلیٹ میں مٹھائی رکھ کے سمدھن کا منہ میٹھا کروانے چلی تھیں۔

"مٹھائی تو میں اپنے ہاتھوں سے آپ کو کھلاؤں گی بھابھی۔" نگہت کی ہونے والی ساس خوش اخلاق بھی تھیں اور خوش گفتار بھی۔

"پہلے میری ایک گزارش سن لیجیے۔"

☼ ☼ ☼

دادی کے کمرے میں ہی سب جمع تھے۔ اعظم بھائی' بھابھی' عاصم اور ندرت۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی سوائے پنکھے کے گھرر گھرر کے کوئی آواز نہ تھی۔

ہر ایک کے چہرے پر اپنی سوچوں کا جال پوری طرح ثبت تھا۔

ہر ایک اپنے دھیان میں غلطاں و پیچاں اس نئے مسئلے سے نکلنے کی تدبیر ڈھونڈ ڈھونڈ کر باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ عالیہ بھابھی نے ایک ایک چہرے کو پرامید نظروں سے کھوجا پھر اکتا کر گہری سانس خارج کی۔ سب سے عجیب کیفیت کا شکار وہ خود ہی تھیں۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اپنی بیٹیوں کے رشتے میں کھڑی رکاوٹ جسے وہ خود ہی رکاوٹ سمجھتی تھیں۔ اور اپنے تئیں بیٹے کی قربانی دے کر راستے سے ہٹایا تھا۔ لیکن قدرت کے الٹ پھیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ ایک بار پھر وہی وجود اب کسی اور روپ میں ان کے آگے مسئلہ بن کے کھڑا تھا۔

"میری زندگی کا سب سے منحوس ترین دن تھا وہ جب اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔" انہوں نے زیر لب اسے گالی سے نوازا۔

"اے رہنے دو۔" دادی کو برا لگا۔

"جس دن سے آئی ہے' اللہ میاں کی گائے' بے دام کی غلام بن کے رہ گئی تم لوگوں کی۔"

"ارے ایسی غلامی کس کام کی' پہلے بھی بیٹیوں کے نصیب کا رونا اور اب بھی' اب تو۔" انہوں نے بے چینی سے بات ادھوری چھوڑ کر اعظم بھائی کا کندھا ہلایا۔

"اب چپ کیوں ہیں' کچھ بولیں نا۔ آپ کی اور اماں جی کی تجویز تھی۔ عاصم کا نکاح کر دیا' اب کیا کریں۔"

"تو انہیں بتایا کیوں نہیں۔"

"پاگل ہوں کیا میں۔" وہ بدک ہی تو گئیں۔

"اور جو انہوں نے یہ رشتہ بھی ختم کر دیا تو' میری بچی تو گئی کام سے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔ اعظم بھائی ان کے انداز پر چڑ سے گئے۔

"اللہ نہ کرے۔ ذرا اچھے الفاظ منہ سے نکالو۔"

"ارے میں کیا اچھا نکالوں اور کیا برا' وہ جو نکال گئی ہیں اپنے پیٹ کا مروڑ' اس کی دوا کہاں سے لاؤں میں۔" ان کو ٹھیک ٹھاک پتنگے لگے ہوئے تھے۔

"آرام سے امی۔ اپنی طبیعت مت خراب کیجیے

گا۔ نکل آئے گا کوئی نہ کوئی حل۔" ندرت نے کن انکھیوں سے عاصم کو دیکھا۔

گہری سنجیدگی چہرے پر لانے وہ مسلسل کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔

"ارے کیا حل نکلے گا' میری تو سمجھ سے باہر ہے' اماں آپ ہی بتائیں۔" ان کی امید بھری نظریں کبھی خاوند کا چہرہ چھوتیں' کبھی ساس کی نظروں سے ٹکراتیں' اور جس سے یہ مسئلہ جڑا تھا اس کا موقف تو ابھی پوچھا ہی نہ تھا۔

"مجھ سے کیوں پوچھتی ہو بار بار' میں تو کہہ چکی ہوں کہ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں' کہہ دو ہمارے بیٹے کی شادی ہو چکی ہے اور ملوا دو زینی سے کہ یہ رہی ہماری بہو۔"

"اور جو انہوں نے کہہ دیا کہ بہو کے ساتھ بیٹی کو بھی پاس رکھ لیں۔"

"ارے بہو' ایسا نہیں ہوتا' مجھے تو وہ لوگ ایسے نہیں لگے۔"

"ارے آج کل کسی کی شکل پہ نہیں لکھا ہوتا کون کیسا ہے اور اگر اتنے ہی اچھے تھے سب تو یہ فضول کی بات کی کیوں انہوں نے اور وہ بھی عین تاریخ کے دن' جب پتا تھا کہ ہمارے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"ایسا صرف آپ سمجھ رہی ہیں کہ ہمارے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" عاصم نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"اچھا تو تم بتا دو کوئی حل۔"

"ان کی دی گئی تجویز پر عمل تو کسی صورت نہیں ہو سکتا' میں دو ٹکے کی شادی میں اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ بے لچک تھا۔

"کیوں! کیا ضروری ہے زندگی برباد ہی ہو' اللہ آباد رکھے ایسا کیوں سوچتے ہو۔" اعظم بھائی کا لہجہ کمزور تھا۔

"اور اگر ان کی بات نہ مانی تو پھر۔" عالیہ بھابھی کی آواز میں ایک خوف تھا' جسے خاموشی دبے پاؤں بیچ میں سے گزری۔

"تم تو جانتے ہو سب کچھ۔" انہیں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں تھی' اس سب کچھ کے پیچھے بھی کچھ تھا۔

نگہت کی بڑھتی ہوئی عمر' اس کی دبتی ہوئی رنگت اور ابھرتی ہوئی بد مزاجی' رشتوں کا کال اور پیچھے ایک اور کنواری بہن کی موجودگی' نگہت کی خوشی' عاصم ایک بار پھر چپ کر گیا۔

"تو کیا چاہتی ہیں آپ امی' بھوڑوں میں زینی کو۔" اس کا لہجہ بے انتہا چڑا اور گستاخ ہو گیا۔

"یہ تو نہیں کہا میں نے۔" وہ ٹھنڈی پڑ گئیں۔

"تو اور کیا کہا ہے' پھر شادی کر لوں ان کی بیٹی سے۔ زینی کو بھی آس میں رکھوں۔ پھر جب بعد میں انہیں پتا چلے گا تب کیا ہو گا۔"

"دھیرج رکھو میاں' تاؤ کھانے سے کیا ہو گا۔"

"اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے' عاصم بھائی کو چاہیے زینی کو طلاق دے دیں۔" ندرت نے بہت فیصلہ کن انداز میں بات سمیٹنے کی کوشش کی تھی' لیکن یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔

"بکواس بند کرو۔" وہ چلا کے کہتا ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"مذاق سمجھ رکھا ہے سب نے۔ یہ شادیاں' طلاقیں کوئی بچوں کا کھیل ہیں۔" اس کے رد عمل پر سب ایک دم ہی گھبرا گئے۔

"عاصم! عاصم!" اعظم بھائی نے تیزی سے آگے بڑھ کے اس کے شانے تھامے۔

"کوئی آئندہ مجھ سے اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہے گا۔ کان کھول کر سن لیں سب۔ میں زینی کو کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے نہیں اپنایا تھا اسے۔ کوئی اور حل نکل سکے تو ٹھیک۔ ورنہ کسی کی شادی' زندگی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا میں نے۔" وہ کف اڑانے لگا۔

اماں جی کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ اعظم بھائی تھک سے گئے۔ ندرت کانوں پر ہاتھ رکھتی باہر بھاگی۔ اور عالیہ بھابھی کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا تھا۔

"یہ ان کا وہی بیٹا تھا جس نے زینی سے نکاح کے وقت انہیں یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ یہ قربانی' زینی سے شادی کا کڑوا گھونٹ صرف ان کی اور اپنی بہنوں کی آسانی کے لیے پی رہا ہے۔ آج اس کے انداز اور تیور دیکھ کر انہیں ٹھیک ٹھاک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گھونٹ اس کے لیے کتنا کڑوا تھا۔"

وہ بکتا جھکتا باہر نکل گیا۔ عالیہ بھابھی کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دھپ سے کرسی پر گر گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر کے معمولات پھر سے بدل کر اس کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ کچن کی نگرانی اور تمام امور مکمل طور پر نگہت اور عالیہ بھابھی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ندرت کے ذمے صفائی ستھرائی اور کپڑوں کی ذمہ داری سب نے اپنی اپنی خود ہی اٹھالی تھی۔ سوائے عاصم کے۔ وہ گھر میں اجنبی تھی یا مہمان۔ اس کو پلٹ پر حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

سردیوں کی خنک ہوا اور اداس شامیں' دل میں بھی گہری اداسی پھیلا دیتیں۔ خاص طور پر مغرب کے وقت جب وہ کمرے میں اکیلی ہوتی۔ پوری چھت پر پر ہول سناٹا شلتا پھرتا۔ سائے لمبے ہو کر ڈراؤنے ہو جاتے اور وہ اکیلی سردی میں اکیلے کمرے میں دبکی سی کھیں لپیٹے ٹھٹھری رہتی۔

اب اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود سے دادی کے کمرے میں رات گزارنے چلی جاتی۔ خصوصاً" جب سے اسے اس معاملے کا علم ہوا تھا۔ جس نے اسے سب کی نظروں میں چور بنا کے رکھ دیا تھا۔

بے بی باجی اس پر نظر تک ڈالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ عالیہ بھابھی نے بھی بات چیت مکمل طور پر بند کر رکھی تھی۔ اعظم بھائی کو کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا اور؟ شادی کی تاریخ نزدیک آتی چلی جا رہی تھی۔ الجھن بھرے بے کیف دنوں میں ارتعاش کا پہلا پتھر پڑا جب ان کے بڑے بھائی اچانک دادی کی محبت میں' اسلام آباد سے ملنے چلے آئے۔ بیگم اور بیٹی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اس بار تانیہ کا زینی سے ملنے اور اسے دیکھنے کا انداز ہی جدا تھا۔

وہ اس کے بھائی کی پسند تھی۔ حالانکہ اس کی ہو نہیں سکی تھی۔ پھر بھی انسیت کا دل میں ایک الگ ہی احساس اسے دیکھ کے ابھرتا تھا۔ زینی حیران حیران سی اس کی گرم جوشی دیکھتی رہی۔

"آپ ہی بتائیں۔ میں نے تو نیکی کی تھی۔ الٹی گلے پڑ گئی۔" جیٹھانی کی ذرا سی ہمدردی سے عالیہ بھابھی کا دل پگھل گیا۔ حالانکہ کچھ روز پہلے تک بڑی شکایتیں تھیں ان کو اپنی ان ہی جیٹھانی سے۔ مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔

"اور تو اور اس کلموہی نے جانے کیا پڑھ کے پھونکا ہے میرے معصوم بچے کا تو دل ہی پتھر ہو گیا۔ بڑی بہن کے آنسو بھی نظر نہیں آ رہے اسے تو۔"

زرینہ بیگم چپ چاپ ان کا واویلا سنتی رہیں۔ وہ چاہتی تھیں ایک عورت کا شوہر اپنی بہن کے آنسو پونچھنے کے لیے صرف بھائی بن کر سوچے۔ اس عورت کی آنسوؤں کی انہیں پروا نہیں تھی۔ جس سے اس کا شوہر چھین لینا چاہتی تھیں۔ ساری زندگی کے لیے اس کے بے داغ کردار پہ دھبا لگانا چاہتی تھیں۔

لیکن وہ یہ باتیں اپنی دیورانی سے کہہ نہیں سکتی تھیں۔

ایک یتیم لاوارث لڑکی ان کے خاندان اور رشتوں سے زیادہ اہم ہرگز نہیں تھی۔

"اعظم الگ پریشان ہیں۔ سچی بات ہے بھابھی۔ عاصم اگر زینی کو طلاق دے دے تو میں خود کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرانے کی کوشش کروں گی۔ لیکن میں اپنی بیٹی کی اتنی مشکل سے بنی بنائی بات صرف اس کی وجہ سے بگاڑ دوں۔ میرے اندر اتنا ظرف نہیں۔"

"اب میں کیا کہوں۔ بھائی صاحب کو بلاؤ۔ عاصم سے سب کے سامنے بات کریں۔ اس پہ دباؤ ڈالیں۔ مان جائے گا۔" ان کو بھی سوچ بچار کے بعد ایک ہی

حل نظر آیا تھا۔
"پہلی بیوی کی موجودگی میں تو بے بی کے سسرال والے اپنی بیٹی بیاہیں گے نہیں۔ اور اگر بے بی کی شادی کے بعد یہ مسئلہ اٹھا تو اور بھی گمبھیر ہو جائے گا۔ کیونکہ رشتہ ختم کرنا آسان ہے۔ مگر شادی ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

عالیہ بھابھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"اس وقت ممکن ہے وہ بے بی کو پریشان کریں اس کے سسرال والے بھی اور خود اس کا شوہر بھی۔ نئے لوگ ہیں کیا بھروسہ۔" اس وقت وہ خود کو نگہت کی ماں کی جگہ رکھ کے سوچ رہی تھیں۔

"زینب کو عاصم کے نام پر بٹھانا بھی کوئی نیک عمل نہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ ان کی علیحدگی ہو جائے۔ زینی کی تو اور جگہوں پر بھی بات چلائی جا سکتی ہے۔ لیکن نگہت کا مسئلہ دوسرا ہے۔" ان کی صاف گوئی پر بھابھی نے پہلو بدلا۔

"مشکل تو یہی ہے بھابھی۔ عاصم کا بچپنا نہ تب تھا۔ اس کے سر پہ تو اس کی چچی زاد نگہت کا بھوت سوار ہے۔" انہوں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔

"بات تو خیر اچھی نہیں۔ اگر عاصم کا دل نہیں مانتا تو اس کے ساتھ بھی زبردستی ٹھیک نہیں۔ پسند کی شادی اس کا حق ہے۔"

"ہیں!" عالیہ بھابھی نے پینترا بدلتے یوں دیکھا گویا ان کا دماغ چل گیا ہو۔

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔"

پر سوچ انداز میں ہنکارا بھر کے انہوں نے عالیہ بھابھی کو دیکھا۔

"خیر اس مسئلے پر بات بھی ہو جائے گی۔ اور حل بھی نکل آئے گا۔ ان شاء اللہ میں مٹھائی لائی ہوں۔ بچیوں کو بلاؤ منہ میٹھا کراؤ شادی سر پہ ہے اور وہ بالکل مرجھا کے رہ گئی ہے بے بی۔"

انہوں نے ماحول کو بدلنے کی معمولی سی سعی کی۔

عالیہ بھابھی بوجھل دل سے ٹھنڈی آہ بھرتی باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو بیٹا۔ ایک بار دل کو چھوڑ کر دماغ سے سوچو۔ میں نے اس بچی کو دیکھا ہے۔ بے بی کی ہونے والی نند کو۔ کوئی برائی نہیں ہے۔ اچھی بچی ہے۔ نیک نیتی سے قربانی دو گے تو ان شاء اللہ دل کا سکون پاؤ گے۔" بہت نرم اور ٹھنڈے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔

اعظم بھائی، معظم حسین اور ان کی بیگم، عالیہ کی ہمراہی میں اس کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ ان کی آمد کے ساتھ ہی ان کا مقصد سمجھ گیا تھا۔

"تم تو جانتے ہو تمہاری بہن کا رشتہ بڑی مشکل سے طے ہوا ہے۔ ممکن ہے تمہارے انکار سے انہیں ناگوار محسوس ہو۔ وہ لوگ بے بی کو اپنی بہو بنا کر لے بھی جائیں تو بعد میں تمہارے حوالے سے تنگ کریں۔"

"آپ لوگوں کو میری پریشانی، میری خوشی سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"غرض کیوں نہیں۔ ہم یہ سب تمہاری خوشی کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔"

"میری خوشی کے لیے نہیں۔ نگہت کی خوشی کے لیے۔"

"تمہاری خوشی بھی اسی میں ہے اگر تم غور کرو تو شادی کے بعد اگر وہ تمہاری وجہ سے خوش نہ رہ سکی۔ تو تم کیسے خوش رہو گے زینی کے ساتھ۔" عاصم نے [illegible]

"پھر وہی زینی تمہاری آنکھ میں کھٹکنے لگے گی۔"

عالیہ بھابھی نے اپنی طرف سے زبردستی ماحول میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"بہت مشکل ہے میرے لیے اسے چھوڑنا تائی جان۔ میں نے اسے دل کی رضامندی اور پوری خوشی کے ساتھ ___ اپنایا تھا۔ میں کیسے۔"

اس نے دھیمے لہجے میں وضاحت دینے کی کوشش



کی لیکن اس کی بات مکمل نہیں ہو پائی۔

"اچھا! دل کی خوشی۔ اس کا مطلب ہے تم نے مجھ سے جھوٹ بول کر محض بہلا کر اپنی بات منوانے کے لیے اماں بی کو سیڑھی بنایا۔"

"امی!" عاصم ہکا بکا رہ گیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ وہی تو تھیں مجھے اس رشتے کے لیے راضی کرنے والی۔"

"تو انہوں نے کچھ غلط باتیں تو نہیں کی تھیں نا۔"

وہ ایک دم تیز ہوا۔

"اور تو نے بھی تو کہا تھا کہ آپ کی خاطر قربانی دے رہا ہوں۔ جب تو تو نے نہیں بتایا تھا کہ اس چڑیل کا جادو تیرے سر چڑھ کے بول رہا ہے۔" وہ ایکدم آپے سے باہر ہو گئیں۔

"دیکھیں بھابھی!"

"نہیں کہنے دیں مجھے۔ یہ اولاد ہے میری۔ ایک طرف وہ ہے جسے بیاہنے کی فکر میں میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ عمریں گزر گئیں سکون سے آنکھیں بند کیے ہوئے۔ بالوں میں چاندی اتر آئی۔ کچھ دن اور بیٹھی تو۔ اور ایک یہ ہے۔ اسے اپنے عشق و عاشقی سے فرصت نہیں۔ کلیجے سے لگا کے بیٹھ گیا اس حرافہ کو۔ دیکھنے پہ رہ گئی بہن، رشتہ جڑ کے ٹوٹنے کے بعد تو کوئی جھوٹے منہ نہیں آئے گا۔ پوچھنے۔ پھر بیٹھ کے چاٹے گا اسے۔"

وہ ایک دم اتنی زور سے چلائیں کہ پورا گھر تو کیا آس پاس کے کئی آنگن ان کی آواز سے گونج اٹھے۔

"کہے دیتی ہوں میں۔ آج ابھی طلاق لکھ کر دے اسے۔ نہیں تو میں بتائے دے رہی ہوں۔ زندگی بھر تیری شکل نہیں دیکھوں گی۔ اپنی بیٹی سے پیاری نہیں وہ مجھ کو۔ سن لے تو کان کھول کے۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں تھیں۔

اعظم بھائی بیگم کے پیچھے پیچھے باہر نکلے۔ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔

انہیں ڈر ہوا ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔

عاصم نے تھکے تھکے عاجزانہ انداز میں اپنے تایا اور تائی کی طرف دیکھا جو آئے تو اس کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے تھے۔ لیکن یہاں آ کر یہاں کے مسائل کے حصے دار بن گئے تھے۔

دونوں میں سے کسی کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

معظم اس کا کندھا تھپتھپا کر باہر نکل گئے۔ زرینہ ان کے پیچھے تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ کتنی دیر سے کچن میں پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ اس کمرے کے بند دروازے اور اس کے پیچھے سے وقفے وقفے سے بلند ہوتا شور و غوغا سن رہی تھی۔

تانیہ نے بہت دیر اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔ پھر محسوس کیا اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں اور ماتھے پہ پسینے کے قطرے ہیں۔

"اٹھو تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔" وہ فوراً سے بیشتر فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو مجھے ڈر ہے کہ اگر تم یہیں کھڑی رہیں تو تمہیں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

زینی نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور اٹھ کر صحن عبور کرتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کے ایک ایک قدم سے اس کا ذہنی اضطراب جھلک رہا تھا۔ تانیہ کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔

بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی جو وہ گزار رہی تھی۔ خدا نے اگر صورت اور قسمت کا کوئی تال میل رکھا ہوتا تو وہ یقیناً "اتنی" بے بس ہوتی۔

اسے حقیقتاً" اس گھر میں اس کی کم حیثیتی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"ایک بات بتاؤ ___ دیکھو مائنڈ مت کرنا۔" اس نے بہت کم وقت میں اس سے بہت گہری دوستی کر لی تھی۔

"پوچھو۔" اس کی شکل سے ظاہر تھا کہ وہ غائب دماغی سے بول رہی ہے۔

"تم اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں واپس۔" اس

کی بات زینی جیسے ہوش میں آ گئی۔
"کیا مل رہا ہے تمہیں یہاں۔ صرف ذلت اور خواری۔" اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجنے لگی۔
"عزت نفس نام کی کوئی چیز —" اور یہ بھی تو اسی کی بہن تھی۔ وہی آنکھیں، وہی لب و لہجہ اور وہی بات۔
"کل اس کا دل چاہا تو تمہیں اپنا لیا۔ آج سب زور دیں گے تو چھوڑ دے گا۔ تمہیں کیا ملے گا۔" زینی خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔
"اپنے گھر میں کم سے کم یہ بے یقینی تو نہیں ہوتی نا۔ کہ ماں باپ کی موجودگی میں کوئی ہمیں یوں بے دردی سے استعمال کرے گا۔" زینی نے اس پر سے نظریں ہٹا کر زمین پر گاڑ دیں۔
"مائی گاڈ۔ سوری میں نے پوچھا ہی نہیں۔ والدہ تو حیات ہیں نا تمہاری۔"
"وہ سوتیلی تھیں۔ میرے یہاں آنے کے بعد گھر بیچ کر چلی گئیں۔"
بہت دیر بعد جب تانیہ اس کی خاموشی سے اس کی ناراضی کا یقین کرنے لگی تھی تب اس کی بیٹھی ہوئی سی آواز نکلی۔
"کہاں؟"
"پتا نہیں۔" اس بار آواز بھی نہیں تھی۔ تانیہ نے لبوں کی جنبش سے جواب کا اندازہ لگایا۔ وہ کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔
"زینب بلاشبہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا بھائی اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔ عاصم اس سے محبت کا دعوے دار تھا۔ خاندان کے سب سے قریبی دو لڑکے دونوں ہی اس کے ساتھ تعلق جوڑنا چاہتے تھے تو آخر کچھ تو تھا اس میں ایسا۔" تانیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کے اس کا سر کندھے سے لگا لیا۔ چند لمحوں بعد اسے کندھے پر نمی کا احساس ہوا۔
نیم تاریک کمرے کی بڑھتی ہوئی خنکی میں اس کی ہمدرد آواز ابھری۔
"کیوں رو رہی ہو۔" اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔
تانیہ اس کا سر سہلاتی دروازے اور اکلوتی کھڑکی کی جھریوں سے آتی سرد ہوا کا نوکیلا پن محسوس کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

شام تک فیصلہ ہو چکا تھا۔
عالیہ بھابھی کی دھمکی اتنی ہی دم دار تھی کہ عاصم اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ لیکن شام تک اسے طلاق دینے پر وہ اب بھی رضامند نہ تھا۔
"پہلے بے بی کی شادی کر دیں۔"
"ٹھیک ہے بھابھی۔ آپ انہیں کہلا دیں ہمیں رشتہ قبول ہے اور تجویز سے انکار نہیں۔"
"لیکن زینی۔" سوالیہ نشان اب بھی اپنی جگہ پر تھا۔
"اسے ہم اپنے ساتھ اسلام آباد لے جائیں گے۔" تانیہ اس وقت سب کے درمیان موجود تھی۔ سبھی افراد نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ہاں تایا ابا۔ وہ جب تک یہاں رہے گی۔ کبھی نہ کبھی بے بی باجی کے سسرال والوں سے اس کا سامنا ہوتا رہے گا۔ اور کسی وقت کسی کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو خوا مخواہ مشکل بھی ہوگی اور بدمزگی بھی۔"
اس کی تجویز سے سبھی کو اتفاق تھا۔
"کتنی عجیب بات تھی۔" اس نے اپنے تہہ کیے ہوئے سوٹ بیگ میں رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنے بہت سارے دن سے اس گھر میں خود اس کے سوا کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔
زینی زینی زینی۔
زینی کا نکاح۔ مسئلہ۔
زینی کا طلاق۔ مسئلے کا حل۔
زینی کی موجودگی کا مسئلہ۔
"اور میں اپنے آپ کو کتنا بے ضرر سمجھتی تھی۔" ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔
تانیہ نے اپنی طرف سے اس کے ساتھ نیکی ہی کی تھی۔ لیکن اس کا اترا ہوا چہرہ اسے مستقل ندامت میں مبتلا



کرتا رہا اسے کہیں اور، کسی اجنبی جگہ پر رہنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ لوگ بھی اجنبی ہی تھے۔ تانیہ کا دم ہی غنیمت تھا۔ تھوڑی بہت شناسائی اگر ارحم سے تھی بھی تو وہ تو خود کراچی میں رہتا تھا۔
شادی نزدیک تھی۔ فی الحال صرف تانیہ اسے لے کر اسلام آباد جا رہی تھی۔ یہ فیصلہ بھی اس نے خود ہی کیا تھا۔ اس کے خیال میں اکیلے رہ کر زینی زیادہ یکسوئی سے بدلتے حالات کے مطابق اپنا ذہن بھی بنا سکے گی اور خود کو سنبھال بھی سکے گی۔
"زینی کو اس کی اس درجہ محبت اور توجہ کی وجوہات سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اور اس کے پاس ان باتوں کو سوچنے کے لیے فرصت ہی کہاں تھی۔
دن رات دھڑکتے دل اور خوفزدہ سماعتیں لیے وہ قسمت کے فیصلے کی منتظر رہتی تھی۔
حالانکہ عاصم نے صاف منع کر دیا تھا کہ وہ اسے کسی صورت نہیں چھوڑے گا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ اتنی اہم بہرحال نہیں تھی کہ عاصم اس کے لیے اپنے گھر والوں اور خاص طور پر بھابھی کی اس نئی دھمکی کے بعد انہیں نظر انداز کر کے اپنے فیصلے پر ڈٹ جاتا۔ اسے یقین تھا جو ہار اس کی قسمت میں لکھی ہے۔ اسے ضرور اپنے گلے میں سجانی ہی پڑے گی۔
تانیہ مستقل اس کی ہمت بندھاتی۔ ہر فیصلے کا بہادری سے سامنا کرنے کی تلقین کرتی رہتی۔ گویا عاصم کی پرزور تردید کے باوجود گھر کے ہر فرد کو اس کے فیصلے کی ناپائیداری کا علم تھا۔

☼ ☼ ☼

اسلام آباد میں ان لوگوں کا بڑا سارا گھر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے فوراً "ارحم کی جاب کا خیال آیا۔ وہ تو یقیناً" ایک بہت عام سی نوکری تھی۔
"بابا کی زندگی بھر کی محنت اور صبر شکر کا پھل ہے یہ گھر۔" تانیہ اس کی آنکھوں میں چھپی حیرانی بھانپ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے ایک نئی حیرانی اوڑھ لی۔
"کیسے میرا چہرہ پڑھ لیا ہے۔ ہمیشہ ہی اس کے اندازے ٹھیک نکلتے ہیں۔" وہ اسے کچن میں چائے بناتے دیکھ کے سوچے گئی۔
"بہتر ہو گا تم پڑھائی شروع کر دو۔" اس کی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی کہے گئی۔
"انسان کے فارغ وقت کا مصرف پڑھنے لکھنے سے بہتر اور کچھ نہیں ہوتا۔ ذہن کھلتا ہے۔ زندگی نئے نئے زاویوں میں، الگ الگ روپ میں نظر آتی ہے۔ اور زندگی گزارنے کے، اسے برتنے کے بہتر سے بہتر طریقے سمجھ میں آتے ہیں۔ تاریکیوں میں راستے سجھائی دیتے ہیں۔"
وہ اپنی بات کہتے کہتے خود ہی چپ ہو گئی۔ خیال آیا کہیں بات لیکچر میں نہ بدل جائے۔
اسے خبر نہیں تھی زینی، اس کی بات سننے کے بجائے اس کے ہاتھوں کو دیکھنے میں مگن ہے۔ اس کے ہاتھ بالکل ارحم کے جیسے تھے۔ نرم ملائم، گلابی پوریں، چمکتے ناخن۔ اس نے اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ تانیہ کا بخشا ہوا اعتماد ہی تھا جو وہ اتنی آسانی سے یہ بات کہہ گئی۔
"آپ کے ہاتھ بالکل ارحم کے جیسے ہیں۔" تانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں نا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آپ کے ہاتھ بالکل ان ہی کے جیسے۔۔۔"
"مجھے اس بات پر حیرانی نہیں ہے۔"
"پھر۔۔۔"
"مجھے حیرت ہے کہ تم نے ان کے ہاتھ اتنے غور سے کب دیکھے۔"
"غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تو خود ہی نظر آ جاتے ہیں۔" اس نے بات کرتے ہوئے کچن میں نگاہ دوڑائی۔
"کیوں۔ ایسی کیا بات ہے۔" اس نے چائے کا کپ زینی کی طرف بڑھایا۔
"بس گورے سفید، نرم ملائم، آپ جیسے۔" وہ دھیرے سے کہہ کر سپ لینے لگی۔ جبکہ تانیہ سوچ

رہی تھی۔ زینی کے منہ سے ارحم کو اپنی تعریف سن کے کیسا لگے گا۔ وہ یقیناً بہت خوش ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ زینی کے اپنے ہاتھ بھی بہت پیارے تھے۔

☆ ☆ ☆

نئی جگہ تھی۔ رات میں نیند کی تاخیر لازم تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو موسم خوشگوار تھا۔ ثانیہ کو سوتے دیکھتے وہ دبے قدموں باہر نکل آئی۔ ابر آلود موسم میں نمی کا احساس سردی سی پیدا کر رہا تھا۔

دیر سے آنکھ لگنے کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھ کر معمول کی طرح ناشتے کی تیاری کے لیے کچن میں آئی۔ چیزیں ڈھونڈنے میں مشکل تو ہوئی لیکن ثانیہ اتنی دیر سوئی رہی کہ جب اٹھنے کے بعد فریش ہو کے کچن میں آئی۔ تو تیار ناشتا اس کا منتظر تھا۔

"ارے تمہیں کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔"

"ضرورت کی کیا بات ہے۔ میں وہاں بھی تو کرتی تھی۔" ثانیہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔ زینی نے نوٹ نہیں کیا۔ لیکن جب وہ بے خیالی میں ایک ہی سلائس کو دانتوں سے کترے جا رہی تھی۔ تو اس سے رہا نہیں گیا۔

"ٹھیک سے لو نا۔ کیا بات ہے۔"

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے چونک کر چائے کا کپ ایک دم لبوں سے لگا لیا۔

"زینی میں تم سے ایک بات کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ سنجیدہ اور دو ٹوک تھا۔

"جی بولیں۔" وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

"اس گھر کو کبھی اس گھر سے کمپیئر کرنا نہ اس گھر جیسا سمجھنا۔ نہ یہاں کے مکین اتنے کم ظرف ہیں کہ تمہیں اپنا کر بھی پرایا بنائے رکھیں۔ نہ یہاں کی دیواریں اتنی کمزور ہیں کہ تمہاری حفاظت نہ کر سکیں۔" زینی گم سم سی گئی۔

"کیا آپ کو میرا کام کرنا برا لگا۔"

"نہیں۔ یہ کب کہا میں نے تم سے۔ کام کرو۔ لیکن اتنا ہی جتنا دل چاہے اور آرام سے کر سکو۔ امی اور پاپا آ جائیں گے تو میڈ بھی آ جائے گی۔ پھر آرام ہو گا۔ ستی اور۔۔۔"

"میں گھر کب جاؤں گی۔"

ثانیہ کی بات اور وہ بھرپور انگڑائی وہیں رہ گئی۔ جہاں پہ تھی۔

"کیا تمہیں یہاں اتنا برا لگا ہے۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔ لیکن جانا تو ہے نا۔"

"اور اگر میں تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں رکھنا چاہوں تو۔"

وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زینی گڑبڑا کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کوئی جواب نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے یہاں آئے چھ دن گزر چکے تھے۔ آج ویک اینڈ تھا۔ وہ روز کی طرح ثانیہ سے کافی دیر پہلے اٹھ کے لان میں صبح کے منظر سے لطف اندوز ہونے بیٹھی تھی۔ ذرا ہی دیر گزری تھی جب اس نے بیرونی دروازے سے ارحم کو آتے دیکھا۔

ٹریک سوٹ میں ملبوس پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ یعنی جاگنگ سے واپس آیا تھا۔

"ارے! یہ کب آئے۔" اس نے دل میں ایک انجانی سی خوشی محسوس کر کے حیرت سے سوچا۔ وہ سیدھا اس کے پاس آیا۔ اس نے فوراً ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ تم نے۔۔۔"

اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"پلیز بیٹھ جائیے۔"

وہ اتنی اچانک پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا۔ وہ بھی گھبراہٹ میں کھڑی ہو گئی۔

"اوہ ہاں۔ پلیز تم بھی بیٹھو۔"

کچھ دیر بیٹھ کر اس نے اپنے بے ترتیب تنفس کو قابو کیا۔ زینی منتظر سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم نے ثانی سے میرے ہاتھوں کی تعریف کی تھی۔" وہ اچانک ہی سر اٹھا کے بولا تھا۔

"جی۔" زینی کا منہ کھل گیا۔ بات تھی ہی اس قدر غیر متوقع اور اچانک ہی پوچھی۔

"کل رات میں جب آیا تو ثانی بتا رہی تھی۔" وہ اب ریلیکس ہو گیا تھا۔ چیئر سے پشت ٹکائے اس نے فرصت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

فقط چھ دن ماحول کی تبدیلی اس کے صبیح چہرے پہ سرخی بن کر چھلک رہی تھی۔ یا پھر یہ اس کی بات کا اثر تھا۔ نظروں کا ارتکاز تھا۔

"وہ میں نے کہا تھا کہ اس کے ہاتھ بالکل آپ کے ہاتھوں جیسے ہیں۔" وہ گڑبڑا کے یہی کہہ سکی۔

"اچھا کیسے؟" اس کے دل میں ایک دم ہی بچکانہ سی خواہش نے انگڑائی لی اس کے منہ سے سننے کی خواہش۔

"جیسے ثانیہ کے ہیں ویسے۔" اس کا لہجہ سادہ ہی تھا۔

"اور ثانیہ کے کیسے ہیں؟" وہ قدرے آگے کی طرف جھک آیا۔

"جیسے آپ کے۔" وہ قدرے شرما سی گئی۔ اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔ وہ ہنستا ہوا پیچھے ہو گیا۔

"آپ کب آئے؟" اس نے موضوع پلٹنا چاہا۔

"کل رات کو۔ تم سو گئی تھیں۔"

"کراچی میں سب کیسے ہیں۔" وہ اس سے نظریں ملا نہیں پا رہی تھی۔

"سب ہی کا پوچھنا ہے۔ یا کسی خاص کا۔" دل میں کسی نے چٹکی لی۔

"نہیں سب ہی کا پوچھ رہی ہوں۔ وہاں تو شادی کی گہما گہمی ہو گی۔" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ ارحم بہت دیر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں بہت کچھ تھا۔ عزت، محبت، ترس، پچھتاوا، الجھن۔

"تم جانا چاہتی ہو۔ وہاں۔" اس کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

زینی سے کچھ بولا نہیں گیا۔ حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ بس نفی میں سر ہی ہلا سکی۔

"تو کیوں پوچھتی ہو۔ ان لوگوں کے متعلق۔"

"وہ میرے۔۔۔ کون ہیں۔"

"تھے کبھی۔ اب نہیں ہیں۔"

"ان کا احسان ہے میرے اوپر۔" اس کے لہجے میں پسپائی تھی۔

"تو تم اپنے آپ کو اس طرح ڈی ویلیو کر کے ان کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتی ہو۔" اسے ارحم سے اس بات کی امید نہیں تھی۔

"کیا کرتیں اگر تم وہاں ہوتیں۔ ماؤں کی طرح کچن میں پسینہ بہاتیں۔ اور دسترخوان پر تمہارا نام تک نہ ہوتا۔ ماسیوں کی طرح برتن مانجھتیں اور سردی میں تمہارے پھٹے ہوئے ہاتھوں کے لیے کوئی لوشن نہیں دیتا۔ جوڑے ٹانکنے سے لے کر۔ میووں کے حصے بنانے تک ہر کام میں ہاتھ تمہارا ہوتا اور نام ان کا۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔" اس نے کہنا چاہا لیکن ارحم نے بات کاٹ دی۔

"مجھے پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ اور تمہیں بھی پتا ہے کہ میں بھی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم نہ بھی کرنا چاہتیں۔ تب بھی یہی کرنا پڑتا تمہیں اور تم اب بھی جانا چاہتی ہو وہاں۔"

اس کی آواز تھوڑی تیز ہوئی تو وہ خود ہی چپ ہو گیا۔

"حالات ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ پہلے سب بہت اچھے تھے مگر۔"

"اچھے تھے۔ اب نہیں ہیں اپنے آپ کو ڈی ویلیو مت کرو۔"

"میری بہت اچھی یادیں جڑی ہیں اس گھر سے۔" اس نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا۔

"یہاں رہو گی تو یہاں سے بھی جڑ جائیں گی۔"

ثانیہ کو آتے دیکھ کر اس نے بات سمیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے یقین ہے ثانیہ کو مکمل طور پر فارغ کر کے

لیکن کا چارج سنبھال لیا ہو گا۔ پلیز اپنے ہاتھ کے پراٹھے کھلاؤ۔ آج بہت دل چاہ رہا ہے۔" وہ بالکل بدلا ہوا لگنے لگا۔

وہ بہت دیر حیرت سے اس کی بے تکلفی کو سوچتی رہی۔

☼ ☼ ☼

بے بی باجی کی شادی بخیر و عافیت انجام کو پہنچی۔ ارحم ویک اینڈ گزار کے کراچی چلا گیا تھا۔ سوائے تانیہ اور خود اس کے گھر کے سبھی افراد نے شرکت کی۔

تانیہ نے اسے ان دنوں میں اسلام آباد خوب گھمایا اس کے دل میں کراچی نہ جا سکنے کا غم ہلکا پڑ گیا۔ یوں بھی اسے گھر کے افراد میں صرف دادی کی ہی یاد آتی تھی۔

باقی رہ گیا عاصم اس سے دلی تعلق تھا جو مزید مستحکم ہو سکتا تھا۔ لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ اس کا دل ان خوش گمانیوں کو جگہ نہ دے سکا۔

اس کے نکاح جیسا خوب صورت بندھن بھی شرمندگی بھرا کھٹا راگ ثابت ہوا۔ اور بات اب علیحدگی کی چل نکلی تھی۔

اس کی ذات اور کردار پر اس قدم سے لگ جانے والے داغ کی۔ کسی اور کو تو نہیں لیکن خود اسے بھی بس اتنی ہی فکر تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس لیے نہیں کہ اس کے مستقبل پر کوئی برے اثرات مرتب ہونے والے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ اس نے ساری زندگی اس گھر میں اسی طرح خدمتیں کر کے گزارنا فرض کر لیا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کا سوچتے ہیں اور وہ وہیں سے بیاہتی ہوئی اچھی لگتی ہے۔ انکل بھائی اور بھابھی نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے کر پہلے ہی اسے خرید لیا تھا۔ وہ مزید ان سے توقع کیا کرتی۔ یہ تو بدلتے حالات نے انہیں مجبور کر دیا۔ ورنہ دل صاف رکھنا تو اس کی صاف ستھری فطرت کا تقاضا تھا۔

"جو کچھ وہ میرے لیے کر سکتے تھے کیا۔ کیا میں ان کے لیے اتنی سی مشکل نہیں اٹھا سکتی۔"

شادی میں شرکت سے واپسی پر ارحم سے تفصیلات سنتے ہوئے بے ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"چلو میں مان لیتا ہوں تمہاری بات ٹھیک ہے۔" اس کا انداز کافی صلح جو تھا۔

"اس کے بعد کیا ہو گا۔ تمہیں یقین ہے چچا اور چچی تمہیں گھر بلائیں گے واپس۔"

"ظاہر ہے کیوں نہیں بلائیں گے۔"

"کیوں؟ انہوں نے تمہاری ساری زندگی کا ٹھیکہ لیا ہے کیا۔

بری لگی نا تمہیں میری بات۔ جب یہی بات وہ اس سے بھی برے انداز میں تم سے کہہ کر۔ تمہیں بلانے سے انکار کر دیں گے۔ تب تم کیا کرو گی۔" اس کی نظروں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔

"کیا انہوں نے آپ سے کہا ایسا۔" اس کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔

"مجھ سے نہیں کہا۔ مگر میں نے سن لیا۔ بتاؤ اب۔" وہ بے چینی سے انگلیاں مسلنے لگی۔

"اسی لیے میں کہتا ہوں زینی" اس نے آگے جھک کر اس کے ہاتھ تھام لیے بالکل اچانک۔ زینی جہاں کی تہاں رہ گئی۔ لیکن اس کی بات جاری تھی۔

"اپنے آپ کو اتنا ست کرو کہ وہ تمہیں ثابت نکل لیں سمجھیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" احساس بے بسی اس کی آنکھوں میں نمی بن کر جھلک اٹھا۔

"وہاں تمہارے ڈائیورس پیپرز تقریباً تیار ہیں۔ ان کے بننے سے پہلے خود عاصم سے مطالبہ کر دو۔ ڈیل ہے۔" وہ پھر سے پیچھے ہو گیا۔

"مگر میں کیسے؟" سوچ کر ہی اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

"کیوں نہیں۔ تم ہر کام کر سکتی ہو زینی صرف آزمائش شرط ہے۔"

"لیکن اس سے ہو گا کیا طلاق تو یوں بھی ہوتی ہے۔

اور یوں بھی۔" اس کا دل بیٹھ گیا۔

"کم از کم اپنی نظروں میں گرنے سے تو بچ جاؤ گی۔ سرخ رو ہو جاؤ گی۔" وہ غصے سے ایک دم زور سے بولا۔ وہ سہم سی گئی۔

"ان لوگوں کے آگے منوا لو گی اپنا آپ۔ جو جب چاہیں تمہیں ماسی بنا دیتے ہیں۔ اور جب چاہیں گھر کی اکلوتی بہو۔ اب اس عہدے سے نیچے اتر کے وہ دوبارہ ماسی بنائیں گے تم پسند کرو گی۔"

"وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا ان کے سوا کوئی ہے بھی تو نہیں۔" بے چارگی درد بن کر آنکھوں سے چھلک پڑی۔

"کیوں نہیں ہے کوئی تمہارا۔ میں ہوں تمہارا۔" وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ میں ہوں تمہارا۔ تانیہ ہے اور ہم سب تمہارے ہیں۔ تم ایک بار دل سے سمجھو۔ دماغ لگا کے سوچو تو سہی۔ تم اتنی اکیلی نہیں جتنا خود کو سمجھ بیٹھی ہو۔ میری بات پر غور ضرور کرنا۔" گہری سانس لے کر اس سے کہتا ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ وہیں بیٹھی رہی۔ دل میں اک انوکھا سا درد کروٹیں لے رہا تھا۔ درد بے لذت۔ ایک نام نہاد بندھن جسے خوشیوں کا ضامن کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہزار بوجھ ثابت ہوا۔ جسے نہ اس سے پوچھ کے جوڑا گیا۔ اور نہ ختم کرتے وقت خاطر میں لایا گیا۔

"میری ہی زندگی کے فیصلے اور میں ہی کہیں شامل نہیں۔" عجیب دکھ بھری سوچ تھی۔

اور یہ جو اپنائیت کا دعوا کر گیا ہے۔ اس دعوے کو کہاں تک نبھایا جائے گا۔ یہ سوچنا تو بہت دور کی بات تھی۔ پہلے وہ اسے تو دیکھے جو اس کے جملہ حقوق اپنی مرضی سے اپنے نام کروا کے اب اپنی مرضی سے دستبردار ہو رہا تھا۔ دل نے کچھ فوری فیصلے اچانک ہی کر لیے تھے۔ اب عمل پیرا ہونے کے لیے کل تک کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

تانیہ گھر پر نہیں تھی۔ وہ اک اک قدم گنتی ارحم کے کمرے تک آئی تھی۔

فیصلہ کرنا ہمیشہ ہی آسان نہیں ہوتا اور اس پر عمل کرنا تو اور بھی مشکل۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ آپ نے کسی اور تو کیا خود اپنی ذات کے بارے میں بھی زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ نہ کیا ہو۔ ارحم نے خاموشی سے اس کا مدعا سن کر عاصم کا نمبر ڈائل کیا اور سیل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"میں بات کر رہی ہوں زینب۔"

"ہاں زینب۔ کیسی ہو تم۔" عاصم کی آواز میں تھکن تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔" اسے لگا بات کرتے کرتے رات سے صبح بھی ہو جائے تو شاید وہ اسے اپنے مطلب و مقصد سے آگاہ نہیں کر پائے گی۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے زینی۔" عاصم نے گہری سانس لی۔

"مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔" ارحم اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اٹھنا چاہتا تھا لیکن تھم کے رہ گیا۔ زینی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اس کی آنکھوں

میں خوف تھا۔ درخواست تھی۔ ارحم کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

"کہو پہلے تم۔" ارحم نے اس کا ہاتھ تھام کے دونوں ہاتھوں میں دبالیا۔

"نہیں آپ کہیے۔ میں سن رہی ہوں۔ یوں بھی میری بات زیادہ لمبی نہیں ہوگی۔" اس نے اپنے آپ کو مضبوط ہوتے محسوس کیا۔ لہجے میں روانی آگئی۔

"میں کیا کہوں زنی۔ سمجھ میں نہیں آتا کن الفاظ میں تم سے معافی مانگوں میں۔"

"آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے تمہارا بہت نقصان کردیا۔"

"آپ اس سے زیادہ بھی کرسکتے تھے۔"

ارحم اس کے اک اک نقش کو نگاہوں میں جذب کرتا اس کے لہجے کی ہمواریت کو سراہ رہا تھا۔

"کاش میں کسی طرح اپنے اور گھر والوں کے رویے کی۔ ان کی غلطیوں کی تلافی کی کوئی صورت نکال پاتا۔"

"ناقابل تلافی تو اب بھی نہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ زنی کو اس کی حدت اپنے دل تک محسوس ہوئی۔

بے شک پانے کے بعد کھونے کے اس عمل میں دونوں کا خسارہ ایک برابر کا تھا۔ بیانگ دہل تو نہیں۔ لیکن راہ الفت کی مسافرت کا اقرار تو دونوں کرتے تھے۔ چپکے چپکے ہی سہی۔

"مجھے۔ مجھے معاف کردو زنی پلیز۔"

"مجھے طلاق دے دیجیے عاصم۔" اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ آنکھوں میں تھمے آنسو ایک دم ہی بہہ نکلے۔

"کیا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو زنی۔ تم مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم کہہ رہی ہو۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"میں کہہ رہی ہوں نا اس لیے یقین نہیں آرہا۔ لیکن جب سب کے کہنے پر آپ کو ایسا کرنا پڑے گا تب بھی تو حقیقت یہی ہوگی۔" دوسری طرف خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد وہ بولا تو اس کی آواز بکھری ہوئی تھی۔

"تم ایسا نہیں کرسکتیں زنی۔"

"کر نہیں سکتی تھی۔ مگر اب کررہی ہوں۔"

"کیوں کررہی ہو زنی۔ کیوں کہہ رہی ہو ایسا۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"مجھے صرف اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں جو ایک بار آپ سے ملا کر بھی آپ کا نہ کرپائی وہ قسمت آگے مجھے کیا کیا دکھائے گی۔ مجھے منظور نہیں۔ میں سہہ نہیں سکتی۔" اسے لگا وہ ضبط کھودے گی۔

"اور اس سے پہلے کہ یہ نوبت آئے۔ آپ کو میری وجہ سے مزید کسی کی باتیں سننی پڑیں یا بے بی باجی کو کوئی اور تکلیف اٹھانی پڑے۔ یہ مجھے گوارا نہیں ہوگا۔ تو بہتر ہوگا اس معاملے کو جتنی جلدی ہوسکے ختم کردیں۔" اس کی سانس پھول سی گئی۔

ارحم کی گرم ہتھیلیوں میں بھینچا اپنا ٹھنڈا ہاتھ نکال کے اس نے چہرے پر سے پسینہ صاف کرنا چاہا تو پتا چلا کہ چہرو پسینے سے نہیں آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ اور لائن کب کی بے جان ہوچکی ہے۔

اس نے موبائل ارحم کی طرف بڑھاتے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"تم نے مجھے جانے سے روکا کیوں۔ میرے سامنے بات کرنی ضروری تھی کیا۔"

"ہاں کیونکہ عزت نفس کی حفاظت کا سب سے پہلا سبق بھی تو آپ نے ہی سکھایا تھا نا۔"

"میں تمہیں زندگی گزارنے کے اور بھی کچھ اسباق پڑھانا چاہتا ہوں۔ اگر تم اعتراض نہ کرو تو۔" اس کی گمبھیر آواز جذبوں سے بوجھل ہوئی۔

"یہ زبان کچھ نئی ہے۔ سمجھنے میں دن لگیں گے۔" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"کیا سیکھنے پر اعتراض نہیں۔"

نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ۔ ضبط کی کوشش میں ناکام ہوکر پھر سے رودی۔

نہ جانے کیوں۔

لے سے بچپن سے ہی حسین، امیر اور ماڈرن نظر آنے کا خبط تھا۔ کوئی بھی شوق جو انتہائی شکل اختیار کرلے وہ خبط کے زمرے میں ہی آتا ہے سو وہ یعنی زرینہ تمیزالدین بچپن سے اب تک اس خبط سے چھٹکارا حاصل نہ کرپائی تھی حسن تو خیر اللہ کی دین ہے اور وہ حسین نہ تھی اس بات سے باخوبی آگاہ بھی لیکن امیر اور ماڈرن نظر آنے کے لیے حسین ہونا بھی بہت ضروری ہے وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئی۔

اس کی بڑی بہنیں بھی خاص خوبصورت نہ تھیں مگر اپنی صورت پر صابر و شاکر تھیں جو کپڑا اماں لا دیتیں وہ ہی گھر میں سی کر پہن لیتیں صرف وہ تھی جو کبھی اماں کی پسند کا کپڑا پہننے پر تیار نہ ہوتی ضد کرکے اماں کے ساتھ خود بازار جاتی ٹی وی دیکھ کر اسے تو اندازہ ہو ہی جاتا تھا کہ کون سے رنگ فیشن میں ان ہیں سو ویسے ہی کپڑے خریدتی پھر گھر میں خود سینے یا بہنوں سے سلوانے کے بجائے محلے کی درزن کا رخ کرتی۔ اخباروں کے تراشے ساتھ لے کر جاتی محلے کی درزن زرینہ کی فرمائشیں سن کر عاجز آجاتی وہ بے شک سلائی میں مہارت رکھتی تھی مگر عام سیدھے سادے کپڑے سینے کی عادت تھی جیسے فیشن ایبل کپڑے زرینہ سلوانا چاہتی تھی انہیں سینے میں بہت وقت درکار ہوتا مگر زرینہ عام سوٹ کی سلائی سے تیس چالیس روپے فالتو دے کر اسے رام کر ہی لیتی حسب پسند سوٹ سل جاتا مگر جب وہ زرینہ کے تن پر سجتا تو اتنا ہی معمولی لگتا جتنی زرینہ خود بلکہ الٹا بہن بھائیوں کے مذاق کا نشانہ بنا دیتا حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ اس کے آس پاس رہنے والے فیشن سے بالکل ہی ناواقف تھے۔

محلے میں اس کی عمر کی لڑکیاں اپنے اپنے وسائل کے مطابق فیشن کرتی ہی تھیں اسکول میں بہت سی ساتھی کلاس فیلوز بھی اس کی طرح شوقین مزاج تھیں مگر فرق یہ تھا کہ وہ اگر فیشن کرتیں تو فیشن ایبل لگتی بھی تھیں مگر زرینہ کوشش کے باوجود ماڈرن نہ لگ پاتی بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کا عرصہ اسی کوشش میں گزرا کہ کسی طرح اپنے حلیے اور شکل و صورت سے وہ امیر اور ماڈرن لگ جائے تین کریموں کے متواتر استعمال سے چہرے کی سانولی رنگت تو قدرے صاف ہوگئی تھی مگر صرف سانولا رنگ ہی تو ماڈرن بننے کی راہ میں رکاوٹ نہ تھا۔ ٹی وی پر، اخبار، رسالوں میں بہت سی ماڈلز سانولی رنگت کی بھی ہوتی تھیں اس کے باوجود بے تحاشا فیشن ایبل اور ماڈرن لگتیں اس کی شخصیت میں ہی کوئی ایسی کمی تھی کہ وہ شکل سے بہت بے چاری اور غریب سی لگتی۔

شادی کا وقت آیا تب بھی اس کے دل میں ایک ہی ارمان تھا کہ اس کا میاں بھلے بہت امیر نہ ہو مگر شکل و صورت اور حلیے سے امیر اور ماڈرن سا لگتا ہو مگر حجلہ عروسی میں آنے کے بعد جب تمیزالدین نے اپنا سہرا اور زرینہ کا گھونگٹ اٹھایا تو زرینہ کا یہ ارمان بھی مٹی میں مل گیا۔ معمولی صورت کا تمیزالدین جس کی مین بازار میں بڑی چلتی ہوئی ہوزری کی دکان تھی مگر شکل سے وہ بھی زرینہ کی طرح بہت بے چارا اور غریب سا لگتا تھا۔ زرینہ نے بجھے دل کے ساتھ تمیزالدین کی سنگت میں زندگی کا آغاز کیا تھا مگر اچھا پیسہ اور اپنا خاندان عورت کو اچھا لگتا ہے اور پھر تمیزالدین نے زرینہ کو اتنی محبت دی کہ کم از کم اس معاملے میں زرینہ کا ملال ختم ہوگیا مگر دل میں دبی خواہش اب بھی زندہ تھی۔

امیر اور ماڈرن نظر آنے کی خواہش بلکہ اب تو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے پیسہ بھی وافر تھا۔ سسرال میں تمیزالدین کے علاوہ ایک بوڑھی اور بے ضرر سی ساس تھیں جو بہو کے گھر آتے ہی اپنے تمام اختیارات اسے سونپ کر خود جائے نماز، تسبیح اور ٹی وی تک محدود ہوگئی تھیں۔ تمیزالدین ہر ماہ خرچے کے نام پر ایک معقول رقم زرینہ کے ہاتھ میں تھماتا۔ زرینہ نہایت کفایت شعاری سے گھر کا خرچ چلاتی تاکہ پس انداز کی ہوئی رقم سے اپنی فضول خرچیاں کرسکے۔ پہلے درزن سے کپڑے سلواتی تھی اب درزی سے سلوانے شروع کردیے بازار جاتی جو بھی مہنگے کپڑے پر ہاتھ رکھتی مگر کیا کیا جائے کہ اکثر دکاندار کپڑے کا وہ تھان کھولنے سے ہی انکاری ہوجاتے۔

"باجی یہ آپ کے مطلب کا نہیں وہ والا دیکھیں ڈیزائن اس سے ملتا جلتا ہے مگر ریٹ مناسب ہیں۔"

زرینہ کا جی جل کر خاک ہوجاتا۔ ایسے بہت سے تجربات کے باوجود وہ اپنے شوق سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوئی یا نہ ہوسکی۔ بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ارمغان، مشہود اور پھر تیمور، بچے دیکھنے میں جیسے تھے مگر زرینہ نے کم از کم نام تو ماڈرن رکھے تھے۔ اب اس کی توجہ کا مرکز اپنے تینوں بچے تھے۔

ان کے لیے نت نئے کھانے بنانا، ماڈرن سا پہناوا پہنانا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا کہ زرینہ کی عقل میں کم از کم یہ بات سمائی تھی کہ کٹ پٹ انگریزی بولنے اور ماڈرن نظر آنے کا آپس میں گہرا تعلق ہے اب زرینہ کو خود پر توجہ دینے کا ذرا کم ہی وقت ملتا دل میں چھپے شوق کی دبی سی چنگاری صرف اس وقت بھڑکتی جب خاندان، برادری میں کوئی خوشی کی ہوتی اور زرینہ کو بھی اس میں شرکت کرنا پڑتی۔ بھاگتی دوڑتی مصروف زندگی میں اگرچہ ایسے مواقع کم ہی آتے مگر جب بھی آتے زرینہ سب سے ممتاز نظر آنے کی کوشش میں ہلکان ہوجاتی۔

آج کل بھی ایک شادی کا کارڈ زرینہ کی پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا اس کے چچا زاد بھائی کی شادی تھی۔ وہ دن پہلے اس کے چچی چچا شادی کا کارڈ اور شرکت پر اصرار کرکے گئے تھے بارات دوسرے شہر جانی تھی۔ تمیزالدین نے تو بارات کے ساتھ جانے سے معذرت کرلی تھی کہ وہ جمعہ کے علاوہ اپنی دکان بند نہ کرتا تھا۔ بارات میں جانے کا زرینہ کا بھی خاص ارادہ نہ تھا کہ دور کے سفر سے اسے الجھن ہوتی تھی مگر پھر اس کی بڑی بہن کا فون آگیا۔

"سنا ہے چچا نے بہت امیر کبیر لوگوں میں رشتہ داری جوڑی ہے، دلہن بھی بہت خوبصورت اور ماڈرن ہے لیکن دیکھ لینا، پچھتائیں گے ایسے لوگوں میں رشتہ جوڑ کر بشارت نے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں چچا چچی کے دماغ ہی عرش پر پہنچ گئے ورنہ خاندان میں کتنی کنواری لڑکیاں تھیں۔"

بتول باجی جانے کیا کہہ رہی تھیں مگر زرینہ کا دھیان ان کے بیان کے ابتدائی حصے میں ہی اٹک گیا تھا۔

"امیر کبیر اور ماڈرن لوگ تو ہم کسی سے کم ہیں کیا۔ آپ بھلے بارات میں جائیں نہ جائیں میں تو ضرور جاؤں گی۔" فیصلہ اچانک ہوگیا تھا۔

بہت عرصے بعد اس نے تمیزالدین سے اپنی شاپنگ کے لیے اضافی پیسے مانگے تھے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اس نے منہ مانگی رقم زرینہ کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ زرینہ نے فوراً اپنی پڑوسن کو ساتھ لیا اور بازار کی راہ لی ثریا کے ساتھ زرینہ کے مثالی تعلقات تھے وہ بھی خوشی خوشی زرینہ کو شاپنگ کروانے ساتھ چل پڑی۔ خوبصورت سوٹ، میچنگ جوتا، ہینڈ بیگ، میک اپ کا سامان اور شادی میں دیئے جانے والا گفٹ شاپنگ تو مکمل ہوگئی مگر زرینہ کو گھر آنے کے بعد بھی ادھورے پن کا احساس ستاتا رہا پھر اس کی نگاہ ثریا کی کلائیوں پر پڑی جگر جگر کرتی نئی نکور سونے کی چار چوڑیاں ثریا کا میاں دو سال پہلے کویت گیا تھا۔ بیوی بچوں سے ملنے خود تو ابھی تک نہ آیا تھا مگر کسی آنے والے کے ہاتھ ثریا کی چوڑیاں بنوا کر بھیج دی تھیں کہ ثریا کا زیور بیچ کر ہی اس نے کویت کا رخ کیا تھا۔

زرینہ کے من کو ثریا کی یہ اسٹائلش سی چوڑیاں بہت بھاتی تھیں۔ حالانکہ اس کے پاس سونے کے زیورات کی کمی نہ تھی۔ جہیز میں یہ بڑا سا رانی ہار تھا تو بری میں بھی جھومر، ٹیکہ، نتھ، گلوبند پورے پچھے تولے سونا تھا۔ نہیں تھیں تو صرف چوڑیاں ہی نہ تھیں۔ اس نے کئی بار تمیزالدین سے کہا کہ وہ جہیز یا بری کا زیور تڑوا کر اسے چوڑیاں بنوا دے۔ سونے کے ہار، بندے پہننے کا اب فیشن ہی کہاں تھا۔ ماڈرن عورتیں جیولری کے نام پر لاکٹ سیٹ، بریسلٹ یا چوڑیاں پہنتی تھیں تمیزالدین بنانا یا زیور تڑوانے کے حق میں نہ تھا۔ نئی چوڑیاں بنوا کر دینے کے البتہ کئی بار وعدے کیے جو ابھی

تک وفا نہ ہو سکے تھے اور اب تو سونے کا ریٹ ہی آسمان کو چھو رہا تھا۔

زرینہ نے حسرت ہوئی یہ فرمائش ہی چھوڑ دی تھی مگر ثریا کے ہاتھ میں چوڑیاں دیکھ کر آج اسے اپنی بھولی بسری فرمائش اور تمیز الدین کی ہٹ دھرمی یاد آ گئی تھی۔

"کتنی خوبصورت ہیں تیری چوڑیاں ثریا میں نے اتنی بار تمیز الدین سے کہا کہ میں بھی اپنا سیٹ تڑوا کر چوڑیاں بنوا لیتی ہوں مگر ہاں کر کے دیا کہتا تھا سنار کاٹ پیٹ میں اتنا سونا رکھ لیتے ہیں میں تجھے نئی چوڑیاں بنوا دوں گا۔

اب اگر چوڑیاں ہو تیں تو مجھے یوں کانچ کی چوڑیوں سے کلائیاں نہ بھرنی پڑتیں سو سو طعنے آتے ہیں خاندان برادری میں خوشی غمی کے مگر تمیز الدین کو کوئی احساس ہی نہیں۔" زرینہ کو آج تمیز الدین پر خوب ہی تاؤ چڑھ رہا تھا۔

"لے یہ بھی کوئی بات ہے زرینہ' تیری چوڑیاں جب بنتی ہوں گی بن جائیں گی تو شادی میں میری چوڑیاں پہن کر چلی جا۔" ثریا نے فوراً" فراخ دلی سے پیشکش کی۔

"میں ایسے کیسے تیری چوڑیاں پہن جاؤں۔" زرینہ نے کچھ دیر کے تذبذب کے بعد انکار کیا تھا۔

"تو ایک' دو دن میں میری چوڑیاں گھس جائیں گی کیا۔ شادی ولیمہ کے فنکشن بھگتا کے پھر کر دینا واپس۔" ثریا کی آفر برقرار تھی' کچھ ہچکچاہٹ کے بعد زرینہ نے پیشکش قبول کر لی۔ ثریا نے فوراً" ہی اپنی کلائی میں سے چوڑیاں اتار کر زرینہ کو پہنانی چاہی تھیں۔

دونوں کے ڈیل ڈول میں واضح فرق تھا۔ ثریا دبلی پتلی اسمارٹ سی عورت تھی جبکہ بچوں کی پیدائش کے بعد زرینہ خاصی فربہ ہو گئی تھی۔ چوڑیوں کا سائز زرینہ کے حساب سے خاصا چھوٹا تھا تاہم ثریا نے جیل ' لوشن لگا کر کسی نہ کسی طرح چوڑیاں زرینہ کی کلائی میں پھنسا ہی دیں اور رات کو جب تمیز الدین دکان بند کر کے گھر لوٹا تو بیوی کی کلائیوں میں پڑوسن کی چوڑیاں دیکھ کر خوب ہی خفا ہوا۔

ویسے تو تمیز الدین ٹھنڈے مزاج کا بندہ تھا لیکن اگر کبھی کسی بات پر غصہ آتا تو خوب ہی غصہ آتا اسے غصے میں آتا دیکھ کر زرینہ کو بھی غصہ آ گیا اگر وہ اسے چوڑیاں بنوا دیتا تو کاہے کو وہ پڑوسن کا احسان لیتی دونوں میاں بیوی کی خوب ہی جھڑپ ہوئی بوڑھی ساس کو ڈرامہ ادھورا چھوڑ کر بیچ بچاؤ میں سیز فائر کروانا پڑا۔ تمیز الدین چپ تو ہو گیا مگر خفگی اس کے چہرے سے عیاں تھی زرینہ کو البتہ اس کی خفگی سے چنداں سروکار نہ تھا اس کی سارا توجہ ' سارا دھیان اپنی تیاریوں کی جانب تھا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب زرینہ کے چچا زاد بھائی کی بارات دوسرے شہر روانہ ہونی تھی۔ زرینہ بن ٹھن کر چچا کے گھر پہنچی تینوں بچوں کو اسکول سے چھٹی کروا کر ساتھ لے جانا اس نے ضروری نہ سمجھا تھا۔ چھ سات گاڑیاں اور ایک بڑی بس میں سوار ہو کر بارات روانہ ہوئی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی زاد بہن کے پاس بیٹھی گپیں لڑا رہی تھی میکے کے سب ہی رشتہ دار موجود تھے۔ ہنستے مسکراتے 'باتیں کرتے سفر جاری تھا۔ دلہن کے شہر کی حدود شروع ہونے ہی والی تھیں کہ اچانک ایک ناگہانی صورت حال رونما ہو گئی۔ دو چھابڑی فروش جو جانے کب بس میں سوار ہوئے تھے اب پستول تانے کھڑے تھے بس میں سوار سب باراتیوں کے رنگ فق ہو گئے تھے۔ خود زرینہ کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے حلق خشک اور ہاتھ پاؤں بے جان ' پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بارات کے ساتھ گاڑیاں خاصی آگے جا چکی تھیں ڈاکوؤں نے بس روکنے کے بجائے ڈرائیور کو بس چلائے رکھنے کا حکم دیا۔ سڑک بے شک سنسان تھی۔ شہر شروع ہونے سے پہلے مضافات کا علاقہ تھا لیکن پھر بھی دن دہاڑے ڈکیتی کی عجب واردات تھی۔ زرینہ سمیت کسی بھی باراتی کو زندگی میں کسی ایسے موقع کا



سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ ڈاکو چلتی بس میں جلدی جلدی اپنی کارروائی نبٹا رہے تھے۔ مردوں سے نقدی اور موبائل فون لے کر عورتوں سے زیور لوٹ رہے' سب لوگ سہم کر بلا چوں چراں اپنے ساز و سامان ڈاکوؤں کے حوالے کر رہے تھے زرینہ کی باری بھی بس آیا ہی چاہتی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف اور حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

پرائی چوڑیاں باہوں میں سجائے کس بے فکری سے وہ بس میں سوار ہوئی تھی اور تمیز الدین تو پہلے ہی اتنا خفا ہو رہا تھا مانگے کی چیز پہننے پر اور جب یہ امانت کھونے کے بعد وہ واپس گھر جائے گی تو تمیز الدین کا رد عمل کتنا خوفناک ہو گا اور ثریا' ثریا کے متعلق تو اس نے ابھی تک سوچا ہی نہ تھا۔ اس کے میاں کی کمائی کا پہلا تحفہ کتنے خلوص سے ثریا نے زرینہ کو چوڑیاں پہنائی تھیں اس کا خلوص اسے کتنا مہنگا پڑے گا اور مہنگا تو آج کل سونا بھی بہت تھا وہ اگر چاہے گی بھی تو ثریا کا نقصان فوری طور پر پورا نہ کر پائے گی۔

ہائے اللہ کیا بنے گا میرے ساتھ ڈاکوؤں کی دہشت اپنی جگہ مگر اس کے ماؤف ہوتے ذہن نے پھر بھی کتنا کچھ سوچ لیا۔ اور پھر آخر کار ایک ڈاکو اس تک بھی پہنچ گیا تھا۔

"مائی چوڑیاں اتار فوراً"۔" اس نے پستول دکھاتے ہوئے حکم دیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو زرینہ اس طرز تخاطب پر اس سے الجھ پڑتی مگر اب سر ہلاتے ہوئے اس نے فوراً" ہی حکم کی تعمیل کرنا چاہی لیکن وہ چوڑیاں جو ثریا نے اس کے ہاتھوں پر لوشن مل مل کر اتنی مشکل سے چڑھائی تھیں وہ بیچاری ان ہاتھوں سے اتنی عجلت میں اتارنا کب ممکن تھا۔ ڈاکو جھنجلائے ہوئے انداز میں وہیں اس کے سر پر پستول تانے کھڑا رہا اتنے ہی میں پیچھے سے اس کا ساتھی بھی آ گیا۔

"اوئے بشیرے کیا بات ہے کیوں اٹک گیا؟"

"چوڑیاں نہیں اتر رہیں۔" بشیرے نے جھنجلا کر بتایا دوسرے ڈاکو نے ایک نگاہ زرینہ کے چہرے پر ڈالی پھر اکتاہٹ بھرے لہجے میں ساتھی کو مخاطب کیا۔

"او چھڈ یار شکل تو دیکھ لیا کر ایسی مسکین صورت میں سونا پہن سکتی ہیں کیا نقلی چوڑیاں پہن کر شوبازی ہو رہی ہے آگے چل۔" اس نے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔ ڈاکو سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

زرینہ کے سینے میں کب سے رکی سانس خارج ہوئی تھی۔ تن پر اٹھارہ سو کا جوڑا اور پاؤں میں آٹھ سو کا جوتا پہننے کے باوجود ڈاکوؤں کو زرینہ کم حیثیت لگی تھی تو یہ اس کی قسمت مگر آج وہ اپنی قسمت پر شاکی ہونے کے بجائے شاکر تھی۔ چند منٹوں میں ہی ڈاکو کمانڈو ایکشن کی طرز پر بس لوٹ کر بس سے اتر گئے تھے سب لوگ بے یقینی اور سوگ کی کیفیت میں بیٹھے تھے دلہن کا شہر آنے والا تھا مگر کیسا سانحہ ہو گیا تھا۔ سب اپنے اپنے نقصانات کا تخمینہ لگا رہے تھے۔ زرینہ نے ایک نگاہ آس پاس کے لوگوں کے لٹکے چہروں پر ڈالی اور پھر سر جھکاتے ہوئے بالکل چپکے سے اپنے بیگ میں سے شیشہ نکال کر ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک اور تہہ جمانے لگی۔ بارات میں شامل سب عورتوں میں سب سے زیادہ ماڈرن نظر آنے کی اس کی خواہش اب بھی برقرار تھی۔

☆ ☆

سلویٰ علی بٹ

فیصل آباد شہر سے چار' پانچ کلو میٹر دور ایک گاؤں انگریز حکومت سے قائم تھا (جس کے نام کی وضاحت چند اندیشوں کی بنا پر ضروری نہیں) بیتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر یہ گاؤں تقریباً" قصبے میں بدل گیا۔ جہاں زیادہ تر کھاتے پیتے' وڈیرے ٹائپ زمین دار اور پڑھا لکھا طبقہ رہتا تھا۔ اس ترقی پذیر قصبے میں ضروریات زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔

قصبے کی بڑی مرکزی پکی سڑک جہاں لاریاں رکتی اور سواریاں اٹھاتی تھیں سے بائیں طرف کوئی کینال بھر ریلوے لائن کی پٹڑی بچھی تھی' اس پٹڑی کے ایک طرف مرکزی سڑک کے اس پار قصبہ آباد تھا تو پٹڑی کی دوسری جانب کچی سڑک نیچے کی طرف اتر جاتی اس کچے رستے کے ختم ہوتے ہی پانچ' سات گلیوں پر مشتمل غریب لوگوں کے اینٹوں سے بنے گھر تھے۔ قصبے کے لوگ اسے کچی آبادی کے نام سے پکارتے تھے اور اس بستی کا رخ کرنے سے بھی گھبراتے۔ کیونکہ چند گھروں کے علاوہ پیچھے سارا ویرانہ تھا یا گندم' مکئی' کپاس اور گنے وغیرہ کی بے شمار فصلیں۔ جبکہ اس کے شمال اور مغرب میں ڈیڑھ دو کلو میٹر کے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے تھے۔ اس بستی میں بسنے والے سارے گھر عیسائیوں کے تھے۔ جو اپنے آبائی پیشے بھٹہ مشقت' راج مزدوری سے منسلک تھے۔

سن 98ء یا 99ء میں جب شہروں سے بھینسوں کا رخ گاؤں کی طرف موڑا گیا تو گجر برادری کی اکثریت نے اس آبادی میں آباد ہونا شروع کر دیا' جہاں رات کو گنے کے کھیتوں میں گیدڑ بولتے اور گندے نالے کے پیپل کے پرانے درخت کی اونچی شاخ پر الو بولی لگاتا تو بچے سوتے میں ہڑبڑا کر رونے لگتے۔ عصر کے بعد جب سرمئی سا اندھیرا چاروں اور گھیرنے لگتا کمروں کے پرانے سیلن زدہ لکڑی کے کواڑ سختی سے بند ہو جاتے۔ ایسے میں جب گجروں نے یہاں پڑاؤ ڈالے تو ان کی دیکھا دیکھی غریب غرباء نے بھی اپنی جمع پونجی نکال لی' کچھ ادھار کیا یا قسطوں کے وعدے۔ اپنی استطاعت کے مطابق ڈھائی سے پانچ مرلہ تک کے پلاٹ خریدنا شروع کر دیے' ہر رنگ' نسل' مذہب' عقیدے اور طبقے کے رنگ برنگے لوگوں سے جلد ہی گمنام بستی گلیوں سے محلوں میں بدلی اور دس سال کے مختصر سے عرصہ میں چھ' سات سو گھروں میں مشتمل ایک علاقے کی صورت اختیار کر گئی۔

عیسائیوں کی تو روزی روٹی بھٹے سے منسلک رہی' جبکہ مسلمانوں کے کرنے کو یہاں بھی بے شمار کام موجود تھے۔ مزدوری' سبزی کا ٹھیلے والے' پرچون' دکان دار' حجام' درزی' گدھا گاڑی' تندور غرض یہ کہ زندگی اپنی پوری رونق کے ساتھ رواں تھی۔ پھر راج مزدور دو جمع دو چار کا حساب کتاب نہیں لگاتا' وہ منہ اندھیرے رب کو یاد کر کے رزق کی تلاش میں نکلتا ہے۔ شام تک جو کمایا رات کو کھانے کے بعد بچی ہوئی تو ہاتھ پھیر کر ڈکار لی اور صبح دیر سے آنکھ کھلنے کے خدشے سے جلد سو گیا' نہ تو اسے ساری رات خواب ستاتے ہیں' نہ ہی اگلے دن کی بے روزگاری کا ڈر اس کی نیند حرام کرتا ہے۔

رہ گئیں عورتیں' تو ان کے پاس صبح سے شام کرنے کو لامتناہی جھنجٹ موجود تھے' چونکہ اس علاقے میں ابھی تک گیس کی سہولت میسر نہیں تھی اسی لیے تقریباً" ہر گھر کی عورت گائے' بھینس کا گوبر اٹھاتی اس کے اپلے تھاپتی سوکھنے پر چولہے میں ایندھن جھونکتی۔ ارد گرد کئی خالی پلاٹ عورتوں نے اسی مقصد کے لیے بغیر رجسٹری کے اپنے نام الاٹ کیے ہوئے تھے جہاں وہ جگہ کی گنجائش کے حساب سے اپنے اپلے تھاپتی اور اگر کوئی دوسری عورت تھوڑی سی جگہ بھی اپنی طرف کھسکا لیتی تو وہ تماشا لگتا کہ ایک میلے کا سا سماں ہو جاتا۔ گندی گالیوں کا تبادلہ خوب زور و شور سے گلا پھاڑ پھاڑ کر کیا جاتا' طعنے تشنے دیے جاتے اور کبھی کبھار تو نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی۔

گرمیوں میں گندم کی کٹائی' سے اکٹھے کرنا' کپاس کی چنائی' لکڑیاں کاٹنا' بکریاں چرانا' فصلوں سے چھپ کے چوری کرنا' ایک دوسری سے سالن مانگنا' جو میں نکالنا' سلائی کڑھائی' فطرتا" چغل خوری یہ سارے دھندے یہاں کی عورت کے روز کا معمول تھے۔

وہ سخت گرمیوں کے دن تھے۔ گرم اور لمبے دن گاؤں میں بسنے والے لوگوں کے لیے ہمیشہ ہی ناپسندیدہ ہوتے ہیں' ان کے روز مرہ کے معمول واضح تبدیلی و تغیر کا شکار ہو جاتے ہیں' جبکہ یہ لوگ عادی زندگی گزارتے ہیں۔ ان دنوں بھی ہر چہرہ گرمی سے بے زار' عورتیں لڑنے بھڑنے سے اکتا کر پنکھے کے نیچے بیٹھنے پر مجبور تھیں۔ مردوں کی شام میں جمنے والی چوپال میں

بھی خاموشی کا ذریعہ تھا۔ ایسے میں جب ہر کوئی اپنے دنوں کے حساب سے اپنے خیالات اور حالات کے مطابق نئی مصروفیت ڈھونڈنے میں سرگرداں تھا، محلے میں تعمیر ہونے والے دس مرلے کے دو منزلہ اونچے تھڑے والے مکان نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

بجلی آباد کے غریب غرباء کو قیمتی پتھر سے تعمیر ہوتا وہ مکان کسی ممتاز محل سے کم نہ لگتا۔ ہر کوئی زیر تعمیر مکان کے پاس سے گزرتے ہوئے کبھی رک کر چلتے چلتے حسد بھری نگاہ ضرور ڈالتا۔ چند تجسس کے مارے منچلے وارے بھی ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر وہ بھی ٹھیک طرح سے کچھ نہیں جانتا تھا، اس علاقے کے رہائشیوں میں ایک گھر ہمارا بھی تھا، جنہیں اپنے کام سے غرض ہونے کی وجہ سے یہ خبر بھی ذرا تاخیر سے ملی تب تک پچھلی رات وہ مکان ایک گھر کی صورت آباد ہو چکا تھا۔

"عورت تو ایک ہی تھی البتہ مرد تین تھے۔"

اسکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی میرے کان میں پہلا تبصرہ ثریا دائی کا پڑا۔

"سامان تو رات کو ہی آگیا تھا، بزرگ بھی کوئی نظر نہیں آیا۔" میرے سلام کا جواب دیتے کسی اور سے بھی ٹکڑا جوڑا۔

"پتا نہیں بچے ہیں کہ نہیں، ساتھ تو کوئی نہیں تھا۔" ثریا دائی کو ہر نئے آنے والے کے بچوں کی فکر خوب ستاتی تھی، اتنی دعائیں کوئی ممتا کی ترستی نہ مانگتی ہوگی جتنی دعائیں ثریا دائی اس کے ماں ہو جانے کی مانگتی۔ ہر سال مردم شماری میں اضافہ کرنے والی یہ تو اس کی خاص نظر التفات ہوتی تھی۔ ایسے میں محلے کے سب سے اونچی پیڑھی والے گھر میں بچوں کی غیر موجودگی اس کے لیے درست لمحہ فکریہ تھی۔ اس کی بچی ستائی علامتوں سے کسی حد تک واقف میں جانتی تھی، وہ ہمارے ہاں سے اٹھ کر سیدھا ادھر کا رخ کرے گی۔

دن یہ دن گزرتے چلے گئے اور مکان کی طرح اس کے مکینوں کی صحیح تعداد بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکی مگر ایک اطلاع بالکل پکی تھی کہ عورت صرف ایک پہلے روز والی مگر مرد لاتعداد، کچھ کے چہرے شناسا ہوتے چلے گئے، کچھ ایک بار دکھے دوبارہ دکھائی نہ دیے۔ گھر کے اونچے تھڑے کے ساتھ ہر وقت ایک آدھ موٹر یا گاڑی کھڑی رہتی۔

چھٹی کا روز تھا، صبح کی گئی ڈھلتی دوپہر کو بھی ندارد تھی، سورج کی تیز گرمائش سے کپڑے پسینے سے شرابور ہو کر بدن سے چپکنے لگے۔ کھجور کے پنکھے ہاتھوں سے جھل جھل کر عورتوں نے اپنے بچوں، چھوٹی اور جوان لڑکیوں سمیت تھوڑی دور واقع پیپلوں کا رخ کیا، جہاں زرخیز درختوں کا گھنا سایہ اور قریب ہی صاف پانی کا نالہ بھی بہتا رہتا تھا۔ میں اس وقت اتنی بڑی تو نہیں تھی، مگر پھر بھی روز مرہ معمول میں اسکول کے علاوہ کہیں باہر آنے جانے پہ پابندی لگ چکی تھی، بڑھتی ہوئی سخت گرمی اور میری بے چینی دیکھ کر امی نے چادر اوڑھی اور دروازے کے کنڈے میں تالا ڈالا مجھے لیے درختوں کے سائے میں آگئیں۔ ہر چہرہ پسینہ نچوڑ نچوڑ کر سرخ کملایا ہوا، جسم پژمردہ اور بے جان ہوئے تھے، ہر طرف بے لاگ اونچے تبصرے، نوجوان لڑکیوں کی کانوں میں کھسر پھسر دبی ہوئی تھی، کچھ اپنے پڑوسیوں اور سسرالیوں کی برائیوں میں بڑھ چڑھ کر خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ میں اور امی بھی ایک چارپائی پہ تھوڑی سی جگہ ملنے پر سمٹی سمٹائی بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ دور سے قدرے تیز قدم اٹھاتا ہانپتا ہوا بے ڈھنگا سا وجود آتا دکھائی دیا اور نزدیک آنے پر دائی ثریا کی شبیہ واضح ہوئی۔

"یقیناً ان کے پاس کوئی نئی تازی ہے۔" میں نے دائی ثریا کی پھرتی سے اندازا" سوچا۔

"ارے، سنا کچھ۔" اکھڑے سانس کو بحال کرتے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر اس نے دہائی دی۔ ہر سو خاموشی چھا گئی، سب کان کھڑے ہو گئے۔ ان کی اڑی اڑی رنگت اور حواس باختہ تاثرات نے ہر دل میں ہلکا



سا چپ بیٹا جوش پیدا کر دیا، سب بغور متوجہ تھے۔

"وہ پتھر کے چوبارے والی کے کرتوت سنو، ارے اس کلموہی کے پچھلاوے (سائے) سے اپنے جوان پتروں اور خصموں کو بچانا، وہ جانے کتنے مردوں کو کھا گئی ہے تب بھی اس کلجی نہیں بھرتا۔"

"ہائے میں مر گئی، یہ کیا منحوس بات پھیلی۔" کسی شوہر کی ستائی ہوئی کی سسکی سی آواز سنائی دی۔

"توبہ توبہ، مرد تو ایک ہی بھلا۔" شوہر پرست عورت نے دو تین بار کر اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔

"میرے ربا، ماجد کی حرکتوں سے میرے اماں، ابا پہلے ہی ناخوش ہیں۔" پیچھے سے کسی کنواری منگنی شدہ کی دکھ بھری سرگوشی ابھری۔

میں نے ناسمجھی سے ہر طرف دیکھا۔ ثریا دائی کا واویلا اور نت نئی مختلف بولیوں کا مطلب میرے پلے پڑا۔ بس دماغ کی الجھی سوچیں شعور کے بہت نچلے درجے تک رسائی پا سکیں، جہاں اچھے اور برے کا فرق زیادہ واضح نہیں ہوتا۔ میری ماں کو نہ جانے کیا ہوا؟ سپاٹ چہرے اور خاموش پیوست لبوں کے ساتھ میرا بازو مضبوطی سے تھاما اور درختوں کے گھنے سائے سے نکل کر دھوپ میں چلنے لگی۔ ماں کے چہرے پر پھیلی سختی نے مجھے کمزور سا احتجاج بھی نہ کرنے دیا۔ ہمارا گھر ان گھروں میں سے تھا، جن کے دروازے کے پیچھے کپڑے کے پردے لٹکانے کی بجائے کنڈی چڑھائی جاتی۔ ہر آنے والے کو اپنی شناخت بتانے پہ ہی اندر آنے کی اجازت ملتی، کئی لوگوں کو باہر سے ہی ٹرخا دیا جاتا۔ میرا اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ہاں آنا جانا بھی نہیں تھا۔

اس عورت کے متعلق باقی کی معلومات مجھے اسکول جاتے اور واپسی پہ اپنے آگے اور ساتھ ریل کی پٹڑی پہ منہ نیچا کیے چلتی خود سے چند سال بڑی لڑکیوں کے تبصروں سے حاصل ہوئی، تقریباً" ایک مہینہ گزر جانے تک جب اس کا نام کوئی نہ جان سکا تو گلی کے فارغ نوجوان تماش بینوں نے اس کو "نصیبو" کے نام سے پکارنا اور یاد کرنا شروع کر دیا۔

سامنے والی لائن کی صفیہ پانچ بچے آگئی، پیاز اپنے دوپٹے میں ڈال کر دونوں ٹانگیں چارپائی پہ چڑھائے میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی، میں نے شرمگیں مسکراہٹ سے اس کے تکلف سے بے نیاز انداز کو دیکھا اور ایک اچٹتی سی نگاہ آٹا گوندھتی ماں پہ ڈالی۔ ادھر ادھر کی ہانکیں لگاتی وہ یک دم نصیبو کی طرف مڑ گئی۔

"وہ کوٹھے یا؟ اس کا شوہر گیا ہاتھ سے، میرا آدمی رات پھیرا لگا کے دیر سے آیا تھا، اس نے خود دیکھا اسے صافے کے ساتھ سر منہ لپیٹے چپکے سے نصیبو کے گھر جاتے، شرم نہ آئی اس بدبخت چار بیٹیوں کے باپ کو، وہ تو پوری ڈین (ڈائن) ہے جو اپنے بچے بھی کھا جاتی ہے۔" صفیہ جھٹ سے اٹھی چپل پیروں میں اڑس کر باہر نکل گئی جیسے وہ یہی بتانے کے لیے بیٹھی ہو۔ میں نے چور نگاہ امی پہ ڈالی جو بہت سست روی سے اپنے آٹے والے ہاتھ دھو رہی تھیں

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا نصیبو کا وجود ہر شوہر اور جوان بیٹوں والی ماں کو کانٹا بن کر چبھنے لگا۔ شوہر کی ستائی ہوئی بیوی اور جوان کماؤ سپوت کی سرکشی سے پریشان ہر ماں یہ چاہتی تھی کہ نصیبو پل بھر میں یہاں سے کوچ کر جائے، جب تک مرد نصیبو کے دروازے کے آگے سے نہ گزر جاتے، عورتیں پردوں کی اوٹ اور دروازے کی درزوں میں سے ایک آنکھ دبائے دیکھتی رہتیں۔ نصیبو کی تازہ بہ تازہ خبریں ہر وقت سرگرم رہتیں۔

جوان نکھٹو، ویلے اوباش لڑکے اس کے گھر کے سامنے نبی نائی کی دکان میں مستقل ڈیرہ ڈالے رکھتے، خوب تیل لگا کر بال جمائے جاتے کنگھے کے ساتھ کبھی مانگ سیدھی اور ٹیڑھی کی جاتی۔ اڑتی اڑتی سنی تھی کہ کچھ نکھموں نے مزدوری شروع کر دی ہے، شام ڈھلے وہ لش پش سے نوٹوں سے جیب بھرے پھرتے اور رات کو جانے کہاں گمشدہ ہو جاتے؟ ہر عورت دوسری کے شوہر یا بیٹے کا نصیبو سے ناتا جوڑ کر تیسری کو بتانے بیٹھی ہوتی، کبھی اپنے اپنے مردوں کو شریف

اور دوسروں کو لجانے کا تماشا بنانے پر تلی ہوتی۔

کم عمر دوشیزاؤں کے اپنے ہی خدشات تھے کوئی گبھرو جوان کسی کا محبوب تھا تو کوئی ساتھ والی دیوار کے چچا، تایا کی بیٹی کا منگیتر' غرض ہر شخص اپنا بچاؤ کرکے دوسرے سے سر دو ڈالنا جاتا۔

"اس کمبخت نصیبو کی وجہ سے میں ظفر کی طرف سے بہت پریشان رہنے لگی ہوں۔ مجھے پہلے بھی اس پر اعتبار نہیں تھا اور اوپر سے اس مہینے اس کی تنخواہ میں پانچ سو کا اضافہ ہوا ہے۔" وسوسوں سے بھرپور لہجہ تھا۔ وہ دہم کلاس کی طالبات تھیں جو پیشرو کی کے قبول پر مجھ سے تین قدم آگے تھیں۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو' میرا بھائی بتا رہا تھا کہ پینتیس سال کی بڈھی کھوسٹ ہے اور تم صرف سولہ سال کی' ظفر کوئی عقل کا اندھا ہے۔ کہاں تو دسویں جماعت کی طالبہ' کم عمر' خوب صورت' پڑھی لکھی اور خود ظفر چٹا ان پڑھ وہ تو خوش قسمت ہے کہ تو اس کی منگیتر ہے' نہیں پڑتا اس کے چکروں میں۔" اس کی سہیلی نے اس کی خوبیاں گرواتے اسے ہر ممکن تسلی دینے کی کوشش کی۔

مگر نصیبو کی ذات کا ذکر اس نے بڑی ناانصافی کے ساتھ کیا تھا لوگوں کے زبانی خاکہ کے مطابق وہ پینتیس کی ہی تھی مگر لگتی ستائیس' اٹھائیس سے زیادہ کی نہ تھی لونچا لمبا قد' سفید رنگت متناسب بھرا ہوا جسم' سرخی مائل ہونٹ' موٹی بڑی بڑی آنکھیں وہ بلاشبہ ہر لحاظ سے خوب صورت تھی۔

پھر آہستہ آہستہ نصیبو میں لوگوں کی دلچسپی کم ہونے لگی' ایسا لگتا تھا شوہروں نے اپنے سابقہ کردار کی شفاف جھلک دکھلا کر بیویوں کو رام کر لیا ہے' محلے میں پھر وہی پرانی روش لوٹ آئی تھی' عورتوں کا لڑنا جھگڑنا' بچوں کی مار پیٹ' گالم گلوچ اور طعنے بازی۔ ایسے میں جب کوئی دوسری کو یہ کہہ دیتی۔

"رب کرے تیرا خصم نصیبو کے در کا کتا بن جائے۔" تو وہ دل کر دروازے کا کواڑ مضبوطی سے بند کر لیتی اور کئی روز تک کسی سے لڑنے کے خوف سے کانپ کانپ جاتی۔

یونہی ملاونیوں ہی گزر گئے' تب ایک عجیب ہی واقعہ ہوا۔ صبح جب میں سیاہ نقاب والی چادر اچھی طرح لپیٹے اپنی امی کے ساتھ اسکول کے لیے نکلی تو باہر سڑک پہ لوگوں کا رش تھا۔

"نصیبو کو پولیس پکڑنے آئی ہے' اچھی طرح چھترول کریں اس بے غیرت کی۔"

"لونہ' بندے کھائی۔" نفرت کا بہت واضح اظہار تھا۔

"دل بہلانے کا سبب بھی گیا۔" کسی منہ چھٹ عاشق نے سرد آہ بھری۔

"اب تو سینماؤں میں بھی اچھی فلمیں نہیں لگتیں' چلو مفت کا تھیٹر ہی تھا وہ بھی ختم۔" کسی اور نے ناراضی سے اپنی بھڑاس نکالی۔

"اب اپنی تجلیاں پولیس والوں کو بھی دکھائے نا۔" ایک سے بڑھ کر ایک بڑبڑاہٹ تھی۔

نصیبوں کے پہلو سے تین مرد برآمد ہوئے تھے' ہر کسی نے تین مردوں کو دیکھ کر استغفار پڑھی۔ نصیبو کی غلاظت پر تھوکتے توبہ توبہ کا ورد جاری تھا۔ تب میں نے کافی فاصلے سے پہلی بار نصیبو کو دیکھا' گلے میں جھولتے دوپٹے اور کھلے گریبان کے ساتھ وہ ایک شان تفاخر سے جیپ میں بیٹھی۔ بہت سے خاموش لبوں نے شکرانہ ادا کیا' اس پہ آخری نگاہ غلط ڈالی اور دعا مانگی کہ یہ کوچ کافی طویل ہو۔

چند شرفاویوں ہی بغلیں جھانکنے لگے' کچھ نظریں چراتے بے دلی سے اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہوگئے۔

گاؤں کی شامیں بہت پر رونق اور مردوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں' چار' چھ دکانوں کے باہر پڑے بینچوں پہ نشست سنبھال لیتے ہیں' تھڑوں پر جو کڑی مارنے والوں کی اپنی ہی محفل ہوتی ہے' بیٹھکیں اور چوپال کا رش بھی دیکھنے لائق ہوتا ہے۔

مگر نصیبو کے جانے کے بعد شامیں اداس اور سکوت پر محیط ہوتی گئیں' اکثر گھروں میں چیخ سنائی پڑتی' برتن ٹوٹنے اور پیٹنے کی آوازیں دیواریں پھلانگنے لگیں۔ تب میری ماں نے پہلی بار نصیبو کے لیے منہ کھولا۔

"ایسی عورت تو کنجری (طوائف) سے بھی زیادہ بری ہوتی ہے' کنجری کے پاس تو وہ جاتا ہے' جس کے نوٹ جیب سے باہر گر رہے ہوں' پر یہ تو کھنکتے سکے والوں کو بھی سیراب کر دیتی ہے۔ وہ غریب جو چند سو سے اپنے سات بچوں کا پیٹ بھرتا ہے' ان ہی پیسوں سے اپنا نفس ٹھنڈا کرنے کی نئی راہ سجھائی دیتی ہے۔ غریب کے بچوں کو بھوکا سلانے والی خود نامراد ڈائن ہوتی ہے۔" مگر اس کا نام بھی درست ہی نصیبو رکھا گیا تھا' بہت سی بددعاؤں کے باوجود اس کے نصیب کھل گئے تھے۔ بائیس دن بعد وہ واپس آگئی تھی' جس نے بھی اسے دیکھا پلک جھپکنا بھول گیا۔ وہ کتنا نکھر گئی تھی' گال اتنے سرخ جیسے خون سے بھرے ہوں' آنکھوں میں بے باکی اور بے حیائی مزید بڑھ گئی تھی۔

نصیبو کی واپسی کی شام کئی تھک ہار کر لوٹنے والوں کو توانا کر گئی۔ نہا دھو کر استری شدہ کپڑے پہنے گئے' جیب میں پڑی رقم کو بار بار گنا' رات کے انتظار میں تھڑوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر گھٹیا جملے بازی ہوئی' آتی جاتی لڑکیوں پہ خلاف معمول ڈھکے چھپے فقرے کسے گئے' بے ہودہ اور لچر گانوں کے بول گنگناہٹوں میں بدل گئے۔ جبکہ عورتوں کو شک کے ناگ پھر سے ڈسنے لگے' کم عمر محبوبائیں اور منگنی شدہ نوجوانوں سے وعدے اور قسمیں لینے لگیں۔

"ان کے پاؤں نصیبو کی دہلیز پر کبھی نہیں پڑیں گے۔" بے بسوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

"رب کرے نصیبو کو پھر پولیس پکڑ کر لے جائے' کبھی نہ واپس بھیجنے کے لیے۔" شاید دعاؤں میں التجا اور آہ و زاری اس قدر تھی کہ انہیں جلد ہی مقبولیت کا درجہ مل گیا۔ شام کے سرمئی ہوتے اندھیرے میں ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھل کر بہت خنک سا تاثر چھوڑ رہے تھے۔ بچے بھی خوشی سے مست و مگن اچھلتے کودتے ابھی تک اپنے گھروں کو نہیں لوٹے تھے کہ مردوں نے اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں۔

جب ہر ایک موسم کے زیر اثر خوش تھا دور سے بڑی سی گاڑی آتی دکھائی دی' قریب آتے آتے وہ اس دن والی جیپ کی شکل اختیار کر گئی۔

جوں جوں جیپ نصیبو کے گھر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی بہت سوں کے ماتھے پہ شکنیں' آنکھوں میں نفرت انگیز شعلے اور جسم میں فشار خون بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے جیپ سے اتر کر نصیبو کے بند دروازے پہ لات ماری اور چند لمحوں بعد اسے بازو سے گھسیٹتا باہر لے آیا' اتنے میں بہت سے قدم پولیس والوں کی طرف بڑھے۔

عورتیں مسکراتے چہروں کے ساتھ نصیبو کا تماشا دیکھنے چوکھٹ سے باہر تک آگئیں' جوں ہی سپاہی نے نصیبو کو جیپ کی طرف دھکیلا جوشیلے نوجوان اور بال بچے دار پولیس پر پل پڑے۔ اندھا دھند مارنے کے ساتھ گندی گالیاں بکی جا رہی تھیں' کچھ کے ہتھے قریبی کریانے کی دکان کے باہر پڑی خالی بوتلیں چڑھ گئیں' سپاہی خون میں نہلا دیے گئے۔ اونچے کھڑے کھڑی نصیبو اکیلی تماش بین بچی آبادی کا تماشا مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

شام رات میں ڈھلی تو ٹھنڈی ہوا چلنا بند ہوگئی' گرم مرطوب فضا سے کچے تنگ مکانوں میں دم گھٹنے لگا' کچی آبادی کے چار سو بڑی پراسرار سی خاموشی چھائی تھی' دور گنے کے کماد میں گیدڑ کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی' بھری ہوتی رات دبی دبی سسکیوں اور ماتم میں بدل گئی' فضا بھی آنسوؤں سے نم ہوگئی' چپکے چپکے بہت سے تکیے بھیگے۔

☆☆☆

میں تب بھی اپنی کم عمری اور ناسمجھی کی سیڑھیوں پر کھڑی نصیبوں کی برائی کی گہرائی تو نہ جان سکی' مگر نصیبو کے لیے ہر عورت کے منہ سے اکثر و بیشتر نکلتا "نامراد" کا لفظ میرے ذہن پہ ہتھوڑے کی مانند برسنے لگا۔ جانے وہ نامراد تھی کہ نہیں؟ مگر وہ کتنوں کو مراد ملنے سے پہلے ہی بے مراد ضرور کر گئی تھی۔

☆ ☆

فاخرہ گل

ناولٹ

"شادی کا لڈو ایسا جو کھائے وہ پچھتائے جو نہ کھائے للچائے۔"

روشنی پچھلے آدھے گھنٹے سے اسی بات پر غور کیے جارہی تھی کہ واقعی یہ ضرب المثل سو فیصد درست ہے۔ خود اس کے ساتھ بھی تو یہ ہی معاملہ ہوا تھا۔ شادی سے پہلے میرڈ لائف کے لتنے سہانے خواب دیکھنے کے بعد تعبیر اس کے بالکل برعکس نکلی تھی۔ وہ جو منگنی کے بعد عام لڑکیوں کے برعکس بھرے پرے گھرانے میں جانے پر خوش تھی اب اسے گھر میں گھومتا ایک ایک فرد "بلیک واٹر" سے منسلک محسوس ہوتا۔ یہ سچ تھا کہ شادی سے پہلے اس کے ووٹ کو خاصی اہمیت دی گئی تھی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود اس نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ لیکن اب اسے محسوس ہوتا تھا کہ محض زبانی کلامی دعووں اور سبز باغ دکھانے پر شاید اس نے اپنا ووٹ ضائع کر دیا تھا۔

شادی سے پہلے وہ چشم تصور میں سب گھر والوں کو اکٹھا بیٹھے خوش گپیاں کرتے دیکھتی تو نہال ہو جاتی' لیکن اب جب سب ایک ساتھ بیٹھ کر قہقہے مار کر ہنستے تو اسے ان سب پر اسٹیج ڈرامے کے تھرڈ کلاس تماشائیوں کا سا گمان گزرتا جو بعض اوقات بغیر کوئی بات سمجھ میں آئے' محض ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی ہنستے رہتے۔

"روشنی تمہارا فون ہے' جلدی سے نیچے آجاؤ۔"

نیچے سے جمالی صاحب کی کراری آواز کانوں سے ٹکرائی' تو اس نے مزید جلنے کڑھنے کا پروگرام آئندہ میسر آنے والی تنہائی پر ملتوی کرتے ہوئے نیچے کی راہ لی' جہاں ہمیشہ کی طرح سبھی موجود تھے۔

"واہ بھئی دیکھو تو میری بہو کس شان سے سیڑھیاں اترتی ہے۔"

اماں کو اس کی سبک خرامی ہمیشہ سے پسند تھی کہ چلتے ہوئے پاؤں اس قدر آہستگی سے زمین پر رکھتی' گویا اس جگہ پر دلدل ہونے کا ممکنہ خطرہ موجود ہو۔

"تو اوپر سے اترتے ہوئے دیکھتی اس انداز سے ہیں جیسے ہوائی جہاز پر سوار ہونے سے پہلے کوئی سپر پاور پسماندہ ملکوں کے سربراہان کو دیکھتا ہے' رنگلی سو کیوٹ بھابھی۔"

مہرین نے اپنے انداز میں تعریف کی تھی یا تنقید' ہمیشہ کی طرح روشنی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"دراصل میری شروع سے ہی آہستہ چلنے کی عادت ہے' لیکن میں کوشش کر رہی ہوں کہ اسے ختم کروں۔"

روشنی نے چہرے پر سیاسی مسکراہٹ چپکا کر دل میں اٹھتے بے زاری کے جذبات کو بڑی مشکل سے چھپایا تھا۔

"ارے بہو' کوئی ضرورت نہیں ختم کرنے کی۔" اماں نے سروتے میں چھالیہ کا ٹکڑا رکھا۔

"میں تو کہتی ہوں تمہاری شکل و صورت پر یہ ہی نزاکت سجتی ہے' ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو

بہوؤں کی ہر بات پر نکتہ چینی کرتے ہیں' نا یایا نا' ہم نہیں ان میں سے۔" اماں نے بایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے گویا اعلان کیا تھا اور ان کے اسی اعلان پر روشنی دل میں ہنسی تھی۔

"نہیں ذرا فون سن لوں۔" روشنی نے فون کی طرف قدم بڑھائے' جہاں کرن یہ سب گفتگو سننے کے بعد اب ہنس رہی تھی۔

"ہاں سن لیا بجو۔ باقی تو سب ٹھیک' لیکن ان ٹی وی اینکرز" میں یہ ہی خرابی ہے کہ بولتے بہت ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ بال کی کھال تک اتار لیتے ہیں۔"

ٹیلی فون کیونکہ لاؤنج میں سبھی کی موجودگی میں سننا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ بلاواسطہ کوڈ ورڈز میں بات کیا کرتی۔

"ہاں چاہے ان کی باتوں سے کسی کی کھال ہی جل جائے۔"

"اچھا بس نا کر کیا رہی تھیں ابھی۔" کرن نے مزے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں' باہر جلسہ ہو رہا ہے نا ابھی تو اس لیے گھر میں ہی ہوں فارغ۔"

روشنی نے کن انکھیوں سے سب کی طرف دیکھا' جو اب جلسے کے بجائے یوں بیٹھے تھے گویا اپنی اپنی جیبیں کٹوا کر آئے ہوں۔ مکمل دھیان اسی کی طرف تھا' اماں نے سروتے سے چھالیہ توڑنا اور نائلہ نے اپنے بولنے سے منہ سے کیلا تک کھانے کا وقفہ کیا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب روشنی کی آواز پہنچ کرنے دی تو جھنجلا کر بولیں۔

"ارے بیٹے مہوب دروازہ تو بند کرو' کرسیوں کی پھٹ پھٹ سے ہوا میں کھلی کتنی پالوشن اندر آرہی ہے۔" مہوب کے اٹھ کر دروازہ بند کرنے پر دل ناتواں کو کچھ قرار آیا تھا۔

"جلسہ ہو رہا ہے؟ کیوں آج تمہاری جٹھانی کچن میں اور ساس جنسہ کی پسماندہ دور کرنے پڑوسیوں کے ہاں نہیں گئیں۔" کرن۔۔۔ سب کی روز مرہ روٹین سے واقف تھی جبھی پوچھا۔

"ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ فوڈ انسپکٹرز صرف عملے پر رعب ڈال کر کام کروا لیتے ہیں اور نام چلتا ہے ان کا" اور جب کام عملے نے ہی کرنا ہو تو دیر کیا سویر کیا۔ جلدی سے کر کے گھر کی راہ لیتے ہیں اور جہاں تک بات ہے ڈیلیوری کرنے کے گھر گھر جانے کی تو ہاں میں نے بھی پڑھا تھا اخبار میں کہ لوگ ان کے لیے اب کم ہی دروازہ کھولتے ہیں۔ اکثر تو گھر پر نہ ہونے کا کہلوا کر باہر سے ٹہلا دیتے ہیں۔"

"ہائیں واقعی؟" کرن کو حیرت ہوئی تھی۔

"تو اور کیا' بھئی جب وہ خوامخواہ گھر کے اندر اپنا ہی گھر سمجھتے ہوئے دوڑتی پھریں گی اور ادھر ادھر بات کریدنے کی کوشش کریں گی تو کون بٹھائے گا انہیں اندر۔"

"لیکن روشنی وہ سب تو ان کی برسوں پرانی سہیلیاں ہیں نا۔"

"وہ ہیں نا' ان کی بہوئیں تو نہیں' اب لاکھ ان کی ساس کہیں کہ بہو اندر آنے دو' بچے کو قطرے بھی پلا دیں گے اور دو گھڑی بات چیت بھی کر لیں گی تو ان کی بہوئیں پٹ سے جواب دیتی ہیں۔ اماں آپ کو نہیں پتا ان کی باتوں کا زہر دھیرے دھیرے اثر کرتا ہے اور ہم ایسے لوگوں کی ٹلے نوسی کیوں کریں جو ہمارے ہی گھر میں قطرے پلائیں اور ان کے جانے کے خود ہمیں صبر کے گھونٹ پینے پڑیں۔" سب کی موجودگی میں کسی اپنے سے دل کی بات یوں کی بجائے اس کے روپ کبھی پڑے تو جتنی مشکل ہوتی ہے اس کا اندازہ روشنی کو اب ہی ہو رہا تھا۔

اس کی اس حالت پر کرن تو بڑے مزے سے مسکرا مسکرا کر اس کی باتیں انجوائے کرتی اور اسے سب کچھ نظر انداز کر کے خوش رہنے کی تلقین کرتی' لیکن روشنی بھی کیا کرتی کہ اس کلول شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار اسی حساسیت کی بدولت وہ کسی چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی روہانسی ہو جاتی اور اپنی اسی کیفیت کو چھپانے کی ناکام کوشش میں بات



چیت کر کے چہرے کا ظاہری اثر زائل کرنے کی کوشش کرتی تو لہجے کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مدھم لہجے میں بات کرنے والی روشنی پر حالت نزع میں آخری بیان دینے کا گمان گزرتا۔ بلکہ کرن مخاطب ہوتی تو فوراً "اسے شبنم بننے" کی تنبیہ بھی کر دیتی۔

جبکہ ہر بات کے برعکس روشنی کا خیال تھا کہ اس کی زندگی کی یہ فلم دکھائے جانے والے ٹریلر سے بے حد مختلف ثابت ہوئی تھی۔

✿ ✿ ✿

خوش قسمت ہوتی ہیں وہ بیویاں جن کے شوہر حضرات کے گھر آنے اور جانے کے اوقات مقرر ہوا کرتے ہیں کہ اس طرح اکثر بیویوں کی صبح اوقات شوہروں کے سامنے آنے سے محفوظ رہتی ہے اور عزت بھی قائم رہتی ہے' ورنہ عام طور پر ایسے حالات میں جہاں شوہر حضرات بغیر کسی مقررہ وقت کے جب چاہیں بریکنگ نیوز بنے تشریف لے آئیں وہاں ان کی تو قدر کم ہوتی ہی ہے' لیکن بیویوں کی عزت کی بھی ان کی نظر میں لوڈشیڈنگ ہی رہتی ہے۔

روشنی کا تعلق بھی بیویوں کے اسی طبقے سے تھا جو شوہر کو ہر گھنٹے ڈیڑھ بعد سامنے دیکھ کر ایکو ہونے پر مجبور ہو جایا کرتیں کہ گھر کے گراؤنڈ فلور پر ان کا اپنا کلینک تھا' جہاں صبح اور شام کو وہ اپنے طے شدہ وقت پر مریض دیکھنے جاتے اور اس دوران جبھی گاہے بگاہے اوپر چکر لگانا اپنا فرض خیال کرتے۔

شادی کے اوائل روز میں روشنی اپنے میاں جی کی اس عادت پر فدا ہی ہو گئی تھی' خوشی سے چمکتے رخسار بن کہے سب پر اس کے دل کا حال عیاں کر دیتے۔ ملنے جلنے والوں کا متفقہ خیال تھا کہ روشنی کو تو جیسے شادی راس آگئی ہے۔ کچھ تو نام کا اثر پہلے بھی اس کی رنگت پر بہت تھا لیکن اب تو لگتا جانے کتنی ہی ٹیوب لائٹس تم سٹریٹ لائٹس بنیں اس کے چہرے پر روشن رہتیں اور یوں روشن رہتیں کہ ہماری اکثر شاہراہوں کی طرح دن میں بھی روشنی بکھیرا کرتیں۔ یعنی زندگی سے دن اور رات کا فرق گویا ختم سا ہو گیا تھا۔ اس پر عماز کی وارفتگی کا یہ عالم کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلینک سے کمرے تک کا چکر لگانا انہوں نے خود پر واجب سمجھ لیا تھا۔

چہرے پر روشن اسٹریٹ لائٹس کے فیوز تب اڑے جب ایک روز عماز حسب معمول کلینک جانے کے آدھے گھنٹے بعد دوبارہ کمرے میں آئے اور اسے کشن گود میں رکھے کسی میگزین کے مطالعے میں مصروف دیکھ کر بولے۔

"روشنی۔" اس کے سامنے آکر انہوں نے میگزین بیڈ پر رکھ دیا تھا۔

"او آپ۔ آئی ایم سوری' دراصل آپ کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"ہاں' شاید تم کچھ زیادہ ہی گم ہو گئی تھیں پڑھتے ہوئے۔"

"صرف پڑھنا ہی نہیں میں کوئی بھی کام کروں تو اسی دھیان اور توجہ سے کرتی ہوں کہ بس گم سی ہو جاتی ہوں۔" وہ مسکرائی تھی لیکن عماز کی مسکراہٹ آج اسے کچھ عجیب سی لگی تھی۔ شاید بجھی بجھی سی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اور میں چاہتا ہوں کہ

اب تم گھر کے کام بھی اسی دھیان اور توجہ سے کرنا شروع کر دو۔ تاکہ ان میں مکمل مل بھی جاؤ اور اسی خاندان کا ایک فرد لگو۔"

"جی۔" اس سے آگے وہ کچھ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ عماز نے اتنی غیر متوقع بات کر کے شاید اسے حیران کر دیا تھا۔

"تم خود سوچو اس وقت مہو کام والی کے ساتھ مل کر صفائی ستھرائی کروا رہی ہے۔ بھابھی ناشتے کے بعد کچن صاف کرنے کے ساتھ ساتھ دوپہر کے کھانے کی بھی تیاری کروا رہی ہیں۔ امی سبزی وغیرہ کاٹ رہی ہیں اور تو اور تائی بھابھی کے بچوں کو بہلا رہی ہیں تاکہ وہ سہولت سے کام کر لیں اور تم۔"

چند لمحے رک کر انہوں نے روشنی کو انگلیاں مسلتے دیکھا اور پھر گویا ہوئے۔

"تم یہاں میگزین میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہو کہ نہ کسی کے آنے کی خبر نہ جانے کا پتا۔ میں تم سے یہ سب خود کہہ کر نہیں کروانا چاہتا تھا کیونکہ میرا خیال تھا تم خود آگے بڑھ کر گھر کے کام کاج میں حصہ لو گی مگر میں جب بھی کلینک سے اوپر آتا ہوں تم ہمیشہ کمرے میں موجود اپنے ذاتی مشغلوں میں مصروف نظر آتی ہو اور بس۔"

روشنی نے بمشکل پلکیں اٹھا کر عماز کی طرف دیکھا۔ وہ جو آج تک یہ سمجھتی رہی تھی کہ عماز اس کی محبت میں دیوانے ہو کر اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں حقیقت کھلنے پر بے حد رنجیدہ ہو گئی تھی۔

"مہو کو میں نے اس کمرے کی صفائی کروانے سے اسی لیے روکا تھا کہ شاید اسی طرح تم کم از کم اپنے کمرے کی تو ذمہ داری لو لیکن تمہیں تو احساس ہی نہیں ہے کہ ان دو تین دنوں میں کمرے کا کیا سے کیا حال ہو گیا ہے۔"

روشنی کے چہرے پر چھایا اندھیرا تو وہ محسوس کر ہی چکے تھے لیکن بہرحال اماں کے منع کرنے کے باوجود انہیں آج یہ سب اسے کہنا ہی پڑا کہ اس طرح وہ خود اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے اپنی [illegible] نہیں کروا پا رہی تھی۔ گھر میں سبھی جانتے تھے کہ بھابھی نے صرف دو ہفتے بعد ہی اپنا دلہناپا بھول بھال کر گھر کے کاموں میں بھرپور طور پر حصہ لیا تھا اور ان کی اس بات کو سبھی سراہتے بھی تھے جبکہ یہاں تو شادی کو دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر ابھی تک کچھ ایسا گمان بھی نہ تھا اور آج نہیں تو کل اس سے پہلے کہ گھر والے خود روشنی کو کام کرنے کا کہتے عماز نے ہی اسے اس بات کا احساس دلا دیا جس پر وہ ابھی تک منہ بسورے کھڑی تھی۔

چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیے شاید وہ یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اس کی شادی کو اب دو ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ اور اب اسے بھی دوسروں کی طرح گھر اور گھرداری کی فکر کرنی ہی ہو گی۔

"اے۔۔۔" عماز نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجوڑا تو وہ جاگ سی گئی۔

"یہ کیا یار کہاں گم ہو گئی ہو؟ تم سے بات کر رہا تھا۔"

"جی۔۔۔ جی میں سن رہی تھی۔"

"سن رہی تھیں یا سنتے سنتے سن ہو رہی تھیں۔" عماز نے شرارت سے کہا کیونکہ "حقیقت حال" سے تو وہ بخوبی واقف تھے۔

"نہیں ایسا تو نہیں دراصل میں سوچ رہی تھی کہ جلدی سے کمرے کی صفائی کر کے نیچے چلی جاؤں۔" ان دو مہینوں میں آج پہلی مرتبہ وہ عماز کے سامنے جبراً مسکرائی تھی۔

"واؤ اتنی پھرتی۔" عماز نے سیٹی بجا کر اسے "خراج تحسین" پیش کیا۔

"میں بھی چلتا ہوں مریض انتظار میں ہوں گے۔"

عماز کے جاتے ہی اس نے ایک گہرا سکون کا سانس خارج کیا تھا اور یہ بھی ان دو مہینوں بعد پہلی ہی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ عماز کے ساتھ گزرا وقت اسے ہمیشہ بہت مختصر لگا کرتا۔ طبیعت میں شوخی تو تھی ہی سو شروع میں ایک دو دن تو وہ کمرے کی گھڑیوں کا ٹائم ہی پیچھے کر دیا کرتی کہ اماں اور بھابھی کے کہنے کے باوجود وہ شادی کے اوائل روز میں بھی کمرے میں ناشتا کرنے پر آمادہ



نہ ہوتے اور معمول کے وقت کے عین مطابق روشنی کو ساتھ لیے ناشتے کی میز پر جا پہنچتے جہاں روشنی چائے کے بجائے، جمائیاں لیتی اور بریڈ پراٹھے کی جگہ نیند کے جھکولے کھاتی اور شرمندہ ہوتی۔ تبھی وہ روزانہ رات کو عماز سے نظر بچا کر وال کلاک، رسٹ واچ اور حتیٰ کہ موبائل فون پر بھی وقت پیچھے کر دیتی لیکن ظاہر ہے یہ بات عماز سے چھپ نہیں سکی اور اس کی اس معصومانہ حرکت پر بلاشبہ عماز کو تو بے حد پیار آیا تھا۔

لیکن آج روشنی کو عماز پر پیار نہیں بلکہ غصہ آ رہا تھا۔ تبھی فوراً "کرن" کی طرف فون ملایا لیکن بے سود! ہمیشہ کی طرح اس کا موبائل سگنلز سے محروم تھا سو اسی جذباتی حالت میں چھت پر آ گئی جہاں چاروں طرف بنے فلیٹس درمیان میں موجود گھروں کو فلمی ہیروئن سمجھے چاروں طرف سے ولن بن کر گھیرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے علاقے سے بیاہ کر یہاں آئی تھی جہاں کے پڑوسی سیاستدانوں کی طرح صرف "سیزن" میں ملا کرتے اس کے برعکس یہاں محلے میں اتنی "اپنائیت" تھی کہ اس کا جی گھبرانے لگتا۔

سامنے ہی موجود فلیٹس کی بالکونیاں بھی اپنائیت کے اس تصور سے مالا مال نظر آ رہی تھیں۔ کہیں بالکونی میں بیٹھ کر پڑھائی کے بہانے "تفریح" ہو رہی تھی تو کہیں دھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے بجائے ہاتھ میں لیے کتنی دیر سے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی جا رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ بالٹی میں رکھے ہوئے نہیں تو ہاتھ میں پکڑے کپڑے تو ہاتھ میں ہی سوکھ گئے ہوں۔

"فلیٹس میں فاصلہ اس قدر کم تھا کہ کہیں ایک گھر میں جاتا تو پانی دوسرے گھر میں پلایا جا رہا ہوتا۔" روشنی نے ایک تنقیدی نگاہ اپنے ارد گرد دوڑائی اور جی ہی جی میں کلس کر رہ گئی۔

"یہاں کھڑے ہو کر کوئی بھی بات کرنے کا مطلب ہے کہ میری کم سے کم آواز پر بھی سبھی اپنی اپنی سرگرمیاں ترک کر کے میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔"

چند لمحوں کی پرائیویسی کو ترستی روشنی اس وقت کرن سے ضرور بات کرنا چاہتی تھی لیکن افسوس۔ نیچے موبائل فون کے سگنلز نہیں تھے اور اوپر چاروں اطراف کا نیٹ ورک فل ایکٹو!! جب نیٹن کم اور مکین زیادہ ہو جائیں تو صورت حال یہی ہوا کرتی ہے جبھی اس نے ایک گہری سانس لی اور واپسی کی طرف قدم بڑھادیے جہاں آج سے اس کی گھریلو ذمہ داریاں ٹریفک سگنلز پر کھڑے بھکاریوں کی طرح بڑی شدت سے اس کے انتظار میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد آج پہلی دفعہ اس نے اپنے کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ شاید وہ اپنے کمرے میں نہیں کسی ہسپتال کے جنرل وارڈ میں کھڑی ہے جہاں کی ہر چیز ذمہ داران کی بے توجہی پر پکار پکار کر اب برف کی طرح سرد نظروں سے بس اسے دیکھے جا رہی ہے۔

خوبصورت پلو کو ازکی ریشمی ڈوری کھل جانے سے اندر کا غلاف محلے کی عورتوں کی طرح جھانک رہا تھا تو بیڈ شیٹ کسی کرسچن کے عروسی لباس کی تقلید میں فرش پر ہی لیٹ جانے پر مصر۔

کمرے میں وال کلاک کے عین نیچے لگی اس کی شادی کی تصویر دو دن پہلے وال کلاک کے سیل تبدیل کرنے کے دوران جو ٹیڑھی ہوئی تو ابھی تک اسی حالت میں تھی۔

خود وہ اپنی حالت پر حیران تھی کہ اب تک ان دو ماہ میں کیا وہ آنکھیں بند کر کے چلتی پھرتی رہی جو یہ سب دیکھ نہیں پائی۔ نہ تو اس کے کمرے میں بچھے آف وائٹ قالین میں تازگی کا احساس تھا اور نہ ہی براؤن ڈیکو کے فرنیچر میں وہ چمک ہلکی ہلکی گرد سانولی رنگت پر لگے برائٹ فیس پاؤڈر کی طرح بالکل نمایاں ہو کر اس کی خوبصورتی کو بٹہ لگائے دے رہی تھی۔

وہ جو اپنے آپ کو بڑا سلیقہ مند تصور کرتی تھی آج خود اپنے ہی کمرے سے گھبرانے لگی تھی۔ سو کمرے سے پہلے اپنا کمرہ ٹھیک کرنے کے لیے اس نے ڈریس چینج کرنے کے ارادے سے اپنی قد آدم الماری کھولی تو ہینگرز میں موجود کپڑوں اور دھلے ہوئے دوسرے کپڑوں کو کراچی کی بس کے مسافروں کی طرح ایک دوجے سے زبردستی کا بغل گیر پایا البتہ عماز کا پورشن بہت بہتر حالت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو مزید کوستی موبائل کی بیل پر مڑ کر دیکھا۔ جہاں امی اس سے بات کرنے کو منتظر تھیں۔

"امی سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ کتنے روپے کھلائے ہیں کھمبے والوں کو صرف آپ کی ہی کال پر کمرے میں سگنل آتے ہیں اور وہ بھی کبھی کبھار۔" سلام دعا کے بعد وہ خوش مزاجی سے بولی تھی۔

"بس بیٹا یہ ممتا نیٹ ورک ہے نا چوبیس گھنٹے فری کالز ان لیمٹڈ میسجز اور وہ بھی ڈائریکٹ دل سے دل تک۔" جواباً وہ بھی ہنسی تھیں۔

"اور تم سناؤ خیریت ہے نا سب گھر والے عماز اور تم خود۔"

ان کا پوچھنا تھا کہ اس نے فوراً اپنی تمام تر کیفیت عماز کے ساتھ ہونے والی بات چیت اور اس کے بعد کی تمام تر صورت حال سے انہیں آگاہ کر دیا۔

"ہوں تو یہ بات ہے۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"ویسے روشنی بیٹا گھر داری سلیقہ مندی تو تم بہت زیادہ کبھی بھی نہیں رہی ہو یہاں بھی کام والی سارے کام کر جاتی تھی۔ الماریاں وغیرہ میں سیٹ کر دیا کرتی تھی اور کچن کرن کی ڈیوٹی تھا۔"

"اور میں۔۔۔ کیا میں کچھ نہیں کرتی تھی؟ تو امی نو۔۔۔ آئی ایم شاکڈ۔" وہ چیخی۔

"ہاں ہاں سنو تو میری جان بیٹا۔ ڈسٹنگ تم ضرور کرتی تھیں۔ اور بس۔ اب ہوا یہ کہ وہاں بھی مہرو وغیرہ سارے کام اسی روٹین سے کر دیتی ہیں ڈسٹنگ تک اور اب دو تین دن سے انہوں نے عماز کے کہنے پر تمہارے کمرے کی طرف دھیان نہیں دیا تو ظاہر ہے تمہیں سب کچھ الٹا پلٹا لگ رہا تھا۔"



وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھیں جو ہر قیمت پر اپنی ہی اولاد کو درست ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں جبھی بڑے پیار سے اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا۔

"یاد ہے میں نے تمہیں پچھلی دفعہ خود سے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کو کہا تھا۔"

"ہاں امی یاد ہے دو ماہ میں ہی بے زار ہو گئے ہیں یہ لوگ پہلے میرے بغیر بھی تو یہ سب کام ہوتے تھے نا اب میرے آنے سے بھلا کیا کام بڑھ گئے ہیں۔" اس نے منہ بسورا۔

"بری بات بیٹا تم بہت غلط سوچ رہی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔"

"تو ہوا ہی رہنے دیں۔ اچھا ایسا ہے کہ مجھے ابھی کام کرنا ہے تو بعد میں بات کریں گے۔ او کے۔"

"چلو ٹھیک ہے بیٹا خوش رہو۔ اللہ نگہبان۔"

وہ جانتی تھیں کہ اس کے موڈ کا فیوز اڑ چکا ہے جبھی فوراً فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"لو میری روشنی بیٹا آ گئی ذرا پانی کا گلاس دینا۔۔۔ تو حلق ایسا سوکھا پڑا ہے کہ اپنے بلدیہ کے نل بھی کیا ہی سوکھے ہوں گے۔"

تائی نے اسے سیڑھیوں سے اترتا دیکھ کر پکارا تو وہ کولر سے ٹھنڈا پانی لیے ان کی خدمت میں آن حاضر ہوئی۔ لیٹی بھابھی کا بیٹا ان کی نگرانی میں ہوم ورک کر رہا تھا کہ اس پر یہی تاثر تھا کہ تائی اپنے زمانے میں اسکول ٹیچر ہوا کرتی تھیں جبھی وہ بڑے دھیان سے کام کرتے کرتے بھی کبھار خوشامدی نظروں سے تائی کو بھی دیکھتا جاتا جو اپنی گول مٹول آنکھوں کو مزید گھما پھرا کر اس کی خوشامد کا سیاسی جواب دیتیں۔

"تائی پانی۔" تائی کو متوجہ کرنے کے لیے بولے گئے دو لفظوں کے اس قدر ہم قافیہ ہونے پر گڑبڑا گئی تھی۔ حمزہ نے چہرے پر کھیلتی شرارت لیے اسے دیکھا اور ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی لیکن تائی نے شاید دھیان نہیں دیا تھا جبھی اسے اپنے پاس ہی بٹھا کر گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے مخصوص انداز میں ابھی پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ چند بیڈ پر کپڑے پھیلا کر واپس آتی سو نے پانی وہیں سیڑھیوں کے ساتھ رکھے منی پلانٹ کے گملے کے ساتھ رکھی اور ان کی بائیں جانب بیٹھ کر خالی گلاس ان کے ہاتھ سے لیا اور بازوان کے گرد حمائل کر دیے۔

"بھابھی دیکھا آپ نے میری پیاری سی تائی کو گلاس میں کچھ بھی ڈال کر دو پہلا گھونٹ ہمیشہ ایسے لیتی ہیں کہ مجھے تو تائی شک ہوتا ہے جیسے گلاس میں کوئی ننھا سا رکشا چل رہا ہے۔"

مہو کی بات پر روشنی بھی دبی دبی سی ہنسی ہنسی تھی۔

"ارے بیٹا بس یہ ناٹھا گوڑا بڑھاپا۔ کیا جاؤں دانت منہ میں ہی نہیں تو ایسی ویسی ہی آوازیں نکلیں گی نا کہ تم ہنستی رہو۔"

"آ۔۔۔ چھو۔" بات ختم ہوتے ہی انہوں نے چند سیکنڈز باہر دروازے کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے زور سے چھینکیں جس پر مہو چیخ ہی تو اٹھی۔

"تائی یہ آخر آپ ہاتھ منہ پر رکھنے کے بجائے گھٹنوں پر کیوں رکھ لیتی ہیں۔"

"چل ہٹ اپنا کام کر تیرے پوڑے دھود ھو کر اتنا بڑا کیا ہے اور اب تو مجھے سکھائے گی تو بہ ہے ہفتے میں ایک سنڈے کا اتوار آتا ہے اس پر بھی یہ "سرلیجے کا بالس" سر پہ بجنے کو لپکتا ہے۔" تائی نے قدرے خفگی سے مہو کے دبلے پن اور لمبے قد کو سراہتے کا بانس کہا تو وہ بالٹی لیے دوبارہ مصروف ہو گئی جبکہ تائی بھی تخت کے ساتھ رکھی بید کی ٹوکری سے فیشن میگزین نکال کر چشمہ صاف کرتے ہوئے اس کا بغور مطالعہ کرنے لگیں۔ روشنی جانتی تھی کہ وہ ہر زبان میں چھپنے والے وہ تصویری رسالے" بڑی آسانی بلکہ منہ زبانی پڑھ لیا کرتی ہیں اسی لیے وہاں سے اٹھنے کو ہی تھی کہ انہوں نے پکار لیا۔

"روشنی بیٹا۔"

"جی تائی۔" وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔

"کچن میں جارہی ہو تو آج کھیر بنالو' نانو بڑا دل چاہ رہا ہے ٹھنڈی ٹھنڈی چاندی کے ورق لگی کھیر کھانے کو۔" نانی نے آنکھیں بند کرکے بڑے مست انداز میں ہلکا سا جھومتے ہوئے کہا۔

"لیکن نانی ابھی تو شام کے کھانے میں بہت وقت باقی ہے۔"

اتنی دیر کھیر میں چمچہ چلانے کے خیال سے ہی اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

"لے لو... تو بہو میں نے کب تمہیں تن کی تن میں کھیر حاضر کرنے کا کہا ہے۔"

نانی نے شہادت کی انگلی ٹھوڑی پر رکھے ناک سکیڑی تو چشمہ پھسل کر ناک کی حد عبور کرنے لگا۔

"ہاں بہو ابھی سے چاول وغیرہ بھگو دو یوں بھی پکنے میں شاید اتنا ٹائم نہ لگے جتنا ٹھنڈا ہونے میں لگے گا۔"

اماں نے بالکونی سے برآمد ہوتے ہوئے مفت مشورے سے نوازا اور پھر نانی کے پاس ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔

"کمال یاد ہے باجب آپ ہمیں صبح کی بنی ہوئی کھیر عصر کے وقت دیا کرتی تھیں۔ پیتل کی کٹوریوں میں ڈلی کھیر پستے بادام سے ایسی خوبصورت لگتی تھی کہ بس دل چاہتا دیکھتے ہی جاؤ۔"

دونوں ماں بیٹی گزرے وقت کو ادھار میں دیئے گئے روپوں کی طرح حسرت سے یاد کرنے لگیں تو روشنی گھر میں چاول نہ ہونے کی دعا کرتی اداسی سبک خرامی سے کچن کی طرف ہولی۔

☆ ☆ ☆

"بھابھی ایک شعر سناؤں ابھی ابھی آمد ہوئی ہے۔"

مہو نے کیبنٹ صاف کرتے کرتے اچانک کہا مگر روشنی کے تاثرات جان کر بجھ گئی۔

"ہاں ہاں سنادو' ویسے بھی ہمارے ہاں آج کل شاعروں کی سالانہ پیداوار ٹماٹروں سے زیادہ ہے ایک ٹماٹر اور سہی۔"

کھیر میں چمچہ چلاتے ہوئے اس نے بے دلی سے کہا اور ویسے بھی ان دو تین دنوں میں جب سے اس نے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کیا تھا یوں ہی اکھڑی اکھڑی رہتی لاکھ نہ چاہنے کے باوجود ایسی بات کہہ جاتی کہ پھر خود کو گھنٹوں کوستے ہوئے آئندہ گفتگو کی طنابیں کھینچ کر رکھنے کی کوشش تو ضرور کرتی مگر دل ہی دل میں خود سے جو باتیں کر رہی ہوتی کسی کے مخاطب کرنے پر بھی لفظوں کے اڑیل گھوڑے لہجے کے کھردرے راستے پر یوں سرپٹ دوڑتے کہ سماعتوں کے در و بام ہلا جائے۔

"نہیں بس دماغ سے نکل گیا پھر سہی۔"

مہو نے مسکرا کر کہا اور ایک بار پھر سرکے میں اچھی طرح اسفنج نچوڑ کر کے کیبنٹ صاف کرنے لگی۔ سارا سودا وغیرہ وہ پہلے ہی نکال کر سلیب پر رکھ چکی تھی تاکہ کیبنٹس میں اچھی طرح ہوا لگ جانے کے بعد دوبارہ اسی ترتیب سے سیٹ کردے۔

"بھابھی یہ کھیر تو بہت کم ہے' حالانکہ گھر میں بھی لوگ ٹھنڈی کھیر بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے مہو نے اچانک دیگچے کے کسی نچلے حصے میں کھیر کو دیکھا تو حیران ہو کر کہے بنا نہ رہ سکی۔

"ہاں وہ دراصل چاول ہی نہیں تھے گھر میں جتنے تھے وہ میں نے ڈال لیے۔"

"تو آپ منگوا لیتیں بھابھی یا کہہ کر۔ یہ چند قدم پر تو یوٹیلٹی اسٹور ہے۔"

"تو تم مہو کیا ابا کی طرح یہ دیکھنے کے لیے ان ڈبوں کا پھیلاوا لیے کھڑی ہو کہ میں کیا اور کس طرح کر رہی ہوں۔"

مہو کی نکتہ چینی پر اس کے دل میں موجود جوائنٹ فیملی کا جلا ہوا انجن پھر سے دھواں دینے لگا تھا۔

"نہیں بھابھی' ایسا نہیں ہے میں تو صرف آپ کو کمپنی دینے کے لیے یہ کام کر رہی ہوں تاکہ آپ اکیلا محسوس نہ کریں۔"

اپنی اچھی نیت کو غلط رنگ دیے جانے پر اسے دکھ



ہوا تھا۔

"ارے واہ بھئی بیوی ہو تو روشنی جیسی۔" اس سے پہلے کہ روشنی مہو کو کچھ کہتی عماز کچن میں داخل ہوئے اور ہر شوہر کی طرح بیوی کو کام کرتا دیکھ کر نہال ہونے لگے۔

"بڑی دیر لگادی آج آپ نے۔" روشنی نے چولہا بند کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"ارے یار میں تو کب سے اوپر آنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بس ایک میڈیکل ریپ آکر کچھ دوائیوں کی تفصیل بتانے لگا تو اسی میں دیر ہوگئی۔"

دونوں کو بات چیت کرتا دیکھ کر مہو غیر محسوس طریقے سے وہاں سے ہٹ گئی۔ روشنی بھی کمرے میں جانے کے لیے ہاتھ دھونے لگی کہ کھیر تیار ہوئے تو کچھ دیر گزر چکی تھی وہ عماز کے آنے تک وہیں کھڑا رہنا چاہتی تھی جبھی آنچ ہلکی کیے مسلسل چمچہ چلاتی رہی۔

"آج تو اتنی دیر کھڑے ہو کر بس کمر تختہ سی ہوگئی ہے۔ قدم خود میرا ہی وزن نہیں اٹھا پار ہے۔" ایک ہاتھ کمر پر رکھے وہ نڈھال سی عماز کے ساتھ ٹیک لگا کر سر اس کے کندھے پر رکھے کھڑی تھی۔

"تو بس اتنی سی پرابلم ہے۔ کہو تو جناب اٹھا کر لے جاؤں کمرے تک۔"

"چلیں بس ہٹیں بھی اب... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔" عماز کی متوقع پیش قدمی پر وہ یوں ہی بدک گئی تھی۔

"یہی کہیں گے ناکہ اٹھا کر لے جا رہا ہوں یہ تو نہیں کہیں گے کہ بھگا کر لے جا رہا ہوں ڈیئر۔"

"اوہو آپ بھی نا بس رہنے دیں' دراصل آج کام کی زیادتی نے تھکا سا دیا ہے۔ کبھی اتنا کام کیا نہیں ہے میں نے پہلے۔"

"ارے میں تو کہتا ہوں بھئی آئیڈیل خاتون ہیں اپنی لبنی بھابھی' تم یقین مانو بیویوں پھرکی کی طرح ہر وقت کام کرتی ہیں کہ ہمیں کہنا پڑتا ہے بھابھی ذرا ریسٹ بھی کرلیا کریں لیکن وہ..." روشنی جو اس وقت اپنی داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کرنا چاہتی تھی بھابھی کی توصیف پر جی بھر کے بدمزا ہوئی۔

"معمول ہے جو بھی آرام کرلیں اب بھی اگر تم ان کے کمرے میں جا کر دیکھو تو اپنی بلیو کوئی نہ کوئی کام ہی کر رہی ہوں گی۔"

عماز اپنی ہی دھن میں بولے جارہے تھے اب انہیں کون بتاتا کہ بیویوں کے سامنے ان کی دیورانیوں یا جٹھانیوں کے سلیقے اور سگھڑاپے کی اس قدر تعریف انہیں عارضہ قلب میں بھی مبتلا کرسکتی ہے اس لیے اپنی بیوی کو تندرست و توانا اور خوش و خرم رکھنے کے لیے ہر شوہر پر لازم ہے کہ وہ بیوی کے سامنے ان خواتین کی حسب ذائقہ برائی ضرور کریں۔

لیکن یقیناً" عماز ابھی اس گر سے ناواقف ہی تھے۔ جبھی یہ محسوس ہی نہ کرپائے کہ لبنی بھابھی کے ذکر پر روشنی نے یوں گردن موڑی تھی جیسے عام طور پر انجکشن لگواتے ہوئے موڑتے ہیں۔

"میں خود سمجھاؤں گی بھابھی کو کہ آرام بھی کیا کریں ورنہ تو انہیں کون نارمل سمجھے گا۔ ہر کوئی خبطی ایب نارمل یا نفسیاتی مریض ہی سمجھے گا بھی اور کہے گا بھی۔" روشنی نے چڑ کر جواب دیا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

شام کو سبھی کھانے سے فارغ ہوئے تو کھیر کی امید میں روشنی کی طرف دیکھنے لگے لیکن کھانے کے برتن کچن میں رکھ کر واپس آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود کھیر کا ڈونگا دیکھ کر سبھی چونکے۔

"ارے بہو بار بار جانے سے بہتر ہے دیگچا ہی اٹھالاتیں۔" اماں نے اسے سب کے آگے بیٹھے کے باؤل رکھتے دیکھ کر مشورہ دیا تھا۔

"اور بیٹا ان بوتلوں کے ڈھکنوں میں کون کھیر کھائے گا جا کر پتیلی لے آؤ۔ میں نے بتایا تھا نا بھی کی "غیرت" چیز ہے یہ۔"

نانی نے بھی ڈنر سیٹ کے ساتھ ڈیزرٹ باؤل فوراً"

روبوٹ بنے کھڑے تھے۔

"وہ دراصل کھیر اتنی ہی ہے کہ ابھی میں کھالی جائے۔" روشنی نے آہستگی سے کہا اور ڈونگے کا ڈھکنا اٹھا دیا جہاں سفید چاندی کے ورق کنول کے پھولوں کی طرح موجود تھے۔

"اول تو چاول ہی کم تھے اور میں نے منگوانے کے لیے کسی کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور۔"

"اور۔۔۔" عماز نے اسے جملہ مکمل کرنے کا ریڈ سگنل دیا تھا۔

"اور جو بنائی تھی اس میں سے بھی کچھ ڈونگے میں ڈالتے ہوئے اتفاقاً "گر گئی۔"

"گر گئی؟ کھیر گر گئی؟" اگر کرسی کی پشت نہ ہوتی تو امکان غالب تھا کہ وہ اب تک پیچھے جا گرتیں۔

"جی تائی۔" وہ ہنوز سر جھکائے ہوئے تھی۔

"اوہو روفی چاچی آئندہ ریچی گری ہوئی حرکت نہ کیجے گا۔" حمزہ نے بھی منہ بسورا کہ ابھی تو وہ کھیر کے لیے تیر بن کر بیٹھا ہی تھا کہ۔۔۔۔۔

سبھی کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ لیکن روشنی ابھی حمزہ کی بات میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"گری ہوئی حرکت؟"

"اوہو بھئی بچہ ہے نا اس کا مطلب ہے آئندہ کھیر نہ گرانا۔" عماز نے دلاسا دیا۔

"ویسے یہ نیچے کی کھیر بھی بہت مزے دار۔۔۔" تائی نے اسی باؤل میں کھیر ڈال کر گویا الیڈور ٹائزمنٹ کرتے ہوئے ڈونگا اماں کی طرف بڑھایا جنہوں نے حمزہ کو ڈال کر دینے کے بعد خود بھی چکھی۔

"ارے ہاں بھئی اوپر کی کھیر گر بھی گئی تو کیا یہ دیگچے کے پیندے والی کھیر تو لاجواب ہے۔۔۔ اب میں سمجھی اماں کہ آپ ہمیشہ آخر میں کیوں کھاتی ہیں۔" مہرو نے بھی "تبرک" پر تبصرہ کیا۔

"تو روفی چاچی آئندہ اچھا کیجے گا کہ کھیر صرف پیندے میں بنائیے گا۔ چینی ہے نا؟" حمزہ نے ایک بار پھر مفت مشورہ دیا تھا لیکن روشنی کا خیال تھا کہ یہ بھی اسے محفل میں جھل والے جوتے لپیٹ لپیٹ کر مار

رہے ہیں۔ اور پھر اس کے منہ پر اتنے طنز کیے جا رہے تھے کہ اس سے برداشت نہ ہو سکے۔ یوں بھی یہ "ظرف" تو صرف سیاستدانوں کا ہی ہو سکتا ہے۔ جبھی جیسے تیسے چند منٹ بیٹھی اور پھر اٹھ کر گھر میں اپنی واحد پناہ گاہ یعنی کمرے میں جا کر بھل بھل رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"روشنی۔۔۔ اٹھ جاؤ ڈیئر دیکھو آٹھ بجنے والے ہیں۔"

عماز نے تیسری مرتبہ اسے جگاتے ہوئے ٹائم بھی بتا دیا تھا اور اب اسے ظاہر ہے چار و ناچار اٹھنا ہی تھا۔ یوں بھی جوائنٹ فیملی میں رہتے ہوئے دیر سے اٹھنے کی خواہش 'خواہش ہی رہتی ہے وہ اکثر حسرت سے ان "خوش قسمت" عورتوں کے بارے میں سوچا کرتی جو بچوں کو اسکول اور شوہر کو دفتر بھیج کر بڑے سکون سے الارم لگا کر سو جایا کرتیں اور شوہر کے آنے پر کاموں میں یوں جتی ہوئی پائی جاتیں کہ وہ بھی قدر دان ہو جاتے کہ ہماری بیوی ہر وقت کام کرتی رہتی ہے۔

روشنی کے معاملے میں گو کہ بچوں کی ابھی انٹری نہیں ہوئی تھی لیکن شوہر بھی اسے گھر والوں کے چاق و چوبند اور چوکس دستے میں شامل کرنے پر تلے رہتے اسی بات کا نتیجہ تھا کہ اب اکثر اوقات وہ جھنجلائی ہوئی رہتی۔ کہ عماز کے اوپر چکر لگانے کے وقت باقی سب کام میں مصروف اور وہ فارغ ہو یہ بات انہیں ہرگز گوارا نہیں تھی بلکہ ان کا بس چلتا تو یہ بھی کہہ ڈالتے۔

"روشنی فارغ رہنا شیطان کو دعوت دینا ہے اس لیے اگر اور کوئی کام نہیں تو کپڑے ہی ادھیڑ ادھیڑ کر سیتی رہو۔"

"آج بھابھی کے کچھ مہمان آرہے ہیں ان کے ساتھ ذرا ہیلپ کروا دینا۔" عماز نے اسے آنکھیں بند کر کے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا دیکھا تو بات چیت کرنے لگے۔

"کیوں مہو گھر میں نہیں ہے کیا؟ تھک جاتی ہوں



اتنا کام کر کر کے اوپر سے آج اسپیشل تیاری۔" مندی مندی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے یقیناً "نیند میں کہا گیا یہ جملہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کنگھی کرتے عماز کو پل بھر گھما گیا تھا۔

"مہو جتنا کام کرتی ہے تم اس کا پانچ فیصد بھی نہیں کرتی ہو پھر گھر تو تمہارا ابھی ہے مہو تو آج ہے کل بیاہ کرا کے اپنے گھر چلی جائے گی۔ تم کیوں گھریلو ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی کوشش میں رہتی ہو۔ ہر کام مارے باندھے کرنا کوئی گرہستی کا طریقہ نہیں ہے۔"

عماز کی باتوں سے زیادہ اس کے لہجے نے روشنی کی آنکھوں کو پوری طرح کھول دیا تھا۔

"میں نے تو۔"

"ہاں مجھے پتا ہے کہ تم نے تو کبھی کام کیا ہی نہیں ہے۔ تمہیں تو عادت ہی نہیں ہے کاموں کی 'تھک جاتی ہو گھر کے کام کاج پسند نہیں ہیں۔ یہی نا۔"

عماز نے طنزیہ انداز میں وہی جملے دہرائے جو روزانہ عماز کو کہنا شاید اب اس کی عادت بنتی جا رہی تھی کہ اس کا خیال تھا اس طرح کہنے سے ہو سکتا ہے عماز اس کے لیے کوئی کام والی ہی۔۔۔ لیکن نتیجہ اس کی توقعات کے برعکس نکلا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے اور میں مانتا ہوں کہ تم انتہائی پڑھی لکھی اور قابلیت والی لڑکی ہو لیکن روشنی شادی کے بعد سسرال میں کسی بھی لڑکی کی ڈگری یا اس کے میڈلز سے زیادہ اس کا سلیقہ اور برتاؤ اہمیت رکھتا ہے۔ تین وقت کھانے میں تمہاری ڈگریاں نہیں کھائی جا سکتیں اور نہ ہی گھر کے کام کاج مختلف شعبوں میں تمہارے حاصل کیے گئے میڈلز کی چمک سے ہو سکتے ہیں۔۔۔ پلیز اپنی میرڈ لائف کے تقاضوں کو سمجھو اور گھر میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو۔ پتا ہے چائے پر آئی ملائی کی طرح الگ تھلگ رہتی ہو تم سب میں۔"

اتنی کڑوی کسیلی باتوں میں ایک دم اپنی خوبصورتی کی تعریف پر اس کا سانس بحال ہوا ہی تھا کہ عماز پھر بول پڑے۔

"لیکن اپنی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے

روکھے پھیکے رویے کی وجہ سے۔" روشنی نے ایک نظر سامنے کھڑے عماز کو دیکھا اور آنکھوں میں ڈھیروں پانی لیے واش روم کی طرف چلی گئی۔

"آج دن کا آغاز ہی کیسا عجیب ہوا ہے اور امی ہونہہ کہتی تھیں بیٹا شریف لوگ ہیں ایک دم سیدھے سادے 'نہ دل میں کھوٹ رکھتے ہیں اور نہ ہی روایتی گھر پھران کی عادت ہے۔ ہنسی مذاق اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی عادت تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ نہ تو تمہاری ساس جل ککڑی ہے نہ گھر کے دوسرے لوگ۔۔۔۔" شاور لینے کے دوران وہ خود ہی سے مخاطب تھی۔

"لیکن میری پیاری امی آپ کو کیا پتا کہ یہ سب لوگ عماز کو میرے خلاف کتنا بھڑکاتے رہتے ہیں 'ان سب کو میرا چند لمحے آرام سے بیٹھنا بھی کتنا کھٹکتا ہے۔ یہی عماز جو پہلے صرف مجھے دیکھنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ اتر کر ہلکان ہوئے رہتے تھے اب میرا کام دیکھنے آتے ہیں۔"

من ہی من میں خود کلامی یقیناً "ابھی دیر تک جاری رہتا بھی لیکن دستک دیتے عماز نے اسے بھڑاس کا ٹیلی تھیٹر اگلے حصے پر ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔

"روشنی یار تمہیں پتا بھی ہے میں تمہارے بغیر ناشتا نہیں کروں گا پھر بھی اتنی دیر۔۔۔" وہ عماز سے ناراض نہیں تھی کیونکہ جانتی تھی کہ قصور اس کا نہیں بلکہ گھر والوں کا ہے اور یوں بھی وہ "مجرم" کو نہیں "جرم" کو ختم کرنا چاہتی تھی اور جب جرم "جرائم" کی صورت موجود ہوں تو ہماری پولیس کی طرح بے بس روشنی کو سوائے جلنے کڑھنے کے اور کرنا ہی کیا تھا۔ سو جلدی جلدی تیار ہو کر عماز کے ساتھ نیچے پہنچی تو سبھی ناشتا کر چکے تھے اور مہو ٹیبل صاف کر کے کچن میں جانے ہی والی تھی کہ انہیں دیکھ کر دوبارہ پلٹ آئی۔

"بھابھی آپ بیٹھیں میں بس ابھی ناشتا لے کر آتی ہوں۔"

عماز نے ملامتی نظروں سے روشنی کی طرف دیکھا تو

اب تک کریں کھسکا کر بیٹھ بھی چکی تھی۔

"ارے نہیں مہو تم رہنے دو۔ آج میں روشنی کے ہاتھ کا بنا ناشتا کروں گا۔"

گلابی ہتھیلیوں کے کٹورے میں چہرہ ٹکائے روشنی نے نظروں ہی نظروں میں عماز کے دل کی عدالت میں رحم کی اپیل کی جسے لمحہ بھر میں ناقابل سماعت قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ بددلی سے وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ اماں کے لیے گئے از خود نوٹس نے کام کر دکھایا۔

"عماز بیٹا کیوں تنگ کرتے ہو بہو کو۔" ہاتھ میں اپنی ادویات کا شاپر پکڑے وہ بھی ٹیبل کی دائیں طرف بیٹھ گئی تھیں۔

"جی امی! میں تنگ کرتا ہوں لیکن کیسے؟"

"ہاں تو یہ تنگ کرنا ہی ہوا ناکہ جب تم جانتے ہو کہ ناشتا کیے بنا نہار منہ اسے کچھ بھی کرنا محال لگتا ہے تو کیوں کہتے ہو اسے ناشتا بنانے کو۔"

"ارے امی فرض کریں کہ کسی دن لبنیٰ بھابھی اور مہو دونوں گھر پر نہ ہوں تو سب کے لیے ناشتا کیا بازار سے آئے گا؟ اسے عادت ڈالنے دیں پلیز۔"

"اگر کبھی ایسا ہوا تو میں بنالوں گی ناشتا، تمہیں نہیں کہوں گی۔ خوامخواہ بچی پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کیا کرو۔" اماں نے رنگ برنگی گولیاں اور کیپسول اکٹھے منہ میں ڈال کر پانی کی مدد سے نگلے۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے میں بنالیتی ہوں۔" روشنی دونوں ماں بیٹے کی زم گرم تکرار سے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن عماز نے ہاتھ پکڑ دوبارہ بٹھالیا۔

"بتاؤ۔ اتنی آئیڈیل فیملی کسی اور لڑکی کو ملی ہوگی شادی کے بعد؟"

"واقعی میں خوش قسمت ہوں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

سوچ تو وہ یہ رہی تھی کہ میری پیٹھ پیچھے یقیناً "عماز کو مجھ سے کام کروانے کا کہتی ہوں گی اور اب میرے سامنے۔۔۔۔۔"

"بہت ہی بھولی ہے میری بہو ورنہ آج کل کی لڑکیاں دیکھو کتنی چالاک ہیں۔" اماں نے روشنی کو بڑے پیار سے دیکھا تھا۔

مہو نے دونوں کے آگے ناشتا رکھا تب تک لبنیٰ بھابھی بھی کچن سے باہر آگئی تھیں۔

"ہائیں اماں تو کیا آپ روشنی کو چالاک کرنا چاہتی ہیں۔" لبنیٰ بھابھی نے ایک کپ چائے اماں کو تھمائی اور دوسرا کپ خود لے کر وہیں بیٹھ گئیں۔

"آئے ہائے کچھ خدا کا خوف کرو رسیدہ کے ہلاک کرنا چاہتی ہو؟" نانی کا آلۂ سماعت یقیناً "اپنے درست مقام سے کچھ کھسک گیا تھا جبھی وہ صحیح جملہ نہیں سن پائی تھیں۔ لیکن ہاں سب کا مشترکہ قہقہہ انہوں نے ضرور سنا تھا جبھی کان سے غیر حاضر آلۂ سماعت کو کندھے پر محسوس کیا تو جزبز سی ہو کر سروتے میں رکھی چھالیہ کو بڑی تیزی سے کترنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

نانی کے بتائے گئے نسخے کے مطابق جب اس نے صاف ستھرا کپڑا اور ٹل میں بھگو کر اچھی طرح نچوڑنے کے بعد عماز کی شرٹ پر بال پوائنٹ کے نشان کو رگڑا تو وہ جیسے لمحہ بھر میں ہی ایسا غائب ہوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ نانی کو داد دیتے ہوئے اس نے شرٹ تار پر پھیلائی ہی تھی کہ نانی بنفس نفیس آپ تشریف لے آئیں۔

"ارے بیٹا ذرا دیکھنا تو پیچھے ڈرائنگ روم میں رسید ہے کہ نہیں؟"

ہانپتی کانپتی ابھی ابھی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھیں۔ اسی لیے فوراً" واپس جانا محال تھا۔ جبھی انہوں نے روشنی سے ڈرائنگ روم جانے کا کہا۔

"رسید بل کی؟" روشنی نے اپنا ادھ گیلا سا دوپٹہ کندھے پر ڈالا اور سیڑھی کی طرف مڑی۔

"وہ اپنے عماز نے جانا ہے واپڈا کے دفتر کہ انہوں نے اتنا بل کیوں بھیج دیا تو اگر رسید ساتھ ہو تو سنا ہے دفتر والے جلدی بات سن لیتے ہیں۔"

نانی نے کھڑکی سے حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے اسے جواب دیا تو وہ اپنے تئیں جلدی مگر "ہمیشہ" خراماں خراماں کیٹ واک کرتی ۔۔۔۔۔ نیچے جا پہنچی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر رسید ہی کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"بہو کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" اماں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا چاہی تھی۔

"اماں رسید کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ نانی کہہ رہی تھیں کہ رسید ساتھ ہو تو واپڈا کے دفتر میں عماز کا کام جلدی نپٹ جائے گا۔"

"بہو رسید نہیں۔" اماں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر ناکام رہیں۔

"ہاں نانی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ آج رسید کام آجائے پھر بے شک جائے بھاڑ میں۔" لیکن ہے پتا نہیں کہاں میں تو۔۔۔۔" نانی کی زیر لب کہی باتیں دہراتے ہوئے خود بڑی مصروف تھی۔

"روشنی ۔۔۔۔۔" عماز کی کرخت سی آواز غراہٹ بنی اس کے کانوں تک پہنچی تو اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو یوں کہ پھر کچھ دیکھنے کے قابل نہ رہی۔

صوفے پر عماز کے عین سامنے کوئی شخص براجمان تھا سوٹڈ بوٹڈ بندہ جسے دیکھ کر بجائے سلام دعا کرنے کے وہ نظریں نیچے کیے مجرموں کی طرح کھڑی ہوگئی۔

ٹخنوں سے اوپر کیا گیا ٹراؤزر "باتھ روم میں رکھے گئے ربڑ کے سلیپرز جنہیں کپڑے دھونے کے بعد اسے تبدیل کرنا یاد ہی نہیں رہا ۔۔۔۔۔ چھوٹا سا دوپٹہ جو ویٹرز کے انداز میں کندھے پر لٹک رہا تھا اور کہنیوں سے اوپر چڑھائی گئی آستین۔

"آئی ایم سوری دراصل میں کپڑے دھوتے دھوتے اٹھ کر آئی ہوں تو۔"

مارے خجالت کے اس کا برا حال تھا۔ وہ تو یہی سمجھی تھی کہ لبنیٰ بھابھی کے مہمان کھانا کھا کر رخصت ہوگئے ہیں۔ اسے کیا پتا تھا کہ صفائی کرنے کے باوجود کچھ کونوں کھدروں میں بھی جا چھپتا ہے۔

"ارے نہیں بھابھی ہو جاتا ہے ایسا بھی ' آپ کیوں شرمندہ ہو رہی ہیں۔"

یہ آواز روشنی کی بہت جانی پہچانی تھی لیکن کہاں پر سمجھ نہیں آرہا تھا اور دیکھنے کی ہمت اس میں کم از کم اس وقت نہیں تھی۔

"ارے واہ بھئی اس دفعہ شوکت نے قیمہ صحیح نہیں بنایا تھا تمہارے ہاتھ کے بنے کوفتے جو کبھی روئی ملائی سے نرم ہوتے تھے مانو آج تو ایکدم اخروٹ لگ رہے تھے۔"

نانی نے بھی کمر پہ ہاتھ رکھ کر بولتے ہوئے ڈرائنگ روم میں انٹری دی تھی یہ الگ بات کہ ان کی نظر لبنیٰ بھابھی پر ہی پڑی لیکن بیٹھتے ہی انہوں نے اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر بھابھی کو دیکھ لیا اور ایک دم بولیں۔

"کوئی سنو بیٹا میں نے تمہیں بھیجا تھا کہ رسید ہے کہ نہیں اور تم ہو کہ اتنی دیر سے واپس ہی نہیں آئیں حالانکہ رسید تمہارے سامنے بیٹھا ہے خود مجھے آنا پڑا دیکھنے۔"

نانی کی بات پر اس کے جسم میں کرنٹ دوڑا تھا۔ فوراً" سے آنکھیں اٹھا کر جو دیکھا تو ایک بار پھر انسلٹ کا کوہ گراں جیسے دل پہ جا گرا۔

"رسید۔ رشید۔" وہ زیر لب بولی۔

"السلام علیکم دراصل میں کچھ اور سمجھی تھی۔"

"نہیں بھابھی آپ کا قصور نہیں لوگوں کی اکثریت شادی کے بعد کچھ اور کو کچھ اور ہی سمجھتی ہے۔ کیونکہ بیچارا لفظ لکھا "کچھ اور" جاتا ہے پڑھا "کچھ اور" جاتا ہے اور سنا اور سمجھا "کچھ اور" جاتا ہے۔"

وہ بھی یقیناً "اسی خاندان کا سپوت تھا یہ اس کی بات سے ہی ثابت ہو گیا تھا اور روشنی چونکہ آنسو ضبط کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی سو جلدی سے ان کے قہقہوں کی آڑ لیے وہاں سے غائب ہو گئی۔ زور کا جھٹکا واقعی اسے بڑی زور کا لگا تھا۔۔۔!!

☆ ☆ ☆

اتنے بہت سے دنوں کی برداشت کا لاوا روشنی کے اندر اب دبا رہنا ناممکن ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کم از کم کرن سے بات کر کے اسے تمام حالات بتائے اور اسے بتائے کہ وہ کتنی "مشکل زندگی" گزار رہی

ہے جہاں ہر کوئی اس کی انسلٹ کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔ لیکن یہی تو مشکل تھی کہ وہ سب کے سامنے لینڈ لائن سے یہ سب باتیں کرنا نہیں چاہتی اور گھر میں موبائل کے سگنلز غریب کے گھر میں راشن کی طرح کم کم ہی آتے تھے۔

"روشی چاچی آپ کا فون ہے' چاچو نے کہا ہے جن (سن) کے فون واچ (واپس) بھیج دیئے گا۔"

حمزہ نے اندر آکر اسے عماز کا فون دیا تو وہ خوشی میں اسے پیار کیے بنا رہ نہ سکی بلکہ آج تو اس نے فوراً ہی اپنے سائیڈ ٹیبل سے چاکلیٹ بھی نکال کر تھما دیا۔

"روشی چاچی آپ اتنی حوچ (خوش) کیوں ہو رہی ہیں؟ میں تو ھمجا (حمزہ) ہی ہوں۔" چھ سالہ حمزہ بھی اس کے رویے پر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا تھا۔ لیکن جواب میں روشنی نے اس کے گپلو گپلو سے گال پر ایک اور kiss کی اور فون پر منتظر کرن کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آج تو شاید میں اللہ سے کچھ اور بھی مانگتی تو مل جاتا۔" آواز میں کھنک نمایاں تھی۔

"تم ہمیشہ ہی ناشکری رہ کر اپنے انسان ہونے کا ثبوت وقتاً" فوقتاً" دیتی رہا کرو تاکہ ہمیں کوئی شک نہ ہو۔" کرن ہنسی۔

"اچھا فضول باتیں نہ کرو یہ بتاؤ آج عماز کے فون پر کیسے کال کر لیا۔؟"

"تمہارے گھر کا فون کافی دیر سے بزی تھا اور تمہارا موبائل ویسے ہی بے چارہ ہمارے سفارتی عملے کی طرح خاموش تماشائی بنا رہتا ہے۔ سوچا عماز بھائی کے موبائل پر کر کے ان سے بھی بات ہو جائے گی اور اسی بہانے تم سے بھی۔"

"بہت اچھا کیا' خود میرا بھی اس وقت بہت دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو۔"

"خیریت؟ کہیں پھر تم پر تو حساسیت کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔" کرن لمحہ بھر میں بات کی تہہ تک جا پہنچی تھی۔

"میں کوئی نفسیاتی مریض نہیں ہوں کرن لیکن میرے اور ان سب کے مینٹل لیول میں بہت فرق ہے۔"

"فرق کم ہو یا زیادہ' ہو تو سب مینٹل ہی نا۔"

کرن نے اس کے لہجے میں چھپی ٹینشن کو محسوس کرتے ہوئے اسے ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

"وٹ آ کولڈ جوک کرن۔"

"اچھا تو تمہیں کوئی ہاٹ جوک چاہیے' ہم م م م م۔!؟ مجھے کوئی جوک ماسٹر سمجھ لیا ہے' شرم کرو تمہاری چھوٹی بہن ہوں' آئندہ پلیز ایسی بات نہ کرنا۔"

"اوکے میں فون رکھ رہی ہوں' جس پر خود نہ بیتے وہ کسی کی پریشانی میں کبھی انٹرسٹ نہیں لیتا۔" روشنی آج اس کی ادھر ادھر کی باتوں پر گز گز بھر لمبے قہقہے لگانے کے بجائے بور ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے سوری کرنے پر دوبارہ بولی۔

"مجھے ہر ہر طرح سے شرمندہ کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں سب' جان بوجھ کر کچھ ایسا کرتے ہیں کہ میری انسلٹ ہو۔ عماز سے کہوں تو وہ بھی میری باتوں پر ہنس دیتے ہیں اور بس۔ پتا نہیں کیا دیکھا تھا امی نے جو مجھے یہاں بیاہ دیا۔" بات کرتے کرتے وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"او ہو روشنی مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم رائی کا پہاڑ کیوں بنا رہی ہو۔ یہ میں بھی جانتی ہوں کہ وہ لوگ بہت صاف دل کے ہیں اور پھر عماز بھائی خوبصورت ہیں' اپنا کلینک چلاتے ہیں۔ ایک ہی ایک تمہاری نند ہے وہ بھی چند ماہ تک بیاہی جائے گی سر ہیں نہیں' جیٹھ صاحب بیرون ملک ہوتے ہیں' اکلوتی تمہاری جیٹھانی ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔ اور کیا دیکھتیں امی تمہارے لیے؟ بتاؤ۔ بس مسئلہ صرف یہ ہے کہ تم بہت ہی نیگیٹو سوچنے لگی ہو اور۔۔۔"

اس سے پہلے کہ کرن اسے مزید کچھ سمجھاتی روشنی نے نا صرف یہ کہ فون بند کیا بلکہ اسے پاور آف کر دیا۔ یہ سوچ کہ ہر کوئی اسے ہی غلط سمجھتا ہے اور ثابت کرتا ہے ذہن پر بری طرح سوار ہو گئی تھی۔

کیا کرے اور کس سے کہے جو بس اسی کی بات سنے تاکہ اس کا دل ہلکا ہو سکے۔ سوچتے سوچتے جب کچھ بن نہ پڑا تو کوئی میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ مختلف کہانیاں' تبصرے' سلسلے گویا ایک الگ ہی جہان آباد تھا ان اوراق میں۔

اور تبھی اس کے بھی ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔ سوال میں نت نئی حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے رات ہونے کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ اپنا خیال عماز سے ڈسکس کر سکے۔

☼ ☼ ☼

"تم۔ لکھنا چاہتی ہو اور وہ بھی افسانے اور ناولز۔" عماز نے طنزیہ سوال کیا تھا۔

"لیکن کیوں بھئی؟"

"تو اس میں برائی ہی کیا ہے عماز' میں اپنے فارغ وقت کو یوٹیلائز کرنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"تو بھئی اور کتنے کام ہیں فارغ وقت کے۔ بلکہ سب سے بڑھ کر اماں سے گپ شپ کیا کرو۔ مومو اور بھابھی سے دوستی بڑھاؤ۔" بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے انہوں نے بڑا آرام دہ مشورہ دیا تھا۔

"وہ سب تو میں کرتی ہی ہوں لیکن میں لکھنا چاہتی ہوں میرے اندر یہ صلاحیت ہے تو میں اپنے علم اور لائف ایکسپیرینسز کو لوگوں کے سامنے لانا چاہتی ہوں تاکہ انہیں بھی کچھ فائدہ ہو۔" سیدھے لفظوں میں تو وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے آپ کا کتھارسس چاہتی ہے دل کی بھڑاس اور لاوے کو باہر نکال پھینکنا چاہتی ہے لیکن ظاہر ہے نرم لفظوں میں یہی کہہ کر چپ ہو گئی۔ البتہ ہاتھوں پر کریم کا مساج بڑے پروفیشنل طریقے سے جاری تھا کہ اس کے خیال میں جب سے اس نے کام کاج کرنا شروع کیا ہے اس کے ہاتھ کھردرے اور بے رونق ہوتے جا رہے ہیں۔

"لائف۔ ایکسپیرینسز؟" عماز نے قہقہہ لگایا اور اٹھ بیٹھے۔

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

اب تک انداز میں مزاح نمایاں تھا۔

"ایسے کون سے تجربات ہو گئے ہیں اس ننھی سی عمر میں؟"

"عماز آپ بھی نا۔ بال کی کھال اتارتے ہیں۔" خاطر خواہ رسپانس نہ ملنے پر وہ زچ ہو گئی تھی۔

"تمہیں پتا ہے فادر آف فلاسفی سقراط نے کبھی بھی کچھ نہیں لکھا یہی نہیں افلاطون نے کبھی نہیں لکھا خود شاہ عبداللطیف نے اپنی کوئی رباعی حوالہ قلم نہیں کی۔ بلکہ سب لکھنے کے بجائے سکھانے پر یقین کرتے تھے۔"

عماز نے گود میں کشن رکھا اور سنجیدگی کے میدان میں آخر پہلا قدم رکھ ہی دیا۔

"میرے دل میں اتنا کچھ جمع ہوتا جا رہا ہے عماز اگر میں نے نہ لکھا تو شاید میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' کے مصداق وہ پھنس گئی تھی۔

"دل میں ہے یہ تو بہت اچھا ہے نا۔ دیکھو جب بخارا کو فتح کیا گیا تو سارے قرآن شریف نعوذ باللہ نذر آتش کر دیئے گئے۔ ستر سال تک قرآن پاک کی تلاوت پر پابندی رہی لیکن چونکہ دلوں میں محفوظ تھا اس لیے اس سب سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ۔۔۔"

"اللہ کا واسطہ ہے عماز لائٹ بند کر دیں میں اب ایک لفظ بھی سننا اور بولنا نہیں چاہتی۔"

روشنی کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ دیوار پر سر مار کر اپنا ہی سر پھوڑ لے کہاں کی بات کو عماز کہاں لے جا رہے تھے۔

"ویسے بات سنو تم میرے سامنے دل ہلکا کر لیا کرو نا۔ میرے ہوتے ہوئے کسی کی کیا ضرورت ہے تمہیں۔" عماز نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لائٹ آف کر دی تھی۔

"بس پتا نہیں دل بہت پریشان رہتا ہے عماز۔" اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روشنی نے گالوں پر لڑھک آنے والے آنسوؤں کو چپکے سے مسل دیا تھا۔

"پاگل اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" چوری

پکڑی گئی تھی سو کھل کے رونے میں کیا مضائقہ تھا تبھی اس نے باندھے گئے سارے بند توڑ دیے۔

"صبر سے ہوتے ہوئے بھلا تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی بھی پریشانی مجھ پر آنے کے بعد ہی تم کو چھو سکے گی۔ اب یہ حق میں کسی کو دوں اتنا پاگل سمجھا ہے کیا؟"

عماز نے بڑی لگاوٹ سے کہا تھا جس سے وقتی طور پر روشنی بھی کچھ بھول کر عماز جیسے ساتھی کی رفاقت پر ناز کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آؤ آؤ روشنی۔ میں یہ چائے گرانے ہی والی تھی اچھا ہوا تم آگئیں لو پی لو۔"

روشنی کچن میں پہنچی تو بھابھی سارے برتن سنک میں رکھنے کے بعد سلیبز بھی اچھی طرح چمکا چکی تھیں۔ یوں بھی وہ خاصی صفائی پسند واقع ہوئی تھیں۔ پلاسٹک کے برتنوں کو بھی بعض اوقات اسٹیل وول سے جگمگانے کی کوشش کرتیں۔ اب بھی کئی سال پرانا برتن بلا مبالغہ نیا معلوم ہو رہا تھا۔ رات کو سنک میں جھوٹے برتن پڑے ہونے سے چونکہ بے برکتی ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لیے چاہے کتنی ہی رات ہو جائے۔ تھکن سے بے شک نڈھال ہی کیوں نہ ہوں ایک گلاس بھی بغیر دھلا نہ رہنے دیتیں۔

یہ الگ بات کہ ان کا ساتھ دینے کو مہو ہر وقت حاضر رہتی اور دونوں ہاتھوں سے بجنے والی تالی کی خوش گوار آواز نے سارے گھرانے کو پرسکون بنا رکھا تھا۔

"ہاں۔ ہاں بھابھی پی لیں اچھا ہے ضائع ہونے سے بچ جائے گی بلکہ کام ہی آئے گی۔"

مہو نے حسب معمول ہنستے ہوئے ایک اور ٹکڑا لگایا تو روشنی کا بے اختیار دل چاہا کہ اس کے مٹھی بھر بالوں کو کھینچ ڈالے۔

"تو کیا مجھے ڈسٹ بن سمجھ رکھا ہے۔" کوشش کرنے کے باوجود لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"نہیں میری جان تم تو ہمارا افلاور واز ہو جس کی مہک سے ہی سارا گھر خوشبودار ہے۔"

بھابھی نے الیکٹرک کیتلی میں اس کے لیے چائے تیار کرنا شروع کی تھی۔

"ہونہہ۔ تھی خوشامدی ہیں۔" روشنی نے سوچا اور تازہ چائے پینے کے لیے اپنا حق سمجھتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی۔

"باتوں کے طمانچے بھی مارتی ہیں اور چاپلوسی کے رومال بھی آنسو صاف کرنے کو ساتھ ہی پکڑا دیتی ہیں۔"

"بھابھی سنا ہے آپ لکھنا شروع کر رہی ہیں۔"

مہو نے لال کو سبزی کاٹنے کے لوازمات دے کر آنے کے بعد چسکیاں لیتی روشنی سے کہا تو وہ چونک گئی۔

"ڈری لیکس یا عماز لیکس؟" اس کی معلومات پر وہ حیران ہوئی تھی۔

"ہاں بھئی قرۃ العین حیدر کے انتقال سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے اب روشنی ہی پورا کرے گی۔" بھابھی نے برتن دھوتے ہوئے بغیر رخ موڑے کہا۔

ایک اور طمانچہ بڑی زور سے لگا تھا۔ اور اس دفعہ وہ بول ہی پڑی۔

"بھابھی آپ میرے ہر معاملے میں ٹانگ نہ ہی اڑایا کریں تو بہت مہربانی ہوگی، جب بھی آپ کے پاس بیٹھو کسی اسٹیج ڈرامے کے ہال میں بیٹھنے کا خیال آتا ہے۔ کبھی تو فقرے بازی کے بغیر بھی بات کیا کریں۔"

"لیکن میں نے ایسا کیا کہا؟" اس کی بات پر وہ ہونق سی تو ہو گئی تھیں۔

"کب نہیں کہا؟ ہمیشہ۔ ہی آپ لوگ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ بات بات پر طنز اور میری انسلٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اپنی رابطہ حانی قائم رکھنے کے لیے مجھے ڈی گریڈ کرتی رہتی ہیں۔ پلیز مجھے بخشیں اور میرا سکون برباد نہ کریں۔" بھابھی اور مہو اس کی سوچ جان کر نہایت رنجیدہ ہو گئی تھیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنی صفائی دیتیں سالن لگے ہاتھ دھو کر فوراً ساتھ ہی



موجود تولیے سے خشک کیے اور اس سے پہلے کہ کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتیں عین چوکھٹ کے درمیان عماز کو کھڑا دیکھ کر گڑبڑا گئیں۔

"روشنی۔" عماز کی سرد آواز پر روشنی مڑی اور غیر متوقع آمد پر حیران ہو گئی۔

"آپ وہ۔"

"معافی مانگو بھابھی سے۔" دوٹوک لہجے میں صرف فیصلہ سنایا گیا تھا۔ نہ جرح نہ بحث!

"لیکن عماز اس میں میری کوئی۔"

"میں نے کہا معافی مانگو بھابھی سے۔" چند لفظوں کے جملے کو۔ چبا کر ادا کیا گیا تھا۔

"عماز آپ میری بات تو سنیں نہیں سنے۔۔۔"

"چھوڑو عماز اتنا سیریس نہ لو یہ سب تو ہوتا رہتا ہے، پلیز۔"

"بھابھی آپ تھوڑی دیر یہیں رکیں۔" عماز نے انہیں کچن سے نکلنے نہیں دیا تھا۔

"روشنی تم نے سنا نہیں۔" نظریں اس کے چہرے پر گاڑے انداز انتہائی حاکمانہ تھا۔ لیکن جواب میں روشنی محض عماز کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تم ہی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد بستے بستے گھر کو اجاڑ کر ان کا تنکا تنکا بکھیر دیتی ہیں۔ ارے پہلے تو تم بڑی خوش مزاج تھیں پر اب اپنا کون سا روپ دکھانے والی ہو تم۔ میں نے کہا معافی مانگو بھابھی سے سنا نہیں تم نے۔"

اتنی انسلٹ اور وہ بھی مہو اور بھابھی کے سامنے۔ روشنی نے ایک نظر تینوں کو دیکھا اور آخر بول ہی پڑی۔

"نہیں مانگنی مجھے معافی، میری غلطی نہ ہونے کے باوجود آپ صرف انہیں خوش رکھنے کے لیے میری انسلٹ کر رہے ہیں اور بس۔ بستے بستے گھر کو مجھ جیسی لڑکیاں نہیں آپ جیسے مرد اجاڑتے ہیں جو رشتوں میں توازن نہ رکھتے ہوئے تھالی کے بینگن کی طرح اپنے گھر والوں کی طرف لڑھکتے رہتے ہیں۔"

زور و شور سے بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ کیا کہہ رہی تھی اس کا اندازہ شاید خود اسے بھی نہیں تھا۔

"تمہیں اس گھر میں میرے علاوہ اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکا کہ تم کس قدر تھرڈ کلاس اور گھٹیا سوچ کی لڑکی ہو جو کسی شو پیس کی طرح ایک کونے میں پڑا رہنے پر ہی خوش رہتی ہیں نہ کہ گھر کا فرد بننے میں۔"

"نہیں رہنا مجھے اس نام نہاد گھر میں، جن کا ہے انہیں مبارک۔"

ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے مہو اور بھابھی کو دیکھا اور ان کے روکنے کے باوجود کوئی بھی چیز لیے بغیر کلینک کے رستے باہر نکل کر رکشا لیے میکے جا پہنچی، تائی اور اماں کی منتیں بھی اس کے بڑھتے قدم نہیں روک پائیں اور عماز جو سوچ رہے تھے کہ کچھ بھی ہو وہ تائی اور اماں کے کہنے پر تو ضرور رک جائے گی۔ بالکونی میں کھڑے نہایت دکھ اور رنج سے محض اسے دیکھتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"پاگل ہو گئی ہو تم، دماغ خراب ہے تمہارا اور بس، اچھے خاصے بسے بسائے گھر کو اس طرح چھوڑ کر آنا کہاں کی عقل مندی ہے۔" امی اسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر پہلے تو حیران اور پھر اس کی زبانی سب احوال سن کر بہت پریشان ہو گئیں۔

"امی آپ اسے بسا بسایا گھر سمجھتی ہیں، جہاں دن رات سب کی باتیں سن سن کر میرے تن من میں آگ لگ جاتی تھی۔"

صوفے پر پاؤں اوپر چڑھائے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے وہ امی کے استقبال سے بڑی مایوس ہوئی تھی۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ امی اور کرن اسے حوصلہ تسلی دے کر ان سب کو برا بھلا کہیں گی اب خود برا بھلا سننے پر مزید تلملا گئی تھی۔

"دیکھو اس بند کرو اپنی ناشکری ہو تم اور کچھ نہیں، ایک مثالی خاندان میں بیاہا تھا تمہیں، آس پڑوس والے بھی ان کی تعریفیں کرتے ہیں کیڑے نظر آئے اور تو صرف تمہیں اس کپتی کو نہیں۔"

"اور امی کپڑے بھی اسے اسی وقت نظر آنے چاہئیں۔ جب آہستہ آہستہ انہوں نے اس کی توجہ کام کرنے پر دلائی' پہلے تو اسے کوئی پرابلم نہیں تھی۔" کرن نے بھی ٹکڑا لگایا۔

"ہاں' ہاں اسے تو ایسا سسرال چاہیے تھا جو اسے بہو کی طرح نہیں کسی مریض کی طرح رکھتا' تینوں وقت کھانے کا ٹرے بیڈ پر' دھلے دھلائے استری شدہ کپڑے الماری میں' کنگھی کرنے منہ دھلانے کے لیے ملازمہ اور ہاں روز شام کو تفریح تو لازمی ہو۔" امی نے طنزیہ کہا تو وہ رونے لگی۔

"ملازمہ تو انہوں نے ہٹادی ہے' اب میں جو مل گئی ہوں انہیں کام کرنے کے لیے۔" اس کے رونے پر امی بھی نرم پڑ گئی تھیں اور کرن نے بھی اسے اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی' لیکن روشنی نے جھٹک دیا۔

"بیٹا بات کو توڑ موڑ کر پیش نہ کرو' کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہاری کام والی نے بیٹے کی شادی کے لیے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔"

"ہاں' ہاں اپنی بیٹی کی ہر بات غلط اور غیروں کی سب صحیح۔"

ان کی بات پر وہ چپ چاپ کراہتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شیروں کی طرح گھر میں داخل ہونے والی روشنی کو اب بھیگی بلی بنانے کے بعد ایک دوجے کو دیکھ کر امی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور کرن' عماز کو فون کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

روشنی کو میکے آئے چوتھا روز تھا اس دن کے بعد سے امی اور کرن نے دوبارہ روشنی سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جس پر وہ ایک بار پھر رونے لگتی۔ ابا بات شروع کرتے تو کنی کترا کر وہاں سے اٹھ جاتی' لیکن آخر کب تک' رات کے کھانے کے بعد انہوں نے کرن سے چائے کی فرمائش کی اور روشنی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"بیٹا ایک چھوٹی سی حکایت سنو' کہا جاتا ہے کہ ایک صوفی بزرگ تھے جو الفاظ کی طاقت پر بڑا یقین رکھتے تھے' ایک دن اپنے عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں بیٹھے وہ اسی موضوع پر بات کر رہے تھے کہ ایک اعلا تعلیم یافتہ نوجوان جو شاید اپنے دوست سے ان کی زبان میں تاثیر کے بارے میں سن کر آیا تھا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔"

"او بابا جی کیوں ان بے چارے ان پڑھ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا دھندا چلا رکھا ہے۔ کچھ نہیں ہوتے یہ الفاظ اصل چیز ہے عمل جو بندہ کرے اور اس سے دنیا بدل دے۔" روشنی کے ساتھ امی بھی بڑی توجہ سے یہ قصہ سننے لگیں۔

"اب وہ بابا جی جو تھے کہنے لگے۔"

"او بے وقوف' نابکار' کم عقل' بوگس ڈگریاں لے کر تو کیا ثابت کرنے چلا ہے' رہے گا تو' تو اسی سطحی سوچ کا۔"

"اب بیٹا اس نوجوان نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنی بے عزتی اور وہ بھی اس بھرے ہجوم میں اس سے بھلا کہاں برداشت ہو سکتی تھی' جبھی آستینیں چڑھائے بابا جی کی طرف بڑھنے کو ہی تھا کہ وہ مسکرائے اور بولے۔"

"برخوردار یہ ہے الفاظ کی طاقت! میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس سے تم اپنے آپے سے باہر ہو جاتے' ہاں البتہ کچھ الفاظ ضرور ادا کیے تھے جو تم سے برداشت نہ ہوئے۔"

"بس ان بزرگ کا یہ کہنا تھا کہ وہ نوجوان معافیاں مانگتا ان کا پکا مرید ہی ہو گیا۔"

کرن نے سب کو چائے سرو کی اور فلور کشن لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

ابا نے چند لمحے رک کر حسب عادت گرما گرم چائے کا گھونٹ لیا اور روشنی کے تاثرات جانچنے لگے جو سر جھکائے کپ کے ڈیزائن میں محو نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سمجھ تو وہ گئی تھی کہ ابا اب اس سے کیا کہنے والے ہیں' لیکن تمہید اتنی زبردست تھی کہ آج وہ چاہنے کے باوجود بھی اٹھ نہیں پائی تھی۔



"شاید جس وقت تمہاری شادی ہوئی تو ارد گرد لوگوں سے سن سن کر تم نے اپنے ذہن میں یہ خاکہ بنا رکھا تھا کہ سسرال میں تو سبھی برے ہوتے ہیں' اس لیے تمہیں وہ سب برے ہی لگے۔ اگر تم گندی عینک پہن کر دنیا کو دیکھو گی تو ظاہر ہے وہ گندی ہی لگے گی نا' لیکن اس میں قصور ظاہر ہے دنیا کا نہیں تمہاری اس عینک کا ہو گا جسے تم ہی کو بدلنا پڑے گا۔" ابا نے چائے ختم کر کے کپ کرن کو تھمایا تو امی کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"ارے لڑکیاں تو ہزار جتن کرتی ہیں سسرالیوں اور خاص کر شوہر کو اپنا بنانے کے لیے' لیکن اس کی تو گنگا ہی الٹی بہتی ہے۔"

"تم خود سوچو بیٹا' کبھی ان سے بات کرتے وقت تم نے الفاظ کے چناؤ کے بارے میں لمحہ بھر بھی سوچا۔" ابا نے امی کو ہاتھ کے اشارے سے چپ کروا دیا تھا۔

"نہیں نا' جو دل میں آیا کہہ دیا اور پھر سب کے سامنے عماز کی بے عزتی کر کے یہاں آ گئیں' کیا تم نے ٹھیک کیا؟" روشنی نے خاموشی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"ان کی ہر بات کو منفی انداز میں سوچ سوچ کر تم نے بات یہاں تک پہنچا دی۔"

"لیکن ابا وہ سب باتیں ہی منفی کرتے تھے۔" کمزور دفاع کی دلیل پیش کرتے ہوئے روشنی کی آواز بھی نہایت ہلکی سی تھی۔

"چلو ایک اور مثال دیتا ہوں چھوٹی سی۔" آج وہ ہر صورت اسے اقرار جرم کروا کر سیدھا راستہ دکھانا چاہتے تھے۔

"دو ٹماٹر لے کر انہیں دو الگ الگ گلاسوں میں اے اور بی لکھ کر ڈال دو۔ اے والے گلاس کو اٹھاؤ اور ٹماٹر کو مخاطب کر کے اس سے اچھی اچھی پیاری اور میٹھی باتیں کرو اس کی تعریفیں کرو' اپنے دل کی اچھی باتیں کہو اور شیلف پر رکھ دو پھر بی والے گلاس کو اٹھا کر اس ٹماٹر سے نفرت بھری باتیں کرو اپنے دل میں آنے والی تمام منفی سوچیں یا جذبات اس پر ظاہر کرو اور دوبارہ شیلف پر رکھ دو۔"

کرن اور روشنی مسکراتے ہوئے جبکہ امی استہزائیہ تاثرات لیے ان کی بات ختم ہونے کے انتظار میں تھیں۔

"سات دن تک یہ عمل ایک وقت مقررہ پر کرنے کے بعد تم خود دیکھو گی کہ اے والا اچھا یعنی تروتازہ ہی رہے گا اور بی والا برا یعنی گلنا سڑنا شروع ہو جائے گا' باوجود اس کے کہ تم نے ایک جیسے ٹماٹروں کا انتخاب کیا تھا لیکن ان پر صرف تمہاری منفی اور مثبت سوچ اور محبت یا نفرت بھرے الفاظ اثر کر گئے۔"

ابا نے بات ختم کر کے فاتحانہ انداز میں تینوں کی طرف داد وصول کرنے کی نیت سے دیکھا لیکن تینوں ہی نے شاید پاکستان اسپورٹس فیڈریشن کی طرح ٹیلنٹ کی قدر نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"ابا۔۔۔ آپ بھی نا بس۔" کرن نے جس انداز سے کہا تھا روشنی سمجھ نہیں پائی کہ وہ ہنس رہی ہے یا منہ بسور رہی ہے۔

"ارے بھئی میں نے خود کر کے دیکھا ہے ذاتی تجربہ ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ بات غلط نکلی تو پانچ سو روپے لے لینا مجھ سے۔۔۔ لیکن ہاں یقین لازمی ہے۔"

"لوگوں کو پکانے کے لیے ٹماٹر نہیں ملتے اور یہ کہہ رہے ہیں گلاسوں میں ڈال کر شیلف پر سجا دو' ٹماٹر نہ ہوئے زرافیاں ہو گئیں۔" امی نے اب چائے ختم کی تھی اور کپ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے منہ بنایا۔

"ارے زہرہ بیگم۔۔۔"

"بس بس بہت شوق ہے آپ کو زبیدہ طارق کی طرح نسخے بتانے کا' کبھی تو سنجیدہ بھی ہوا کریں۔"

"چلو تم ہی بانو قدسیہ کی طرح کوئی اچھی اور کھری سی بات کر لو' بھئی میں تو ہلکے پھلکے انداز میں ہی اسے سمجھا سکتا ہوں تاکہ اگر چیزوں پر ہماری بات چیت اور سوچ اثر کرتی ہے تو ہم انسانوں پر تو اس سے کئی گنا زیادہ اثر کرے گی۔ اس لیے اسے صرف اپنی سوچ کو مثبت کرنا ہے باقی حالات خود ہی درست ہو جائیں گے۔ اور اگر

یہ عمارہ کی طرح جھگڑنے مرنے سے پہلے عقل سے کام لے کر عماز سے اپنے کیے پر معافی مانگ لے تو اس میں بھلا برا کیا ہے۔“ ممی پھر رک کر روشنی کی طرف دیکھا۔

”بھئی روشنی بیٹا میں تو اپنے انداز سے ہی سمجھا سکتا ہوں کیونکہ تمہاری ماں کا کانڈا سا کلچر میرے جیسے ڈیشنگ پرسنالٹی والے بندے پر کچھ جچتا نہیں۔“ ابا نے اپنی ازلی خوش مزاجی سے کہا تو روشنی نے بھی مسکراتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

”توبہ ہے بھئی جوانی سے بڑھاپا آگیا لیکن صورت پر غرور کم نہیں ہوا تمہارے ابا کا۔“

اے میری زہرہ جبیں
تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں
اور میں جواں
تجھ پہ...

ابا نے شروع کیا تو روشنی اور کرن بھی مزے سے ان کا ساتھ دینے لگیں کہ اس عمر میں امی کی شرمگیں مسکراہٹ کا بھی الگ ہی انداز تھا۔ اور جب خوشگوار موڈ میں سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھے تو روشنی کے ذہن میں یہ سوچ پاؤں پسارے بیٹھی تھی کہ یہی انداز تو اس کے سسرال والوں کا بھی تھا اسی لیے شادی سے پہلے امی کہتی تھیں کہ روشنی تمہارے لیے ایسا سسرال پسند کیا ہے جہاں جاکر تم اپنے میکے کی طرح قہقہے لگا سکو نہ کہ زبردستی سنجیدگی کی چادر میں اپنی شخصیت کو ختم کرنا پڑے۔“

اور اس دفعہ اس نے ذرا مثبت انداز میں سوچا تو ساری کی ساری غلطیاں اس کی اپنی ہی نکلیں۔ جبھی کرن کا موبائل لے کر ٹیرس پر آگئی جہاں سے گھپ اندھیرے میں چھوٹی سے چھوٹی لائٹ بھی اپنی پہچان کا پتا دے رہی تھی۔

”ہیلو عماز۔“ دوسری جانب سے فون ریسیو ہوتے پر وہ بے تابی سے بولی تھی۔

”ارے واہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تم ہی کو یاد کر رہا ہوں۔“ عماز کی آواز میں خوشی اور حیرت ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھیں۔

”رہنے دیں میں آپ سے بہت خفا ہوں۔“

”تمہیں منانا تو مجھ سے زیادہ کس کو آتا ہوگا لیکن وجہ بھی تو پتا چلے۔“

”کتنے دن ہوگئے مجھے یہاں آئے اور ایک فون تک نہیں کیا۔“ عماز سے بات کرتے ہوئے شاید وہ بھول گئی تھی کہ اس نے فون عماز سے معافی مانگنے کے لیے کیا تھا۔

”او یار ناراض نہ ہو... بھلا اگر کرن نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو کیا میں اتنے دن رکتا۔“

”کیا؟ کرن نے آپ سے مجھے فون نہ کرنے کو کہا تھا؟“ وہ حیرت سے چیخی۔

”ہاں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ تم نے مجھ سے مس بی ہیو کیا ہے اس لیے دماغ درست ہونے پر تم خود مجھے فون کرو گی اور تھینکس گاڈ کہ آج تمہارا دماغ درست ہوگیا۔“

”عماز میں...“ اسے کرن اور عماز دونوں کی ملی بھگت پر غصہ آرہا تھا۔

”ارے ارے رہنے دو ڈیئر مجھے پتا ہے کہ تم نے فون مجھ سے معذرت کرنے کے لیے کیا تھا لیکن رہنے دو کیونکہ میں نے کرن سے بھی کہا تھا کہ مجھے روشنی کا مس بی ہیو برا نہیں لگا۔“ عماز نے روشنی سے کہا۔

”ہاں لیکن کیوں؟“

”بس کیا کروں جس چہرے کے ساتھ مس لگ جائے وہ از خود پیاری لگنے لگتی ہے۔“

اس بار عماز قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

”ہاں میں آپ سے نہیں بولتی۔“ مصنوعی خفگی کا اظہار کیا گیا تھا۔

”ہوں ہوں...

ہم نہ ہوں گے تو کہو کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو“

چند لمحے پہلے قہقہے لگاتے عماز نے بڑے دھیمے اور مسحور کن لہجے میں شعر پڑھا تو روشنی بے اختیار رونے لگی۔ عماز کے سامنے اسے اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگا تھا۔

”آئی ایم سوری عماز آپ بہت اچھے ہیں۔ میں ہی غلط تھی جو ہر صحیح بات کو بھی غلط انداز میں سوچتی رہی۔ لیکن اب... اب مجھے سب سے معافی مانگنا ہے مسز لبنی بھابھی، نانی، اماں سب سے...“ لفظوں کے درست چناؤ کی افادیت تو صحیح معنوں میں اس نے اب سیکھی تھی اور پھر عماز جیسے ساتھی کی محبت پاکر وہ اپنی کی گئی غلطیوں پر مزید نادم ہوگئی تھی۔ ویسے بھی اس کے اتنا کچھ غلط کرنے پر اب عماز کچھ بھی جتانے کے بجائے اسے ریلیکس کررہے تھے۔ ابا نے صحیح کہا تھا کہ اسے ہی اپنی عینک بدلنا ہوگی۔ جو کہ وہ بدل چکی تھی۔

”او یار تم بھی بڑی بے وقوف ہو کتنا اچھا شعر اتنے رومانٹک موڈ میں اگر میں کسی جنگل میں جاکر مورنی کو بھی سناتا تو وہ بھی مور سے آنکھ بچاکر میرے ساتھ ناچنے لگتی۔“

روشنی عماز کی بات پر ہنس دی تھی۔

”اب جاؤ جاکر کچھ سیب ویب کھاؤ تاکہ پتا چلے کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے؟ یہ بے وقت کی برسات نہیں چلے گی... آرہا ہوں کل تمہیں لینے۔“

”لیکن میں تو سیب کھانا چھوڑ دیتی ہوں؟“ لہجے کی معصومیت پر یقین کرنے میں عماز کو لمحہ نہیں لگا تھا۔

”ہائیں سیب کھانا چھوڑ دیے لیکن کیوں؟“

”وہ کہتے ہیں ناکہ ایک سیب روزانہ کھاؤ اور ڈاکٹر سے دور رہو تو بس سیب سے دوری مجھے منظور ہے کیونکہ مجھے تو اپنے ڈاکٹر سیاں کے قریب ہی نہیں بہت قریب رہنا ہے... دل کے قریب۔“

دونوں طرف سے ہوتی سرگوشیاں شاید ساری رات ہی جاری رہتیں لیکن عماز کا جواب سننے سے پہلے ہی کرن کے موبائل کی چارجنگ ختم ہوگئی۔

روشنی نے ایک نظر مسکراتے لبوں سے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا اور پھر آسمان پر موجود ستاروں کے جھرمٹ میں مسکراتے چاند کو ”جو یقیناً“ اسے آنے والے دنوں میں زندگی کے نئے اور پرلطف انداز کی مبارکباد دے رہا تھا۔

رمشا خالد

پورے گھر میں گہما گہمی عروج پر تھی' لڑکیاں ڈھولک سنبھالے دنیا جہاں سے بے خبر ڈھولکی کی تھاپ پر گانے گانے میں مصروف تھیں یہ اور بات کہ دو منٹ کے گانے کے بعد پانچ منٹ ہنسی کا فوارہ اُمڈ آتا۔ بڑی بوڑھی نانیاں' دادیاں تسبیح ہاتھ میں لیے "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" کی تفسیر بنی بیٹھی تھیں جبکہ باقی خواتین دنیا جہاں کے موضوعات زیر بحث لانے کے بعد اب دلہن کی آنے والی بری کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے میں مصروف تھیں دوپہر کے گیارہ بج چکے تھے مگر چائے ناشتے کا دور ابھی جاری تھا۔

"ثمرو آپی آپ کو خالہ جان بلا رہی ہیں۔" کوئی بچہ لڑکیوں کی ٹولی کے پاس آکر بڑی زور سے چیخا تو اس کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔ اس نے پیغام لانے والے کو خوفناک قسم کی گھوری سے نوازنا چاہا مگر تب تک وہ تو دو گیارہ ہو چکا تھا مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔ حالانکہ سب کے ساتھ بیٹھے اسے بمشکل دس منٹ گزرے تھے۔

"ارے تم کہاں چلیں؟" اسے یوں اٹھتا دیکھ کر کئی لڑکیوں نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"ذرا امی نے بلایا ہے بس ابھی آئی۔" سب کے درمیان سے راستہ بناتی وہ بمشکل مسکرائی ورنہ شکل تو ایکدم رونے والی ہو رہی تھی۔

"اچھا سنو' آتے ہوئے ڈانڈیاں بھی لیتی آنا۔" پیچھے سے کسی نے آواز لگائی وہ سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"کیا ہے امی' ابھی ابھی تو میں سب کے درمیان بیٹھی تھی اور آپ نے بلا لیا حالانکہ میری بہن کی شادی ہے مجھے تو ڈھولک سے اٹھنا ہی نہیں چاہیے۔" وہ کچن میں جاتے ہی شروع ہو گئی۔

"بیٹا! آپ یہ بھی تو دیکھیں نا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اگر ہم خیال نہیں رکھیں گے تو کون ان کا خیال رکھے گا۔" بچوں کی طرح منہ پھلا کر شکوہ کرتی ثمرو پر انہیں بے ساختہ پیار آیا اس کا شکوہ بھی بجا تھا اس لیے اس کا گال تھپتھپا کر نرمی سے سمجھانے لگیں۔

"اچھا اب جلدی سے موڈ ٹھیک کرو۔ چائے سرو کرنے کے بعد جو جی چاہے کرتی رہنا اب کوئی نہیں بلائے گا۔" انہوں نے چائے کی ٹرے اسے پکڑاتے ہوئے عندیہ فرصت دیا تو وہ خوشی خوشی چل دی سب کو چائے دینے کے بعد وہ ڈانڈیاں ڈھونڈنے لگی مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھیں۔

"ثمرو! آپ نے ڈانڈیاں دیکھیں میں نے لاؤنج میں صوفے کے نیچے چھپا کر رکھی تھیں مگر اب وہاں تو کیا کہیں بھی نہیں ہیں۔" ہر جگہ ڈھونڈنے کے بعد اب وہ روہانسے انداز میں مہندی کی پلیٹیں گنتی ثمرو سے پوچھ رہی تھی۔

"ڈانڈیا۔" ثمرو نے اس کے پوچھنے پر سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔

"ارے ہاں۔ میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی وہاں بچے خراب کر رہے تھے اس لیے میں نے امی کے کمرے میں رکھ دیں وہاں جا کر دیکھو الماری میں' بیڈ کے نیچے یا پھر شاید میں ہوں گی مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کس جگہ رکھی تھیں۔" بے نیازی سے جواب دے کر ثمرو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کی چیزیں رکھ کر بھول جانے کی عادت سے تو سارا گھر نالاں تھا اس لیے بجائے کچھ کہنے کے ثمرو پاؤں پٹخ کر چل دی۔

امی کے کمرے میں کافی تلاش بسیار کے بعد وہ الماری میں کپڑوں کے نیچے سے ڈانڈیاں برآمد کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی شکر کا سانس لے کر وہ تیزی سے باہر کو لپکی مگر عمیر کا نام سن کر اس کے اٹھتے قدم خود بخود تھم گئے ساتھ والے کمرے میں کچھ خواتین اپنی دانست میں آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں مگر ان کی پست آواز بھی اتنی بلند ضرور تھی کہ یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ اس طرح کی چہ مگوئیاں مہمانوں کی آمد کے بعد سے تقریباً" ہر روز ہی سننے کو ملتیں اور اب تو امی کے سمجھانے پر انہوں نے پروا کرنا

بھی بچھو دی تھی مگر پھر بھی جب بھی ایسی باتیں کانوں میں پڑتیں تو بے ساختہ دل دکھ جاتا۔

"تو بی! تم ڈالیاں سنبھالے یہاں دروازے میں ایستادہ ہو اور وہاں پورے گھر میں تمہاری تلاش جاری ہے اب چلو بھی کیا پریکٹس نہیں کرنی۔" نمو نہ جانے کب تک ان خواتین کی پست ذہنیت پر کڑھتی رہتی مگر حنا کے آکر شور مچانے پر سر جھٹک کر بوجھل قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

مصروف ترین دن کے اختتام پر بہت سے کام نبٹا کر جب وہ سونے کے لیے بیڈ پر آکر لیٹی تو بے ساختہ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی جبکہ اسے یوں کمر پر ہاتھ رکھ کر اسٹائل سے کراہتا دیکھ حمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چھوٹی بہن نمو پر بے ساختہ پیار بھی آیا جو عام روٹین میں پانی کا گلاس بھرنا بھی خلاف شان سمجھتی تھی مگر اب اس کی شادی کی تیاریوں میں ساری نازک مزاجی بھلائے پیش پیش تھی۔ اسے یوں خود پر ہنستا دیکھ کر نمو اسے مصنوعی خفگی سے گھورنے لگی مگر آنکھوں میں غصے کے بجائے پیار ہلکورے لے رہا تھا۔ پیلے بالوں کے جوڑے میں ملبوس، چمکتی آنکھوں میں سپنوں کی سیج سجائے ہنستی حمیرا ایک شب پیاری لگ رہی تھی۔

"نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟" اسے یوں محبت پاش نگاہوں سے اپنی طرف تکتا پا کر حمیرا نے چھیڑا۔

"کیا چڑیلوں کو نظر لگا کرتی ہے۔" نمو نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں تو جواباً حمیرا نے ہاتھ میں پکڑا تکیہ اسے کھینچ مارا۔ وہ ہنستے ہوئے بڑی مہارت سے کیچ کر گئی۔

"حمیرا۔" چند پلوں کی خاموشی کے بعد نمو نے پکارا۔

"ہوں۔"

"کل تمہاری مہندی ہے اور پرسوں رخصتی اس کے بعد تو تم اس گھر کو اور ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ گی تو پھر میں جھگڑا کس کے ساتھ کیا کروں گی۔" بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اسی پل لائٹ بھی چلی گئی۔

"تو بی! تمہارے آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے لائٹ بھی بھاگ گئی۔" اسے یوں روتے دیکھ کر آنکھیں تو خود حمیرا کی بھی بھر آئی تھیں۔ مگر لائٹ کے اچانک چلے جانے پر بھرم رہ گیا اس لیے وہ بات بدلنے کو ہنستے ہوئے بولی جانتی تھی کہ اگر خود پر قابو نہ پایا تو ابھی یہاں بن بادل برسات ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پھر کتنی ہی دیر دونوں چپ چاپ اپنے آنسو پیتے ہوئے جذبات کنٹرول کرنے میں لگی رہیں۔

"اوہو کتنی گرمی ہے اوپر سے یہ مچھر زندگی عذاب کر رکھی ہے ذرا یہ باہر والی کھڑکی تو کھول دو نمی۔" خاموشی کے طویل وقفے سے گھبرا کر اس نے نمو کو آواز دی مگر وہ شاید سو چکی تھی اس لیے چاروناچار خود اٹھنا پڑا۔

سفیدے کے درخت کے عین اوپر بالکل تاج کی مانند جگمگاتا چودھویں کا چاند اور اس کی چاندنی میں بھیگتے خوبصورت لگ رہے تھے کھڑکی کھولتے ہی وہ تو جیسے کھو سی گئی۔

"تاروں بھرا آسمان، پھولوں کو گدگداتی ہوا میں چاند اور اس کی یہ میٹھی چاندنی، شادی کے بعد کیا یہ سب بھی پرایا ہو جائے گا۔" ذہن کی سلیٹ پر یہ سوال ابھرا تو بے ساختہ آنکھیں چھلک پڑیں۔

باہر کچھ خواتین بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کھڑکی کھلی ہونے کے باعث ان کی آواز اس اندر تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ ذہن میں انگڑائی لیتے اوٹ پٹانگ خیالوں سے گھبرا کر اس نے توجہ ان کی باتوں کی طرف مرکوز کر دی کوئی خاتون اپنی شادی کا دلچسپ قصہ چھیڑے ہوئی تھیں وہ بھی بہل گئی۔

"ہائے، وہ بھی کیا زمانے تھے، دیکھنا اور ملنا تو ایک طرف دولہا، دلہن ایک دوسرے کے نام سے بھی نکاح کے وقت آشنا ہوتے تھے۔" قصہ ختم کرنے کے بعد وہ خاتون حسرت سے بولیں۔



"اور نہیں تو کیا میں نے تو خود تمہارے ابا کو دیکھا ہی اس وقت تھا جب انہوں نے میرا گھونگھٹ اٹھایا تھا۔" کسی اور خاتون نے قدرے شرما کر اطلاع دی۔

"بس بہن، یہ تو ہماری خوش قسمتی جو ایسا دور نصیب ہوا۔ آج کل تو مانو شرافت کا جنازہ نکل چکا ہے۔"

"واقعی سچ کہا وہ پہلے زمانے تھے جب شرم وحیا شریف لوگوں کا اوڑھنا بچھونا ہوا کرتی تھی مگر اب تو ماشاء دونوں چیزیں کہیں گئیں چل لیے۔" ساری خواتین اب بساط بھر نئی نسل کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی باتیں سنتی حمیرا ابھی ہولے سے مسکا دی کچھ دیر بعد ایک ایک کر کے وہ سب سونے کے لیے اٹھنے لگیں پہلے جہاں پانچ چھ خواتین بیٹھی تھیں اب وہاں دو بچ گئیں سب کے چلے جانے کے بعد پہلی خاتون دوسری کے ذرا قریب کھسک کر بیٹھ گئیں اور رازداری سے بولیں۔

"کچھ خبر بھی ہے روبینہ آپا! سنا ہے کہ اپنی حمیرا کا بھی پیار چکر چلا تھا۔"

"ہیں کچی فیروزہ مگر کس سے؟" روبینہ آپا جو شادی میں شرکت کی غرض سے آج شام ہی آئی تھیں انتہائی تجسس سے پوچھنے لگیں۔

"ارے اپنے ہونے والے دولہا سے اور کس سے خود ہی سوچو بڑی کے ہوتے منجھلی کا رشتہ کرنے کی کوئی تک تھی وہ بھی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ضرور لڑکی نے ہی گھر سے بھاگنے کی دھمکی دے کر اماں باوا کو مجبور کیا ہوگا اور کیا؟"

"واقعی! یہ تو سوچنے کی بات ہے، ارے میں بھی کہوں یہ ساجدہ پر کیا افتاد آپڑی جو بڑی کو چھوڑ کر منجھلی کو وداع کرنے چلی ہے۔" روبینہ آپا نے سہلاتے ہوئے جھٹ ان کی تائید کی۔

"اور تو اور دولہا کی بہن مایوں والے دن خود کہہ رہی تھی کہ بھابھی تو بڑی پیاری پسند کی ہے بھیا نے۔" فیروزہ نے مزید اطلاع بہم پہنچائی۔

"توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے حالانکہ دیکھنے میں کتنی بھولی دکھتی ہے حمیرا۔" مزے لے لے کر ساری تفصیل سننے کے بعد روبینہ آپا گال پیٹتے ہوئے اب حمیرا کے بخیے ادھیڑ رہی تھیں۔ اور ان کی باتیں سنتی حمیرا کی تو وہ حالت تھی گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں وہ ان کی باتوں کے زیر اثر حیرت و بے یقینی سے بت بنی بیٹھی تھی دونوں خواتین ابھی نجانے کتنی دیر تک بیٹھ کر حمیرا کے کردار کے بخیے ادھیڑتیں کہ حمیرا کی خالہ جو برآمدے میں لیٹی کب سے بے مزہ نہ ہو جانے کے ڈر سے ان کی گل افشانیاں صبر و تحمل سے برداشت کر رہی تھیں ضبط جواب دے جانے پر انتہائی غصہ کے عالم میں ان کے سروں پر آکر گرجیں۔

"یہ آپ دونوں کیسی باتیں کر رہی ہیں ارے کچھ تو خدا کا خوف کریں آپ لوگوں کے سامنے ہی تو کھیل کر جوان ہوئی ہیں ساجدہ کی بیٹیاں، کبھی دیکھی ان کے

کردار میں کوئی ایسی ویسی بات جو یوں بہتان باندھ رہے ہیں۔ جہاں تک لڑکے کی پسند کا سوال ہے بقول آپ کے چکر کا تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں فریحہ کی شادی میں لڑکے نے حمیرا کو دیکھا اور پسند کیا۔ اگلے دن شریفانہ طریقے سے رشتہ بھجوا دیا بس اتنی سی بات ہے جس کا سب بتنگڑ بنائے بیٹھے ہیں اور بڑی کو چھوڑ کر مجھلی کی شادی پر جو آپ کو اعتراض ہے تو کون نہیں جانتا کہ نمو کی میڈیکل کی پڑھائی کا آخر سال چل رہا ہے بھلا ایسے میں حمیرا سے پہلے اس کی شادی کیسے ہو سکتی ہے اور کون سی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی نہیں ہو سکتی بتائیں مجھے۔"

"اوہو سمیرا! تم تو خوامخواہ اتنی ناراض ہو رہی ہو ہم بھلا اپنی بچی پر کیوں بہتان باندھیں گے ہم تو خود بچی کی شرافت کے گواہ ہیں۔"

"اچھا" اور ابھی جو آپ یہ سب کہہ رہی تھیں وہ۔" سمیرا خالہ سخت غصے میں تھیں اسی لیے انہیں آسانی سے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"وہ۔" دونوں کھسیانی ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"ارے بھئی وہ سب ہم اپنی طرف سے تھوڑی کہہ رہے تھے۔ بھئی لوگ کہتے ہیں۔" سارا الزام نادیدہ لوگوں پر ڈال کر فیروزہ آپا نے سونے کے بہانے اندر جانے کی کی۔ روبینہ آپا ان سے بھی آگے تھیں سمیرا خالہ تاسف سے انہیں جاتے دیکھتی رہیں ظاہر ہے اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"حمیرا! لائٹ آف کرو مجھے نیند آرہی ہے۔" اچانک لائٹ آجانے پر تاریک کمرہ انرجی سیور کی تیز روشنی میں ڈوب گیا۔ نمرہ جو غنودگی کی حالت میں تھی بے آرام ہو کر تکیے میں منہ دیتے ہوئے حمیرا سے بولی۔ مگر وہ بغیر کوئی جواب دیے ویسے ہی ساکت بیٹھی رہی۔

"تم سے یہ ذرا سا کام بھی نہیں ہوتا۔" پانچ منٹ گزر جانے کے باوجود جب حمیرا نے لائٹ بند نہ کی تو مجبوراً" جھنجلاتے ہوئے نمرہ کو خود اٹھنا پڑا اسے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ وہ اٹھی تو اپنے قریب ساکت بیٹھی حمیرا کو دیکھ کر ٹھٹک گئی اس کے چہرے پر کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ لائٹ بند کرنا بھول کر اس کی طرف لپکی۔

"بہنا! کیا ہوا' سب ٹھیک تو ہے نا ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" نمرہ کے پوچھنے کی دیر تھی' وہ جو کب سے لاتعداد آنسو روکے بیٹھی تھی' سارے بند توڑ کر اس کے گلے لگ کر زارو قطار رونے لگی۔

"کیا ہوا' کچھ بتاؤ تو سہی۔" اسے یوں روتا دیکھ کر نمرہ بے حد پریشان ہو گئی۔ کافی دیر اس کا کندھا بھگونے کے بعد جب حمیرا کا دل ذرا ہلکا ہوا تو اس کے بے پناہ اصرار پر ساری بات آہستہ آہستہ اسے بتانے لگی۔

"اوہ' تو یہ بات ہے۔" ساری بات بغور سننے کے بعد نمرہ نے خود کلامی کی۔

"دیکھو بہنا! لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے' ہم ان کی زبانیں تھوڑی۔ پکڑ سکتے ہیں' اس لیے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم ان کی باتوں کی پروا ہی نہ کرو۔" نمرہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"ارے واہ کیسے پروا نہ کروں' بے شک یہ ساری باتیں میرے ہونے والے شوہر کے حوالے سے مجھ پر کی جارہی ہیں' مگر نشانہ تو میرا کردار ہی ہے نا جسے اکیس سال' پورے اکیس سال میں نے سینت سینت کر رکھا اور انہوں نے اسے داغ دار کرنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگائے اور تم کہتی ہو پروا ہی نہ کروں۔" حمیرا ان کی باتیں سن کر اندر تک بھری بیٹھی تھی' اس لیے بات کرتے کرتے ایک بار پھر سے ہاتھوں میں منہ دے کر رو پڑی تو نمرہ بھی خود پر ضبط نہ کر سکی اور اسے چپ کراتے کراتے خود بھی رو دی۔

آج جب وہ ڈانڈیاں لے کر آرہی تھی تو ایسی ہی باتوں نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے' مگر چونکہ امی کی سختی سے ہدایت تھی کہ شادی کے موقع پر کوئی بد مزگی نہ ہو اس لیے چاہنے کے باوجود بھی کہنے والوں کی زبانیں روکنے سے قاصر تھی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ حمیرا کی ہونے والی ساس بہت وضع دار خاتون تھیں' انہیں گھر گھر جا کر لڑکیاں دیکھنا سخت ناپسند تھا' وہ پچھلے دنوں ان کے خاندان کی ایک شادی میں اپنے بیٹے مہران کو بطور خاص لڑکی پسند کروانے لائی تھیں۔ حمیرا کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ اس کا چنچل سلونا روپ مہران کی آنکھوں میں گھر کر گیا۔ مہران کی والدہ کو بھی حمیرا اور اس کی فیملی بہت بھائی' انہوں نے دیر مناسب نہ سمجھی اور پہلی فرصت میں رشتہ ڈال دیا۔

آج کل کے دور میں بیٹھے بٹھائے اتنا عمدہ رشتہ مل جانا حمیرا کے والدین کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ حمیرا سے بڑی نمرہ ابھی میڈیکل کے لاسٹ ایئر میں تھی' جبکہ حمیرا پڑھائی مکمل کر چکی تھی' اس لیے انہوں نے دقیانوسیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے خوشدلی سے رشتہ قبول کر کے ایک مہینے کے شارٹ نوٹس پر شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بڑی سے پہلے چھوٹی کی جھٹ پٹ شادی ویسے ہی چند لوگوں کو ہضم نہ ہو پا رہی تھی کہ مایوں کے روز دولہا کی بہن کا یہ کہنا کہ "بھابھی تو بڑی پیاری پسند کی ہے بھیا نے۔" غضب ڈھا گیا فیروزہ آپا جیسے لوگ۔ جو بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر تھے۔ انہوں نے حمیرا کی نند کی سادہ سے لہجے میں کی جانے والی تعریف کا کچھ سے کچھ مطلب نکال لیا اور اپنی پست ذہنیت کو خود تک محدود رکھنے کی بجائے سارے میں نشر بھی کر ڈالا' اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ان کی باتیں کسی کے لیے سوہان روح ہیں۔

دونوں بہنیں ابھی نہ جانے کتنی دیر اس بات کا غم مناتیں کہ دروازے کے باہر قدموں کی ابھرتی چاپ سن کر جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر سوتی بن گئیں۔ آنے والی امی تھیں جو ان کے لیے دودھ لائی تھیں مگر انہیں سوتا دیکھ کر اٹھانا مناسب نہ سمجھا' چند لمحے انہیں پیار بھری نظروں سے تکتی رہیں' پھر لائٹ بند کر کے واپس چلی گئیں' دونوں ہی چونکہ تھکن سے بے حال تھیں' اس لیے جلد ہی اپنا سارا دکھ نندیا پری کو تھما کر اس کی گود میں بے خبر ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

نمرہ یونیورسٹی سے لوٹی تو گھر میں داخل ہوتے ہی غیر معمولی چہل پہل کا احساس ہوا۔ چادر برآمدے میں اتار کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو دو سالہ ننھی میرب اسے دیکھتے ہی نمی خالہ نمی خالہ کہتی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی' جسے اٹھا کر اس نے فوراً" سینے سے لگایا اور والہانہ انداز میں پیار کرنے لگی۔

"سارا پیار بھانجی پر ہی لٹا دو گی یا بہن سے بھی ملو گی۔" حمیرا نے پیار بھرا شکوہ کیا تو وہ میرب کو اتار کر فوراً" اس کی طرف لپکی' وہ آئی بھی تو پورے ایک ماہ

بعد تھی۔ پھر سارا دن جو اکیلے کاٹتے تھیں کٹتا تھا' حمیرا اور میرب کے سنگ جیسے پر لگا کر اڑ گیا۔ حمیرا کا ارادہ ایک' دو دن رکنے کا تھا۔ اس لیے مغرب کے بعد جیسے ہی میرب سوئی وہ اسے امی کے پاس لٹا کر چائے کے مگ لیے نمو کے کمرے میں چلی آئی جو چند سال پہلے ان تینوں بہنوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔

ان تین سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس کی شادی باخیر و خوبی انجام پا چکی تھی مہربان ہم سفر کی سنگت اور بے حد و حساب سکھوں نے اسے بھی سراپا بدل ڈالا تھا۔ نمو کا ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی پچھلے سال اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ دونوں بہنیں اپنے گھروں میں خوش تھیں' ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد امی آج کل نمو کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھیں۔ اس کے ایک' دو اچھے رشتے آئے ہوئے تھے' اسی سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے آج انہوں نے بطور خاص حمیرا کو بلوایا تھا۔

نمو جو بیڈ پر کتابیں پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھی حمیرا کو آتا دیکھ کر کتابیں سمیٹنے لگی۔

"جزاک اللہ' اس وقت چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔" اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ لیتی وہ مسکرائی۔

"ہاں بھئی میکے میں ابھی تمہارے عیش کے دن ہیں' جتنا کر سکتی ہو کر لو' شادی کے بعد خواہ جتنی طلب ہو رہی ہو جب تک خود اٹھ کر نہ بناؤ کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ویسے نمی' ہم یوں کرتا ہمارے دولہا بھائی کو چائے بنانا سکھا دینا اور روز ان سے چائے کی فرمائش کیا کرنا کیا خیال ہے۔" حمیرا آنکھیں گھما کر شرارت سے بولی تو وہ اس موضوع سے بچنے کے لیے کوئی جواب دیے بنا جلدی سے بات بدل گئی۔

"آج دن میں کتنی گرمی تھی نا بس' یہ رات کی سردی ہی بس اب چند دنوں کی مہمان ہے' کیا خیال ہے کل شاپنگ پر چلیں' فروا کی شادی بھی قریب ہے' اس کے لیے بھی کوئی گفٹ لے لیں گے ورنہ بعد میں مجھے اکیلے خوار ہونا پڑے گا' تمہیں تو پتا ہے مجھے اکیلے بازار جانے سے کتنی الجھن ہوتی ہے۔"

"ثمینہ پھوپھو کی بیٹی فروا کی بات کر رہی ہو نا تم؟" حمیرا ذہن پر زور دے کر پوچھنے لگی۔

"تو جی اب تم فروا کو ہی بھول گئیں۔ ساری عمر تو اس کی اسی محلے میں گزری ہے' ابھی چند سال پہلے ہی تو وہ لوگ یہاں سے شفٹ ہوئے ہیں۔" فروا ان کی پرانی محلے دار ہونے کے ساتھ ساتھ دور کی رشتہ دار بھی تھی۔

"ارے بابا' بھولی نہیں بس تصدیق کے لیے پوچھ رہی تھی۔ پتا ہے فروا کی شادی غیروں میں ہو رہی ہے اور تو اور لڑکا بھی اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا بڑا زوردار افیئر چلا ہے دونوں کا تب ہی تو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو رہا ہے۔" مزے لے لے کر کہانی سناتی داستان نمو کے گوش گزار کرتی حمیرا کی نظریں اچانک ہی بلا ارادہ اس طرف بھی نمو سے ٹکرائیں' تو وہ بے ساختہ ٹھٹکی' نمو کی آنکھوں کی بے یقینی نے اسے بہت کچھ یاد دلانے کے ساتھ شرمندہ بھی کر ڈالا' اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے جلدی سے کہا۔

"ارے بھئی یہ سب میں اپنی طرف سے تھوڑی کہہ رہی ہوں' یہ تو لوگ کہتے ہیں۔" نمو کے لب خاموش تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ تاسف بھی ہلکورے لے رہا تھا۔

"زینی اٹھ جاؤ اب۔" اماں نے اس بار انتہائی کوفت اور جھلاہٹ سے اس پر سے چادر کھینچی تھی وہ بھی اتنی ہی بےزاری سے گویا ہوئی۔

"کیا ہے اماں ایک سنڈے کو تو سونے دیا کرو نا۔"

"آپی تم کون سا اسکول جاتی ہو تمہارے لیے تو ہر دن سنڈے ہے۔" سدا کی کام چور فرا نے رشک بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں۔ اماں اس دوران پنکھا بند کر کے باہر جا چکی تھیں۔

"اونہہ ہر دن سنڈے ہے۔" زینی نے منہ بھلا کر اس کی نقل اتاری۔

"تم دونوں کی وجہ سے روز مجھے جلدی اٹھنا پڑتا ہے کسی کو یونیفارم پریس تو کسی کو ناشتا کرواؤ۔" وہ پاؤں میں سلیپر اڑس کر واش روم میں چلی آئی۔ منہ دھو کر باہر نکلی ہی تھی۔ کہ خالہ رضیہ اپنے بھاری بھر کم بکسے اور تین عدد بچوں سمیت دروازہ عبور کرتی نظر آئیں اور ساتھ ہی اپنی شامت بھی۔ اماں خشمگیں نظروں سے اسے ہی گھور رہی تھی۔

وہ صبح پانچ بجے سے اسے آوازیں دے رہی تھیں اور اس نے اٹھتے اٹھتے بھی سات بجا دیے تھے۔ خالہ سے ملنے کے بعد جلدی جلدی سب کے لیے ناشتا بنایا اور پھر صفائی میں جت گئی۔

"بندہ دن ہی دیکھ لیتا ہے۔ پتا بھی تھا مگر اس مہارانی کو نیند سے فرصت کہاں ہے۔" اماں کی صلواتوں کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔

بہر حال گیارہ بجے سب تیار ہو کر ماموں کے گھر پہنچ چکے تھے۔ جو ان کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں تھا۔

"اب فرصت ملی ہے تمہیں پہلے نہیں آسکتی تھیں سو کام ہوتے ہیں۔" سدرہ نے اسے دیکھتے ہی منہ کے زاویے بگاڑے۔

"اچھا بتاؤ کیا کام ہے۔"

"یہ کولڈ ڈرنکس سرو کرو جو بھی آرہا ہے اسے۔"

اور پھر محفل شروع ہونے تک وہ لاؤنج کے دروازے میں ایستادہ رہی تھی اور اسے آج پتا چلا تھا کہ یہ بظاہر معمولی نظر آنے والا کام بھی کس قدر دشوار ہے۔ فرمائشیں پوری کرتے کرتے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

پھر ممانی نے حلیم بنانے کی ڈیوٹی اس کے ذمے لگادی۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ محفل میں آکر بیٹھی تو سامنے ایک برقعہ پوش عورت درس دے رہی تھیں۔

"ان کو بھلا یہ نہیں پتا کہ ظہر کا وقت ہو رہا ہے پہلے نماز ادا کرنی چاہیے۔" زینی کی سماعتیں کسی خاتون کی سرگوشی سے فیض یاب ہوئیں تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ دو خواتین اس کے پیچھے بیٹھی آپس میں مگن تھیں۔

"یہ نیم ملا قسم کی خواتین ایسی ہی ہوتی ہیں ابھی کسی نے کہا بھی تھا کہ پہلے نماز ادا کرلیں تو کہتی ہیں یہ بھی ذکر ہی ہے۔"

اس نے سوچا خاتون صحیح کہہ رہی ہیں ذکر تو اپنی جگہ لیکن نماز تو فرض ہے لہٰذا اس کی ادائیگی پہلے ضروری تھی۔

"آنٹی آپ آئیں میرے ساتھ ہمیں آپ کو جائے نماز دیتی ہوں آپ نماز ادا کرلیں۔" اس نے دونوں کو مخاطب کیا تو وہ جلدی سے بولیں۔

"ارے نہیں بیٹا اب قضا ہی پڑھ لیں گے۔"

"وضو کرنے سے میک اپ اتر جائے گا۔" سدرہ اس کے کان میں گھسی تو اس کا تاسف شدید ناگواری میں ڈھل گیا دوسروں پر تنقید کرنا آسان تھا مگر اپنے اعمال درست کرنا اتنا ہی مشکل۔

☼ ☼ ☼

کھانا کھانے کے بعد بڑے ہال میں سب کزنز، خالہ ماموں وغیرہ کی محفل جمی تھی۔ جب ممانی نے پائپ لگا کر ہال دھونا شروع کردیا۔ گویا یہ واضح اشارہ تھا کہ باقی مہمانوں کے ساتھ تم لوگوں کو بھی اجازت ہے اب اپنے اپنے گھروں کو سدھارو۔

وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھیں۔ کبھی ان کے پاس بیٹھ کر دو گھڑی حال احوال دریافت نہ کیا تھا پیشانی پر ہمہ وقت سلوٹوں کا جال بچھا ہی رہتا۔

اس پر سے ماموں الگ شکوہ کرتے کہ رقیہ کے گھر کو اوہ بنا رکھا ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا مگر اپنی بیگم کی حرکتیں نظر نہیں آتی تھیں۔

"کسی نے ایک بار بھی جھوٹے منہ نہیں کہا کہ چھٹیاں ہیں تو کچھ روز ہمارے ہاں بھی رہو کل تک اس گھر میں کس قدر استحقاق سے رہتے تھے مگر آج۔" رضیہ خالہ کی آواز میں نمی گھل گئی۔

"رہنے کا خیال تو بی بی دل سے نکال دو۔ سال بھر میں ایک دن کے لیے آتے ہیں اور کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ میکے کا بھرم تو اماں کی بدولت تھا۔ جب بھائی ہی آنکھیں پھیر لیں تو بھاوجوں سے کیسا شکوہ۔"

"تم دونوں فکر کیوں کرتی ہو میں ابھی زندہ ہوں جب تک دل چاہے آرام سے رہو۔" اماں کی محبت نے بروقت جوش مارا تھا۔ دونوں اماں سے عمر میں خاصی چھوٹی تھیں اس لیے اماں کا رویہ ہمیشہ ان کے ساتھ مشفقانہ رہا تھا۔ ماں کی کمی تو پوری نہیں کرسکتی تھیں مگر کوشش ضرور کرتیں۔

سردیوں، گرمیوں میں ان کے اور بچوں کے لیے کپڑے سلواتیں۔ عید، بقر عید اور شب برات وغیرہ پر تحفے تحائف خود لے کر جاتیں اور فون پر روز بات تو ہوتی ہی تھی۔

اس لیے زینی کو بھی وہ خالہ کم اور اپنی بڑی بہنیں زیادہ لگتی تھیں دونوں سے اس کی دوستی بھی خوب تھی۔

"او ہو بھئی چھوڑو بھی کیا فائدہ فضول میں سوچنے اور دل جلانے کا موسم دیکھو کس قدر خوشگوار ہے چلو تا کہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔" جھومتے بادلوں کے ساتھ اس کا دل اس حبس زدہ فضا سے فرار کو مچلا تھا سو اس نے جھٹ سے پروگرام تشکیل دیتے ہوئے ان کو بھی اٹھا کر ہی دم لیا۔ پھر ساری شام باہر گزار کر سب خاصے خوش باش واپس لوٹے تھے خاص طور پر بچوں نے تو بہت انجوائے کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی شام ساجد ماموں کا پیغام لیے چلا آیا تھا انہوں نے سب کو ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا۔

"کیا کچھ بن رہا ہے۔" زینی نے ایسے ہی سرسری سا پوچھا۔

"باربی کیو کا پروگرام ہے۔" اس نے اچھا خاصا چٹخارہ لے کر بتایا تو وہ مسکرا دی جانتی تھی کہ وہ کس قدر شوقین ہے ایسے کھانوں کا۔

"اچھا چائے پیو گے یا کولڈ ڈرنک۔"

"ہاں اب تو آپ آفر دیں گی ہی جانتی جو ہیں کہ میں جلدی میں ہوں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گیا تو زینی نے بےنیازی سے شانے اچکا دیے۔

"ویسے یہ چائے ادھار ہے ڈنر کے بعد آپ ہی بنائیں گی سدرہ کا جو شاندہ پی پی کر میں چائے کا ٹیسٹ بھول گیا ہوں۔" وہ دروازے سے پھر پلٹ آیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر بچوں کو آوازیں دینے لگی۔ ابھی سب کو تیار کرنے میں بھی کتنا وقت لگ جانا تھا۔

رضیہ خالہ کا تو جانے کا موڈ نہیں تھا مگر اماں نے سمجھایا کہ اب انہوں نے بطور خاص تو دونوں کے لیے ہی یہ اہتمام کیا ہے نہیں جائیں گے تو بھائی جان کو برا لگے گا۔

آٹھ بجے وہ سب تیار ہو کر ان کے گھر پہنچے لان کے ایک جانب ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تکے اور کباب کی مخصوص خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اس نے اور سدرہ نے مل کر ڈائننگ ٹیبل سجایا۔

ممانی البتہ بڑے ہال میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

ماموں نے بہانہ بنا دیا کہ ان کے سر میں درد ہے اس لیے وہ ریسٹ کر رہی ہیں۔

"کرن جاؤ کولڈ ڈرنکس بھی لے کر آؤ میں نے فریزر

میں رکھی ہیں۔" لوازمات پر نظر ڈالتے ہی کولڈ ڈرنکس کی عدم موجودگی پر انہوں نے کرن کو دوڑایا تو وہ کچھ دیر بعد خالی ہاتھ لوٹ آئی۔

"لے کر نہیں آئیں۔" ماموں سے پہلے ہی سدرہ نے استفسار کیا۔

"امی کہہ رہی ہیں کل لاہور والے مہمان آئیں گے تو وہ ان کے لیے ہیں۔" وہ چھوٹی تھی زیادہ باتیں بنانا نہیں آتی تھیں سو ممانی کا جواب من و عن آکر نشر کر دیا۔ ماموں ہی بھر کر شرمندہ ہوئے۔

"یہ بہت شرارتی ہے ایسے ہی جھوٹ بول رہا میں لے کر آتی ہوں۔" سدرہ کرن کو گھورتے ہوئے اٹھ گئی تو خالہ نے پکڑ کر واپس بٹھا دیا۔

"رہنے دو بیٹھیں بھائی بسم اللہ کریں۔"

ماحول میں اک محسوس کیا جانے والا تناؤ سا در آیا تھا سب خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹوں پر جھکے رہے۔ بچوں نے بھی کوئی شرارت نہیں کی تھی البتہ سجاد کو اپنا ادھار نہیں بھولا تھا۔ زینی نے آنکھوں کے اشارے سے ہی معذرت کر لی۔ اب ممانی کے کچن میں جا کر اتنا حق جتانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"زینی تم بھی چلو نا۔" بچوں کے کپڑے تہ کر کے بیگ میں رکھتی خالہ رضیہ نے رسالہ پڑھتی زینی سے کہا تو اس نے "پھر کبھی" کہہ کر ٹال دیا۔ مگر آج وہ بھی ٹلنے کا ارادہ نہ رکھتی تھی۔

"نہیں اس بار تمہارا کوئی بہانہ نہیں چلے گا میں تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔" اور پھر اماں کی اجازت اور بچوں کے بے حد اصرار پر اسے ہاں کرتے ہی بنی۔

دوسری منزل پر خالہ کی رہائش تھی پہلی پر اس کی ساس، جٹھانی اپنے تین بچوں دو بیٹے اور ایک بیٹی کے ساتھ رہتی تھی ان سے مل کر اوپر آئی درمیان میں کھلا صحن تھا سامنے دو کمرے، برآمدہ، کچن کے دائیں جانب سیڑھیاں اور بائیں جانب واش روم اس سے آگے دو کمرے، ایک کچن اور دوسرا بیڈ روم اور ان سے آگے اوپن ٹیرس تھا۔

وہ دروازہ کھول کر ٹیرس پر چلی آئی کین کی چار کرسیاں اور ٹیبل ٹیرس کے عین وسط میں رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ گملوں کی قطاریں تھیں۔

اسی چھت کے اوپر خالہ کی دیورانی کا پورشن تھا وہ کمرے، برآمدہ اور کچن۔

وہ اس کی آواز سن کر نیچے ملنے آئی تھی اور پھر اپنا گھر دکھانے اوپر لے گئی ابھی حال ہی میں وہ اور خالہ رضیہ اپنی ساس اور جٹھانی سے علیحدہ ہوئے تھے۔

کچھ دیر ان سے گپ شپ لگا کر جب نیچے آئی تو انکل بھی گھر آچکے تھے وہ سب نے مل کر کیا۔

عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ کمرے میں آئی تو بچوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

"زینی آپی کہانی سنائیں۔" اور انہیں کہانی سناتے سناتے وہ خود جانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی مگر کچھ ہی دیر میں خالہ نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

وہ نیند سے بوجھل پلکیں جھپکاتی بمشکل اٹھ کر بیٹھی تو وہ دودھ سے بھرا گلاس لیے کھڑی تھیں۔

"خالہ پلیز دہی بڑے اور آئس کریم کے بعد اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔"

"یہ ہے ہی کتنا سا چلو شاباش جلدی ختم کرو۔" ذرا جو اس کے ملتجی لہجے کا خالہ پر اثر ہوا ہو۔

"اچھا رکھ دیں میں پی لوں گی۔" آخر کار اس نے برا سا منہ بنایا مگر خالہ کے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہ رضامند تھی۔

ان کے جاتے ہی اس نے علی اور عمر کو دس روپے کا لالچ دے کر بمشکل گلاس خالی کروایا۔ اور خود اطمینان بھرا سانس خارج کرتی پھر سے سو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اس کو بھی ہمارے ہی گھر آنا ہے اب جانے کتنے دنوں کے لیے آرہی ہے ایک بار آجائے تو پھر واپسی کا جیسے رستہ بھول جاتی ہے اب بچوں کو اسکول سے چھٹیاں ہیں تو ہمارے سر پر آکر بیٹھنا ضروری ہے کیا۔"

جب سے خالہ کی منجھلی نند نے فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی تھی وہ چلتے پھرتے مسلسل کچھ نہ کچھ بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

دراصل نیچے والے پورشن میں ماربل کا کام ہو رہا تھا تو ان کا سارا گھر الٹا پڑا تھا فی الوقت وہ کوئی مہمان افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے رخسانہ باجی نے اس بار خالہ کو شرف میزبانی عنایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو خالہ سے تو کسی طور پر ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

"اماں نے تو صاف منع کر دیا تھا کہ اب کی بار چھٹیاں سسرال میں ہی گزار لینا لیکن میں نے سوچا رضیہ بھابھی کس مرض کی دوا ہیں۔" رخسانہ باجی نے مسکراتے ہوئے جتنے مان سے خالہ کو دیکھا تھا مگر خالہ نے موٹا بھی ان کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ بلکہ زینی کو ان کے ماتھے کی شکنوں پر ممانی یاد آگئی تھیں وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ خالہ کا تو اٹھنے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

"ارے، اتنے بڑے گلاس کیوں لے لیے جاتی ہو بوتل کتنی مہنگی ہو گئی ہے چھوٹے گلاس لو اور برف زیادہ ڈالنا۔" ابھی اس نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکالی ہی تھی کہ خالہ لپک کر کچن میں آئیں۔

اور اسے ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ خود گلاس بھی نکال لیے برف بھی ڈال دی اور سرو کرنے کے لیے اسے بھیج دیا۔

رات کے کھانے پر بھی عجیب صورت حال تھی۔ آدھا کلو چکن میں ڈھیر سارے آلو ڈال کر خوب لمبا شوربا کیا گیا تھا۔

"خالہ وہ آپ کی مہمان ہے۔" زینی نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کرنا چاہا جسے خالہ کسی خاطر میں نہ لائیں۔

"ہونہہ مہمان۔" انتہائی نخوت سے سر جھٹکا۔

"اور نہیں تو کیا بھابھی کوئی ضرورت نہیں زیادہ خاطر داریاں کرنے کی انہوں نے کون سا قدر کرنی

ہے۔" فریج میں آثار کھنے آئی دیورانی صاحبہ نے بھی اپنی رائے سے نوازنا ضروری سمجھا اور پھر مزید دو چار ان کے خلاف کرنے کے بعد جب ان سے ملنے ڈرائنگ روم میں آئی تو اس وقت ان کا اخلاق مظاہرہ قابل دید تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ناشتے پر بھی مہمانوں کے لیے مینو چینج نہیں ہوا تھا۔

رخسانہ باجی نے اپنا ایک سوٹ دھونے کے لیے نکالا تو خالہ نے ان کے قریب ان دھلے کپڑوں کا ڈھیر لگا کر مشین لگادی۔

جون کا مہینہ صحن میں پھیلی چلچلاتی دھوپ میں وہ ساری دوپہر کپڑے دھوتی رہیں۔ زینی کا دل کڑھتا رہا خود وہ سارے گھر کی صفائی اور ڈسٹنگ کرنے کے بعد اب لنچ کی تیاری کر رہی تھی۔

روٹیاں پکاتے ہوئے انہیں آواز دی۔

"باجی پہلے آکر کھانا کھالیں یہ کپڑے تو دھلتے ہی رہیں گے۔"

"میں پہلے نہالوں پھر آتی ہوں۔" وہ بیگ سے کپڑے نکالنے اسٹور میں گئیں تو خالہ نے واش روم سے شیمپو لا کر کچن میں رکھ دیا۔

"اتنا مہنگا ہے ان کے لیے تو لا کر نہیں رکھا ہوا۔ ابھی خود نہا کر پھر بچوں کو بھی نہلائے گی موٹر چلائے بغیر تو واش روم میں قدم ہی نہیں رکھتی استعمال آیا ہے اس بار۔"

"کیا فرق پڑتا ہے خالہ" انکل کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔" زینی کے لبوں سے پھسل گیا۔

"ہاں تو کیا ان کے لیے کماتے ہیں۔" وہ چمک کر بولیں۔

"بہن ہیں ان کی۔" وہ جتائے بغیر نہ رہ سکی۔

"بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے میں خاموش رہو۔" انہوں نے تو زینی کا بھی لحاظ نہ کیا تھا بل میں آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

☼ ☼ ☼

آج اتوار تھا انکل گھر میں تھے اور بہن کے لیے ان کی نازبرداریاں خالہ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

آج وہ خود کچن میں کھڑے خاص رخسانہ باجی کی فرمائش پر چکن قورمہ، چائنیز رائس اور شاہی بنا رہے تھے۔ زینی ان کی ہیلپ کے لیے کچن میں موجود تھی۔ انکل جب سعودیہ میں تھے تو وہاں ان کا اپنا ہوٹل تھا وہ ایک اچھے شیف تھے۔

البتہ خالہ اپنا غصہ خوب چیزوں کو پٹخ پٹخ کر نکالتی رہیں۔ ایک گھنٹے بعد تمام لوازمات ڈائننگ ٹیبل کی زینت بن چکے تھے۔

"ارے بھائی جان بھابھی کو تو بلالیں۔" رخسانہ باجی نے ٹوکا۔

"وہ بعد میں کھالے گی فی الحال تو اس کے سر میں درد ہے۔ وہ ریسٹ کر رہی ہے۔" زینی کو انکل کے پست لہجے میں ماموں کی جھلک دکھائی دے گئی ممانی کو بھی ایسے ہی موقعوں پر سر درد کی شکایت ہوا کرتی تھی۔

رخسانہ باجی کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں نمی چھلکنے لگی۔ گویا وہ بھی خالہ کی بے رخی، بے زاری اور تنگ دلی سے بے خبر نہیں تھیں۔

زینی گہری سوچ میں گم ہوگئی۔ بدلتے رشتوں کے ساتھ اچھائی اور برائی کا تصور کیوں بدل جاتا ہے اپنے حقوق کے لیے تو ہم بڑا احتجاج کرتے ہیں اور جب فرائض کی ادائیگی کا وقت آئے تب اکثر ہمارے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

"بس اماں! مجھے نہیں کرنی یہ فیکے نکے سے شادی۔ جب میں نے انکار کر دیا ہے تو پھر تو کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔" میں نے اپنا سارا غصہ دانت پیستے ہوئے گندے برتنوں پر نکالا۔ جن کو اس وقت میں ریت اور صابن لگا کر چمکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اماں وہ موضوع نکال بیٹھی تھیں۔ جس سے میں کوسوں دور بھاگتی تھی۔

دراصل بات یہ ہے کہ آج کل میرے لیے نکے دکان دار کا رشتہ آیا ہوا تھا اور اماں کسی طور اس رشتے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں وجہ یہ تھی کہ فیکا اس گاؤں کا وہ واحد شخص تھا۔ جس کے پاس نا صرف اپنی ذاتی موٹر سائیکل تھی۔ بلکہ پرچون کی اپنی دکان بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اماں کی نظر میں اس رشتہ کی اتنی اہمیت تھی۔ جتنی بش کے نزدیک اسامہ کی ہے۔ مگر مجھے فیکے سے اتنی ہی چڑ تھی۔ جتنی ہمارے سیاستدانوں کو سچ بولنے سے ہے۔ میری یہی چڑ تو اماں کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ ویسے بھی اماں کو میرے ہر کام ہر عمل میں نقص نکالنے کی عادت تھی اب یہی دیکھ لیں۔ میں نے صرف ایک فیکے کے رشتے سے ہی تو انکار کیا ہے۔ مگر وہ مجھے یوں کوسنا شروع ہو چکی ہیں جیسے کراچی میں بارش شروع ہو کر بند ہونا بھول جاتی ہے۔

"تو میں پوچھتی ہوں کیا کمی ہے فیکے میں، اپنے ماں پیو کا کلم کلا پت ہے اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہے۔ (یوں کھوتا نائیوں کی دکان ہے) عزت کی کماتا ہے۔ عزت سے کھاتا ہے۔ پر نہ جانے تجھے کون سے شہزادے کا انتظار ہے۔ آٹھ جماعتیں کیا پڑھ لیں تیرا تو دماغ ہی عرش پر پہنچ گیا ہے۔ مگر میں بھی کہے دیتی ہوں۔ تیری شادی فیکے سے ہی ہووے گی۔"

"تو ٹھیک ہے میں بھی دیکھتی ہوں، تو کیسے میری شادی اس کالے منہ والے فیکے سے کرتی ہے۔" میں نے غصے سے برتن وہیں پٹخے اور اٹھ کر کمرے میں آ گئی جانتی تھی۔ اماں جب تک ابا کو میری شکایت نہیں لگا دیں گی آرام سے نہیں بیٹھیں گی۔

کبھی کبھی میں یہ سوچ کر حیران ہو جاتی کہ میرے اتنے نرم مزاج ابا جنہوں نے کبھی اونچی آواز میں بات تک نہ کی تھی، ان کو اتنا واویلا مچانے والی اماں کہاں سے مل گئیں۔ ابا جتنے نرم مزاج تھے، اماں اتنی ہی سخت گیر۔ یا شاید وہ میرے معاملے میں بن جاتی تھیں ورنہ میرے چاروں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ توان کا رویہ بڑا نارمل ہوتا۔

میں اس وقت اپنے اور بھائیوں کے مشترکہ کمرے کی صفائی کر رہی تھی جب میں نے اپنی پیاری سہیلی رانی کی آواز سنی، وہ اماں سے میرا ہی پوچھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اماں اسے بھی اپنی زبان کے جوہر دکھاتیں میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی اور تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"ارے! رانی تو کب آئی، قسم سے بڑا دل کر رہا تھا تجھ سے ملنے کو مگر..." اماں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، جو مجھے خطرناک تیور لیے یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے آسٹریلیا اور پاکستانی کرکٹ ٹیموں کے مقابلے کے اختتام پر پاکستانی عوام قومی ٹیم کو دیکھتی ہے میں بھی پاکستانی ٹیم کی طرح اماں کی تیوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے رانی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں چلی آئی۔

"ہاں! بول رانی آج تجھے کیسے میری یاد آ گئی۔ میں تو سمجھی تھی تو مجھے بھول ہی گئی ہے۔ کبھی تو بھی ملنے کا خیال تک نہ آیا۔" میں نے چھوٹتے ہی شکوے شروع کر دیے۔ میری بات پر وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"روبی کیسی بچوں جیسی باتیں کرتی ہے بھلا میں تجھے کیسے بھول سکتی ہوں، وہ تو بس گھر کے کام کاج سے وقت نہیں ملتا ورنہ دل تو تجھ سے ملنے کو روز کرتا ہے آج بھی بڑی مشکل سے وقت نکال کر آئی ہوں، آخر کو اپنی سہیلی کو منگنی کا بلاوا بھی تو دینا تھا۔" وہ بات کرتے کرتے آخر میں میرے قریب ہو کر آہستہ سے بولی، میں جو اس کی بات بڑے دھیان سے سن رہی تھی اس کی منگنی کا سن کر خوشی سے اچھل ہی تو پڑی۔

"تیری منگنی ہو رہی ہے، مگر تو نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کس سے ہو رہی ہے، میری جنو کی شادی۔" میں نے شرارت سے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔

"نواز کے ساتھ ہو رہی ہے، وہی جو دھوبی ہے۔" اس نے شرما کر دوپٹے کا کونا منہ میں لے لیا۔

"رانی کہیں تو اس موٹے کالے دھوبی کی بات تو نہیں کر رہی، جو قبرستان کے قریب رہتا ہے۔" میں نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی تھی۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے پر مجھے یوں شدید صدمہ کا دھچکا لگا جیسے اپنے عرا کل کو رن آؤٹ ہوتے دیکھ کر لگتا ہے میں نے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔ "کہاں یہ سرخ گلاب جیسی نازک لڑکی اور کہاں وہ کالا موٹا دھوبی۔"

جب میں نے اپنے انہی خیالات کا اظہار رانی سے کیا تو وہ بڑے بزرگانہ انداز میں بولی۔

"نہ روبی ایسے نہیں کہتے بھلا ہم کون ہوتے ہیں اللہ کی بنائی گئی چیزوں میں نقص نکالنے والے، وہ اوپر والا سوہنا بڑا مہربان ہے۔ وہ جو بھی کرتا ہے اپنے بندوں کے لیے اچھا ہی کرتا ہے۔ اب تو دیکھ نواز کالا ہے دھوبی ہے تو کیا ہوا۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت ہے کہ وہ مجھے اپنے گھر محبت اور عزت سے لے کر جائے گا۔ بھلا اس سے زیادہ ایک عورت کو چاہیے بھی کیا۔"

"ہونہہ۔" میں دل ہی دل میں کلس کر رہ گئی، مجھے اس کی یہ انکساری ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اسی لیے میرے منہ کے بدلتے زاویے دیکھ کر وہ بات بدل گئی تھی۔

"تو میرا چھوڑ اور اپنا بتا کہ سارا دن کیا کرتی رہتی ہے ارے ہاں یاد آیا۔" وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

"خالہ کل اماں کو بتا رہی تھی کہ تیرا کوئی رشتہ آیا ہوا ہے۔" وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جبکہ اس کی بات سن کر میں یوں تپ گئی، جیسے اپنی باجی میرا آج کل صحافیوں سے تیکھی پھرتی ہے۔ مجھے اماں کی یہ جلد بازی والی عادت ہرگز پسند نہیں تھی، جو وہ اپنی ہر بات منٹ سے پہلے دوسروں کو بتا دیتی تھی اب یہی دیکھ لیں پرسوں فیکے کا رشتہ آیا اور کل تک اماں پورے محلے میں بتا بھی چکی ہے۔ یہی اماں کی باتیں مجھے غصہ دلاتی تھیں، اب بھی میں اس رشتے میں نکلی ہوتی، رانی کو بتانے لگی جو بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"اماں کیا ہے فیکے دکان دار کا رشتہ کیا آیا اماں یوں اترائی پھرتی ہے جیسے کسی وزیر یا صدر کا رشتہ آ گیا ہو۔ مگر میں نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے اس جاہل گنوار سے بیاہ نہیں کرنا اسی وجہ سے اماں کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ نا جانے اماں کو اس کالے منہ والے فیکے میں کیا نظر آتا ہے۔" میں نے بھی جی بھر کر دل کی بھڑاس نکالی، میری پوری بات سن کر وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"دیکھ روبی! اگر تو مجھے اپنی پکی والی سہیلی سمجھتی ہے تو میری بات مان اور فیکے سے بیاہ کر لے، خالہ ٹھیک کہتی ہے کہ اس سے اچھا رشتہ تمہیں اور نہیں ملے گا۔ پورے گاؤں میں سب سے بڑی دکان فیکے کی ہے، ویسے بھی وہ اتنا کالا نہیں ہے، جتنا تو اسے سمجھ رہی ہے؟" اس نے میرا ہاتھ دبا کر اپنے پر خلوص ہونے کا یقین دلایا۔

مجھے اس کے خلوص پر تو کبھی بھی شبہ نہیں رہا تھا، میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی ہر بات سو فیصد سچ ہے مگر میں اپنے اس دل کا کیا کرتی، جو فیکے کے لیے ڈولا ہی نہیں۔ اس پنڈ کے کسی بھی لڑکے کے لیے نہیں مانتا تھا۔ میں تو شاید آج بھی بچپن کی کہانیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ جس میں ایک غریب لڑکی کو شہزادہ پسند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور اسے اپنی ملکہ بنا لیتا ہے۔ میں بھی تو اس غریب لڑکی کی طرح شہزادے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جو نہ جانے کب آئے اور مجھے اس جھونپڑی سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے رانی میری لاتعلقی محسوس کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، میں نے آج ہمیشہ کی طرح اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ مجھے منگنی پر آنے کی تاکید کرتی چلی گئی۔ جبکہ میں اپنے ذہن میں آنے والی مختلف سوچوں کو جھٹک کر بھائیوں کے لیے روٹی بنانے لگی جو اسکول سے آنے

والے تھے۔ اماں شاید محلے میں کسی کے گھر چلی گئی تھی، جو گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، جب شدید پیاس کے باعث میری آنکھ کھلی، میں نے اپنے ساتھ لیٹے ببلو پر ایک نظر ڈالی، جو بے خبر سو رہا تھا اور میں پاؤں میں سلیپر پہن کر باہر آ گئی، ابھی میں چند قدم ہی بڑھی تھی۔ جب ساتھ والے کمرے سے اماں کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اماں ضرور ابا کے سامنے میری برائیاں کر رہی ہوں گی۔ تبھی میں دبے قدموں سے اماں کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھی، جو اتفاق سے کھلی ہوئی تھی۔ جہاں سے مجھے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے یقین تھا، باہر اندھیرا ہونے کے باعث اماں مجھے دیکھ نہیں پائیں گی، ابا کی تو ویسے ہی نظر کمزور ہو گئی تھی۔

"بخت بی بی، جب میری دھی رانی نہیں مانتی تو تو انکار کر دے۔" ابا نے حقے کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ مگر اماں، ابا کی بات سن کر غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"گلاب دین، کچھ ہوش کے ناخن لے، وہ کملی تو بے وقوف ہے، پر ہم تو سمجھ دار ہیں نا؟ اس کے اچھے برے کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"ہاں میرے لیے اچھا ایک فیکا ہی رہ گیا ہے۔"

"اس نے اگر انکار کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی اتنے اچھے رشتے کو ہاتھ سے جانے دیں۔"

"اماں تو یوں اس رشتے پر قابض ہو گئی تھی، جیسے وینا ملک، محمد آصف اور بہرک شاہ دونوں پر قابض بیٹھی ہے۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ کان کھڑکی کی طرف لگائے۔ جہاں اماں ابھی بھی کچھ بول رہی تھیں۔

"گلاب دین! ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اسے بتائیں کہ اس کے لیے اچھا کیا ہے اور برا کیا۔" اماں، کیا کی استانی بنی ابا کو سمجھا رہی تھیں۔ اور میری بڑبڑاہٹ ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی، میرا دل کر رہا تھا، جا کر اماں سے کہوں اگر سمجھانا ہی ہے تو "باجی وینا ملک کو سمجھاؤ" جو انڈیا جا کر پاکستان کی بدنامی کا باعث بن رہی ہے۔

"بخت بی بی تیری ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ فیکا بہت اچھا لڑکا ہے، مگر میں پھر بھی اپنی دھی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ بخت بی بی تو یہ اچھی طرح جانتی ہے جو رشتے زور زبردستی سے طے کیے جاتے ہیں، وہ زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتے۔ اس لیے تجھ سے بھی کہتا ہوں تو اس نمانی پر زیادہ زور نہ ڈال، جب اللہ کو منظور ہو گا اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

میں ابا کی باتیں سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ میرا ابا، اماں کی باتوں میں آ کر جذباتی نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ کی طرح آج بھی میرا ابا، میرے ساتھ ہے۔ میں جانتی تھی، اماں اب مجھے تنگ نہیں کرے گی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو شوہر کی حکم عدولی کو گناہ سمجھتی ہے۔ میں اپنی ہی خوشی میں مست تھی، جب میں نے اماں کی آنسوؤں سے بھیگی آواز سنی۔

"گلاب دین، ہم اس کے ماں، پیو ہیں، جو بھی اس کے لیے کریں گے اچھا ہی کریں گے۔ وہ کملی سمجھتی ہے ماں اس کی دشمن ہے، جو اس کے ہر عمل پر نظر رکھتی ہے۔" میں نے کھڑکی سے منہ اندر کر کے دیکھا، جہاں اماں سوں، سوں کرتی ناک کے ساتھ بول رہی تھی۔

"مگر گلاب دین میں اس کملی کو کیسے سمجھاؤں کہ ماں صرف ممتا نچھاور کرنے کا نام نہیں ہے، ماں تو وہ ہوتی ہے، جو جہاں دیکھتی ہے اس کا بچہ بھٹکنے لگا ہے اسے محبت سے روکتی ہے اگر وہ سمجھ جائے، تو ٹھیک ورنہ ہاتھ اٹھانے سے بھی نہیں چوکتی۔ اسی لیے گلاب دین میں نے روبی کے ساتھ ذرا سخت رویہ رکھا تاکہ میری بیٹی کہیں بھٹک نہ جائے اور آج سے پہلے مجھ اپنی تربیت پر بڑا ناز تھا، میں لوگوں کو بڑے فخر سے بتاتی



تھی کہ میری بیٹی نے آج تک میرا سر جھکنے نہیں دیا۔ مگر آج اپنی بیٹی کے رویے کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ میں بھی غلط تھی اور میری تربیت بھی۔ مگر خدا گواہ ہے، گلاب دین میں نے ہمیشہ اسے اپنے جھے کا نوالا بھی کھلانے کی کوشش کی ہے۔" اماں اور بھی بہت کچھ بول رہی تھی۔ جبکہ میرا سر ندامت سے جھکتا چلا جا رہا تھا۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا کب آنسو، میری آنکھوں سے جھڑی کی صورت میں بہہ کر میرا گریبان بھگو گئے تھے، اس سے پہلے کہ میری ہچکی بندھتی میں تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس رات میرا انگ انگ آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا، آج بڑی شدت سے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ لوگوں کی طرح میں بھی اس غلط فہمی کا شکار رہی ہوں کہ میں بہت خوبصورت ہوں، جبکہ حقیقت میں تو میں اس قدر بدصورت ہوں کہ مجھے خود سے گھن آ رہی ہے کیونکہ خوبصورت تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل خوبصورت ہوں۔

رانی کی مختلف موقعوں پر کہی گئی باتیں، جن پر میں نے کبھی کان نہیں دھرے تھے۔ آج بڑی شدت سے مجھے یاد آ رہی تھیں، اس نے ایک بار میرے منہ سے شہزادہ کا ذکر سن کر کہا تھا۔

"دیکھ رانی جس طرح محلوں میں رہنے والیاں ہمارے ان مٹی سے بنے کچے مکانوں میں گزارا نہیں کر سکتیں اسی طرح ہم کچے مکانوں والے محلوں میں رہنے کے خواب تو دیکھ سکتے ہیں، مگر وہاں رہ نہیں سکتے اگر ہم نے کبھی ایسا کیا تو ہم جی نہیں پائیں گے کیونکہ رانی ہماری جڑیں اور ہمارا اصل تو یہی مٹی، یہی کچے مکان ہیں نا! اپنے اصل اور اپنی جڑوں کے بغیر کوئی کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔"

آج اس کی ایک ایک بات میرے دل کو لگ رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اپنے اصل اور اپنی جڑوں سمیت زندہ رہنا ہے اور اپنے خوابوں کا شہزادہ محلوں میں نہیں بلکہ انہیں کچے مکانوں میں تلاش کرنا ہے۔

میں سوچ رہی تھی کہ اگر ہمارے خوابوں کی تعبیر انہی گلیوں میں ہے تو پھر کیوں نہ والدین کی مرضی پر سر جھکا کر انہی شہزادوں کو قبول لیں۔ جو انہوں نے ہمارے لیے چنے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ والدین کبھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔ آپ کی قسمت تو آپ کے ساتھ مذاق کر سکتی ہے آپ کو دھوکہ دے سکتی ہے۔ مگر آپ کے والدین آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔ میں جیسے جیسے سوچ رہی تھی ویسے ویسے میرا سر ندامت سے جھکتا جا رہا تھا۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ قسمت تو میرے ساتھ غلط کر سکتی ہے مگر میری ماں نہیں۔ کیونکہ ماں تو رب کا دوسرا نام ہے اور رب بھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔

موذن کہیں قریب ہی اذان دے رہا تھا۔ میں اذان کی آواز سن کر اٹھ کے بیٹھ گئی، اس سے پہلے کہ کہیں دیر ہو جائے۔ مجھے یہ خوشی کی خبر اماں کو سنانی تھی، اسے بتانا تھا کہ اماں تو غلط ہے اور نہ ہی تیری تربیت۔ بس کچھ دیر کے لیے تیری بیٹی ضرور بھٹکی تھی۔ مگر تیری تربیت بہت جلد اسے واپس سیدھے راستے پر لے آئی۔ میں اپنے بستر سے اٹھی اور سلیپر پہن کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں جانتی ہوں پہلے اماں مجھے حیرت سے دیکھیں گی۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے گلے سے لگا کر والہانہ چوم لیں گی۔

☼ ☼

"ہیلو...." عمائلہ نے سیل فون پر جھنک کر انجان نمبر دیکھ کر جھجکتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب خاموشی تھی۔

اس نے چند لمحے مخالف سمت موجود شخصیت کے بولنے کا انتظار کیا۔ خاموشی ہنوز برقرار تھی۔ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ کتابوں پر جھکی عمرانیات کے نوٹس بنانے میں مگن تھی کہ ایک بار پھر بجتے موبائل کی رنگ ٹون نے اس کی محویت توڑ دی۔

"اوہ نو...." وہ جھنجلا گئی۔

"ہیلو...." اس نے بے زاری سے فون اٹھایا۔ چار دن سے یہی قصہ شروع تھا۔ انجان نمبرز سے مسڈ کالز، پیغامات اور کالز نے اسے تنگ کر رکھا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔

"ہیلو جی! آپ کون بات کر رہی ہیں؟" پراشتیاق مردانہ آواز ائیر پیس سے ابھری۔

"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" عمائلہ محتاط ہوئی۔

"تم سے ہی بات کرنی ہے۔" اس کے اطمینان بھرا جملہ عمائلہ کو تپا گیا۔

"پہلی بات تمیز سے بات کیجیے۔ میرے اور آپ کے درمیان ایسی کوئی بے تکلفی نہیں کہ آپ مجھے تم کہہ کر مخاطب کریں۔ دوسری بات بہت فارغ ہیں تو کہیں اور ٹرائی کریں۔ میں ایسی ویسی لڑکی ہوں اور نہ آپ کی طرح فارغ۔ آئندہ فون کرنے کی زحمت مت کیجیے گا کیونکہ اب میں یہ سم بند کر دوں گی۔" دبے دبے غصے سے کہتی عمائلہ نے فون بند کر دیا۔

عمائلہ واقعی کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اور بہت نازو نعم میں پرورش پانے کے باوجود اس میں نخرو بام کو نہیں تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ ایک چھوٹے مگر خوب صورت گھر میں رہائش پذیر عمائلہ فرقان خوب صورتی اور خوب سیرتی میں یکتا، گریجویشن کی طالبہ تھی کلاس کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کی دلچسپی خاطر خواہ ہوتی۔

عمائلہ نے انٹر میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے پر اپنے بابا اسمٰعیل فرقان سے فقط سیل فون لینے کی فرمائش کی تھی۔ اسمٰعیل فرقان اپنے جگر گوشے کی کسی بات سے انکار کریں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا اور اب تقریباً ڈیڑھ سال سے سیل فون استعمال کرتے عمائلہ نے دو مرتبہ سم تبدیل کی تھی۔

"پتا نہیں کس کے پاس اتنا فالتو وقت اور پیسہ ہے کہ انجان لوگوں سے گھنٹوں لمبی لمبی واہیات گفتگو میں برباد کرتے ہیں۔" وہ اکثر جھنجلا کر سوچتی تھی۔

تیسری مرتبہ سم تبدیل کرنے کے بعد اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب کسی انجان نمبر سے کال ریسیو ہی نہیں کرنی اپنے تئیں وہ ایک دانشمندانہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

گرمیوں کی لمبی دوپہریں لوٹ آئی تھیں۔ مختصر ہوتی راتوں میں ادھوری رہ جانے والی نیندیں دوپہر کے وقت پلکوں پہ اتر آتی تھیں۔ جب آگ برساتا سورج



سر سے ذرا سا نیچے سرک چکا ہوتا اور انسان تو انسان حیوانات بھی بدحال ہوئے اپنے ٹھکانوں پر نیم غنودگی میں مست و محو ہو جاتے۔ لو چلتی فضا میں رقصاں تپش گھروں میں محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے دوپہر کے کھانے کے بعد برتن سمیٹے اور دھونے لگی۔

"عمائلہ! رات کے لیے قیمہ آلو بنا لینا۔" امی نے کچن میں آ کر کہا۔ عمائلہ نے اثبات میں سر ہلایا وہ مطمئن ہوتی پلٹ گئیں۔ اس نے برتن دھونے کے بعد امی کے کمرے میں جھانکا وہ پیڈ پر دراز غالباً سو چکی تھیں۔ عمائلہ بھی واپس ہاتھ سے اپنے بالوں کی بکھری لٹیں سمیٹتی کمرے میں چلی آئی۔

تکیہ سر پر رکھا اور سرہانے دھری کتاب "عشق کا عین" اٹھائی ابھی کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑا سیل فون بجنے لگا۔ اٹھا کر دیکھا انجان نمبر تھا۔ عمائلہ نے سیل فون واپس رکھ دیا۔ خاصی دیر تک فون بجتا رہا اور بج بج کر بند ہوتا رہا۔ بالآخر عمائلہ نے تنگ آ کر کال

ریسیو کرلی۔

"ہیلو۔" عمائلہ نے محتاط انداز میں کہا۔

"سہیل ہیں؟" حسب توقع جملہ پاکر عمائلہ تپ اٹھی۔

"جی ہیں۔۔۔ بلاؤں؟" چڑ کر کہا تھا۔

یہیں سے آغاز ہوتا ہے۔ کبھی فلاں سے بات کروادیں فلاں کو بلادیں فلاں ہیں۔ اور اس سے ملتے جلتے مختلف جملوں سے اندازہ لگالیا جاتا ہے کہ اگلی طرف لڑکی ہے یا لڑکا اس کے بعد دوستی کی آفرز گھٹیا پیغامات اور مسڈ کالز سے پریشان کرنا فارغ لوگوں کا گویا شعار ہی بن چکا ہے۔ ابھی محض ایک ہفتہ ہی گزرا تھا عمائلہ کو سم کارڈ تبدیل کیے اور اسے لگ رہا تھا پھر وہی سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

"نہیں۔۔۔ اگر آپ بغیر وہ مجھ سے بات کر سکتا ہے تو اسے زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔" گمبھیر بارعب لہجہ طنز کا لبادہ اوڑھے عمائلہ کو ایک لمحہ کے لیے گڑبڑا گیا۔

"بات سنیے مسٹر۔۔۔ جو کوئی۔۔۔" وہ کچھ کہنے لگی تھی۔

"داور نام ہے میرا داور حسان۔۔۔"

"آپ بے شک کوئی بھی ہوں۔" عمائلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ نمبر سہیل صاحب کا نہیں ہے آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ آپ جیسے آوارہ مزاج لڑکوں سے میں بھی اچھی طرح واقف ہوں جنہوں نے شریف لڑکیوں کا موبائل فون ضرورتاً استعمال کرنا بھی محال کر رکھا ہے۔ میں آپ کے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔ کہیں اور ٹرائی کریں۔"

جو منہ میں آیا کہہ کر عمائلہ نے فون بند کر دیا۔ دو منٹ بعد پھر فون بج اٹھا وہی نمبر تھا۔ عمائلہ نے چھوٹتے ہی کہا۔

"آپ کو انسانوں۔۔۔" عمائلہ کی بات لبوں میں ہی دم توڑ گئی۔

"04289276136" کیا آپ کا نمبر ہے؟"

دوسری طرف سنجیدگی عروج پر تھی۔

"جی۔۔۔!" عمائلہ نے بھی شرافت کا مظاہرہ کیا۔

"آئی ایم سو سوری مس، بہت معذرت۔۔۔" عمائلہ کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ اس کی آواز بہت خوب صورت ہے۔

"میری ہی غلطی ہے شاید مجھ سے نمبر غلط درج ہو گیا تھا۔ میں معافی کا خواستگار ہوں کہ دوبارہ بھی کال کرنے کا خطاکار ہوا۔ امید ہے مزاج برہم کو مزید ناگوار نہیں گزرا ہوگا۔ اللہ حافظ۔" بھاری دلکش حواسوں پہ طاری ہوتا دل نشیں لہجہ عمائلہ کو شرمندہ کر گیا۔

"اف! کیا مصیبت ہے۔" عمائلہ نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"خوامخواہ بے چارے کو جھاڑ دیا۔" وہ خود سے ہمکلام ہوئی۔

"شریف بندہ تھا۔ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔ کتنی بدتہذیب لڑکی ہوں میں۔۔۔" وہ نادانستہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"ایک معذرتی ایس ایم ایس بھیج دوں تو کیا برا ہے۔" وہ سیل فون ہاتھ میں تھامے گومگوں کی کیفیت میں تھی معاً "بپ" ہوئی۔ اس نے دیکھا پیغام اسی نمبر سے تھا۔ عمائلہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھا۔

"آپ کا گریز فی زمانہ نایاب بھی ہے اور پرکشش بھی۔ بس گریز کا طریقہ کچھ جارحانہ ہے۔" پیغام پڑھ کر عمائلہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"اپنی بدتہذیبی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" اس نے جوابی پیغام بھیجا۔ داور حسان کی کال آنے لگی۔ عمائلہ نے جھجکتے ہوئے کال ریسیو کی۔ اپنی بدتمیزی کا مداوا بھی تو کرنا تھا۔

"یقین کیجیے میں ان صاحبوں میں سے قطعی نہیں ہوں جنہوں نے شریف لڑکیوں کا سیل فون یوز کرنا محال کر رکھا ہے۔" اس کی دلکش آواز میں شوخ سی لپک تھی۔

"مجھے ہی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ معذرت چاہتی ہوں۔" عمائلہ کا اعتماد ڈگمگا گیا تھا۔



"گویا آپ مجھے دی گئی آوارہ مزاجی کی سند میں ترمیم کر رہی ہیں؟" وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔

عمائلہ اس کی گمبھیر آواز کی دلکشی میں گم تھی۔ ادھر داور حسان اس کے جواب کا منتظر اپنے ساحرانہ لب و لہجے کے سحر سے بخوبی واقف تھا۔

"میں نے اتنا مشکل سوال تو نہیں پوچھا۔" وہ سراپا سوال تھا۔

"میں اجنبیوں کے سوالوں کا جواب نہیں دیتی۔ اللہ حافظ۔"

اس نے بڑی دقتوں سے کہتے ہوئے داور حسان کو بولنے کا موقع دیے بغیر لائن ڈراپ کر دی۔ دل میں نمو پاتی خواہش سے آنکھیں چار کرنا آسان نہیں تھا۔ سو اس نے خود کو جھڑکتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی کمزور جھڑکیوں سے اڑیل دل کی نوخیز تمنا کب تھمی بدلی تھی۔

☼ ☼ ☼

چودہ تاریخ کا چاند آسمان کی سیاہ پیشانی پر چمک رہا تھا۔ چمکتی چاندنی کی چادر نے سارے صحن کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا بشمول عمائلہ کے جو صحن میں بنی کیاریوں میں مہکتی رات کی رانی اور گلاب کے پودوں نظریں جمائے بیٹھی تھی لیکن ذہن کہیں اور محو پرواز تھا۔

وہ خود سے لاکھ انکاری سہی لیکن کہیں نہ کہیں داور حسان کی پیش قدمی کی منتظر تھی۔ اس بات کو تین دن بیت چکے تھے لیکن عمائلہ اس کی باتوں، آواز کی گمبھیرتا، لب و لہجے کی خوب صورتی اور انداز کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی۔ غیر محسوس طریقے سے داور حسان کا سحر عمائلہ کے گرد جادوئی حصار باندھ چکا تھا۔ معاً وہ موبائل بپ پر چونک گئی۔

بہت دنوں سے میرے ذہن کے دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے بس اس کے خیال کا موسم

داور حسان کا پیغام اس شعر کی صورت اس کی کیفیت کا ترجمان ہوا۔ لیکن اس نے جوابی پیغام بھیجنے سے خود کو باز رکھا۔

"جواب کا منتظر ہوں۔" داور حسان کا اگلا پیغام اس کے کمزور سے گریز میں دراڑ ڈال گیا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنی بے اختیاری کو دائرہ اختیار میں مقید کیا۔

حسب توقع چند لمحوں بعد داور حسان کی کال آنے لگی۔ اس نے تذبذب میں بالآخر ریسیو کر ہی لی۔

"داور حسان بات کر رہا ہوں۔" اس کی روح میں اترتی آواز سن کر عمائلہ کو محسوس ہوا کہ بوجہ ماہ کامل رات کی لحہ بہ لحہ گہری ہوتی دلکشی میں یک بیک اضافہ ہوا ہو۔

"جی مجھے معلوم ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"اور کیا کیا معلوم ہے آپ کو؟" وہ متبسم ہوا۔

"کال کرنے کا مقصد بیان کیجیے پلیز۔" عمائلہ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

"کچھ کام بے مقصد محض دل کی رضا کے لیے کیے جاتے ہیں۔" داور حسان کے انداز میں بھرپور بے اختیاری تھی۔ عمائلہ کی خود اعتمادی محض ایک لمحے کے لیے ڈگمگا گئی تھی۔

"میں ان جیسے جذباتی مکالموں سے قطعاً متاثر نہیں ہوتی۔" عمائلہ کی صاف گوئی پر داور حسان کا ہلکا سا قہقہہ ابھرا تھا۔ عمائلہ مبہوت رہ گئی۔ کسی مرد کی ہنسی اتنی دلکش بھی ہو سکتی ہے۔

"آپ بلاشبہ اچھا مگر خاصا تلخ بولتی ہیں۔" اس نے مسکراتی آواز میں پہلی مرتبہ ہوئی گفتگو کا بھی حوالہ دیا۔

"آپ نے ابھی مجھے بولتے سنا ہی کب ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ کر زبان دانتوں تلے دبا گئی۔

"میں ہمہ تن گوش و مشتاق ہوں۔ ارشاد فرمائیے۔" وہ ہنوز متبسم تھا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا پھر کہہ رہی ہوں۔ میں اجنبیوں سے گفتگو نہیں کرتی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"غور طلب امر یہ ہے مس۔۔۔" وہ لحہ بھر کو ٹھہرا تھا۔

"مس عائلہ فرقان۔۔۔" اس کے نام پر زور دیتی داور حسان کی آواز میں تبسم کی واضح جھلک تھی۔

"کہ بغیر کسی گفتگو کے کوئی اجنبی شناسا کی فہرست میں شامل بھی تو نہیں ہو سکتا۔" عائلہ ٹھٹک گئی۔

"آپ کو میرا نام۔۔۔" وہ حیرانی سے کچھ کہنے لگی تھی۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ سم کارڈ یقیناً آپ کے نام سے ہی رجسٹرڈ ہے۔" داور نے عائلہ کی بات کاٹ دی۔

"ضروری تو نہیں آپ کا اندازہ درست ہو۔" وہ بولی۔

"ضروری تو یہ بھی نہیں کہ میرا اندازہ غلط ہو۔" داور نے کہا اور عائلہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی۔

"ویسے بھی آپ کی حیرانی میرے اندازے کی درستگی کی تصدیق کر رہی ہے۔" اس کے لہجے کا ٹھہراؤ عائلہ کی سماعتوں کو بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

"دیکھیے داور صاحب! میں بلاوجہ لمبی لمبی ٹیلیفونک گفتگو نہیں کر سکتی۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ سراپا سوال ہوا۔

"کیونکہ میں مرد و زن دوستی کی قائل نہیں۔" اس نے دوستی پر زور دیا۔

"اور محبت کی۔۔۔؟" برجستہ سوال نے عائلہ کو لاجواب کر دیا۔

"اللہ حافظ!" عائلہ نے بنا کوئی جواب دیے سلسلہ کلام منقطع کرنا چاہا۔ تبھی داور حسان کی استحقانہ آواز اس کی کلائی میں زنجیر ہوئی۔

"تمہارا محتاط رویہ، گریز اور مضبوط سوچ میرے آتش شوق کو ہوا دے رہا ہے عائلہ! میں نہیں جانتا کیوں لیکن میرے دل نے اس اجنبیت کو شناسائی میں تبدیل کرنے کی ٹھان لی ہے۔" وہ بے تکلفی کی حدود سے آگے نکل رہا تھا۔

"ان شاء اللہ بہت جلد پھر بات ہو گی۔ اللہ حافظ۔" اگلی طرف سے ٹوں ٹوں کی آواز لائن ڈراپ کر دیے جانے کی اطلاع دے رہی تھی اور عائلہ فون کان سے لگائے ابھی تک اس کے دلکش لب و لہجے کے زیر و بم میں کھوئی اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو بہلانے کی ناکام کوشش میں محو تھی۔ کھلتی چاندنی کا نور اس کے حسین چہرے کو چومتا گھنی پلکوں کی جھالر پہ رکھے خوابوں کے ان گنت دیپ روشن کر رہا تھا اور اس کے مسکراتے لبوں پر یہ شعر مچل اٹھا۔

چلو ہم بھی محبت کر ہی لیں گے
اگر اس کا ارادہ ہو گیا ہے

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد وہ دانستہ داور حسان کی کال کی منتظر، اس سے گفتگو کی خواہش مند رہنے لگی۔ اس کی باتیں، خوب صورت لفظوں کا چناؤ اور برجستہ و بے ساختہ گرمی جذبات کی تمازت لیے اقبال و اعتراف اور اظہار و اقرار سے مزین دلنشین لہجہ عائلہ کو پوری طرح مسحور کر چکا تھا۔ وہ خود سے بے پروا ہوئی اس کے خوابوں کی نگری میں گم تھی اور جذبہ محبت کی بے پروائی و بے خودی فریقین محبت کے رخ پر ضو فشانی کی صورت کیسا نکھار نقش کرتی ہے کوئی عائلہ فرقان کے چمکتے چہرے کو نظر بھر کر دیکھتا تو جانا جائے۔

داور حسان نے اسے اپنی تصویر ایم ایم ایس کی تھی۔ بے ترتیب بکھرے سیاہ بالوں سے ڈھکی پیشانی، بھرے بھرے عنابی لبوں پہ سجی پراسرار مبہم مسکراہٹ اور کالی گھنی بھنوؤں سے آراستہ بولتی آنکھیں خاصی بے باکی سے عائلہ کی آنکھوں میں جھانکتی اس کا دل دھڑکا گئیں۔

لیکن داور حسان کے بے حد اصرار کے باوجود عائلہ اپنی تصویر اسے بھیجنے سے گریزاں تھی۔

"پلیز عائلہ! میں دیکھنا چاہتا ہوں میرے خیالوں میں تراشا تمہارا تصوراتی پیکر تمہارے ظاہری سراپے سے کتنا قریب ہے۔" وہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ عائلہ ہنوز انکاری تھی۔

"میں نے بھی تو تمہیں اپنی تصویر بھیجی ہے نا؟" وہ اسے قائل کر رہا تھا۔



"آپ کی بات اور ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ ہر کسی کو اپنی تصویر دینا اچھی بات تو نہیں۔"

"بہت افسوس ہوا مجھے یہ جان کر کہ میں ابھی تک ہر کسی کی فہرست سے نکل نہیں سکا۔" اس نے ہر کسی پر زور دیا۔

"اف! کیسے سمجھاؤں؟" وہ زچ ہوئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں ہر لڑکی کے دیدار کو یونہی مچل اٹھتا ہوں جیسے تمہارے؟ یا ہر لڑکی سے یونہی اصرار کرتا ہوں جیسے تم سے؟" وہ دل برداشتہ ہو چلا تھا۔

"اور آپ کو کیا لگتا ہے میں ہر کسی سے یونہی گفتگو کرتی ہوں۔ جیسے آپ سے؟ یا ہر لڑکے کی تصویر یونہی گھنٹوں دیکھتی ہوں جیسے آپ کی؟" وہ داور حسان کی برہمی سے گھبرا کر کہتی چلی گئی۔

"اچھا۔۔۔؟" داور حسان نے حیرانی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ تو اور کیا؟" برجستہ جواب آیا۔

عائلہ روانی میں کس بات کا اقرار کر گئی ہے اس کا اندازہ اسے داور حسان کے بے ساختہ و بے ہنگم قہقہے سے ہوا۔ وہ جھینپ کر خاموش ہوئی۔ لبوں پہ شرمیلی مسکان تھرکنے لگی۔ وہ ابھی بھی کھل کر ہنس رہا تھا۔ عائلہ نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ فوراً ہی داور حسان کا پیغام موصول ہوا۔

تم کبھی گر کبھی لو میری طرح اقرار وفا
پیار کرتے ہو تو پھر پیار چھپاتے کیوں ہو

شرمگیں مسکان کے ساتھ پیغام پڑھتے ہوئے اس کے رخسار دہک اٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ضروری نہیں کہ داور حسان نے تمہیں اپنی ہی تصویر بھیجی ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کیا کہ اسے اپنی تصویر ایم ایم ایس نہیں کی۔ کسی کا کیا بھروسہ۔ لڑکیوں کو یوں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ باقی رہی اس کی کالج کے باہر آ کر محض تمہیں دیکھنے کی بات تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

عطرویہ بلوچ عائلہ کی کالج فیلو اور دوست اس کی ساری روداد سننے کے بعد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"کالج کے باہر کھڑے بہت سے لوگوں میں ایک وہ بھی آنکھیں سینک لے تو کیا برا ہے؟" آخر میں وہ شرارتی ہوئی۔ عائلہ نے جھینپ کر اسے ایک دھپ رسید کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھہرو پہلے کچھ کھا پی لیتے ہیں۔" عطرویہ نے اسے لائبریری کی سمت بڑھتے دیکھ کر باز رکھنا چاہا۔

"میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! اب بھوک کس کو لگتی ہے؟ اب تو بس شربت دیدار یار ہی مطلوب ہے۔" عطرویہ صاف اسے چھیڑ رہی تھی۔

عائلہ نے ہاتھ میں تھاما رجسٹر اور بیگ وہیں گراؤنڈ کی گھاس پر ڈھیر کیا اور عطرویہ کی درگت بنانے اس کے پیچھے بھاگی اور عطرویہ ہنستی ہوئی دوڑ پڑی۔ دونوں خاصی دیر تک اس بچگانہ کھیل سے لطف اندوز ہونے کے بعد اب گھاس پر بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں۔

اس کے قطعی انکار کے بعد داور نے عائلہ کو دیکھنے کے لیے کالج کے باہر آنے کی تجویز رکھی تھی اور عائلہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی رضامند ہونا پڑا کہ بہرحال کار زار عشق میں مطلوب کو طالب کا بھی تھوڑا بہت بھرم رکھنا پڑتا ہے۔

وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ چھٹی ہوئے خاصی دیر گزر چکی تھی اس لیے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ سیاہ چادر پیشانی پر درست کرتی وہ نظریں جھکائے گیٹ سے باہر نکلی۔

عین سامنے داور حسان اپنی ساحرانہ شخصیت سمیت قیمتی کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ عائلہ نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی اور اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً ہی جھکا لی۔ وہ بلیک جینز اور ٹی شرٹ میں ہلکی ہلکی بڑھی شیو اور خمار آلود آنکھوں میں ذہانت کی

چمک لیے بہت جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا۔
عمائلہ اس اچٹتی نگاہ میں اتنا ہی جائزہ لے پائی البتہ پرشوق نگاہوں کی تمازت سے سرخ ہوتے رخسار عمائلہ کو احساس دلا رہے تھے کہ وہ بڑی فرصت سے اسے دیکھ رہا ہے۔ عمائلہ مزید ٹھہرے بنا دائیں سمت چل پڑی۔

داور حسان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا وہ ہنوز گم سم کھڑا اس پیکر حسن کو تک رہا تھا۔ گندمی رنگت پر اترتی شرم و حیا کی لالی کا نظارہ دلنشین تھا۔ وہ کانچ کی گھنیری پلکوں کی جھالر اور صندلی پیشانی سے پھوٹتی کرنوں کو محویت سے دیکھتا بے خود ہوا جا رہا تھا۔ عمائلہ چلتے چلتے کالج سے کچھ دور کھڑے رکشا کے قریب پہنچ چکی تھی۔ رکشے والے سے تھوڑی سی گفتگو کے بعد اب وہ رکشا میں سوار ہونے لگی تھی لیکن اس سے پہلے عمائلہ نے لحہ بھر ٹھہر کر داور حسان کے بت بنے وجود پر گہری نظر ڈالی تھی مسکراہٹ لبوں کے کنارے پر سرسرائی اور گم ہو گئی۔ لمحے بھر کی بے خودی تمام ہوئی اور عمائلہ رکشا میں سوار ہو کر چلی گئی۔
دراز قد کسرتی وجود رکھنے والا داور حسان عمائلہ جیسی دھان پان سی لڑکی کا اسیر ہو جانے پر دم بخود رہ گیا۔ وہ جا چکی تھی لیکن اس کا سیاہ چادر کے ہالے میں چھپا معصوم نوخیز چہرہ داور حسان کی نگاہوں میں بس گیا تھا۔
تمام راستہ وہ داور حسان کی شخصیت کے سحر میں کھوئی رہی وہ اپنی آواز سے مختلف نہیں تھا۔ چھا جانے والی مردانہ وجاہت کا حامل داور حسان عمائلہ کے حواسوں پر اس بری طرح سوار ہوا کہ وہ اردگرد سے بھی بے گانہ ہو چلی تھی۔
عمائلہ یوں بھی کوئی بہت شوخ و شنگ فطرت کی مالک نہیں تھی اب تو اور دھیمے باتیں کرتی یا کبھی چپ چاپ بیٹھی سپنے بنتی رہتی۔ داور حسان سے باتیں کرتی تو مسکان ہونٹوں پر گویا نقش ہو جاتی۔
اور گھر میں بھائی بہن تو تھے نہیں جو اس کی بدلتی کیفیت کو بھانپتے۔ اسمٰعیل فرقان کو غم روزگار سے فرصت نہیں تھی لے دے کر فریدہ فرقان (عمائلہ کی امی) رہ گئیں تو عمائلہ کے لیے انہیں خوب صورتی سے ٹالنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔
محبت میں اندیشہ ہجر لاحق ہونا اچنبھے کی بات نہیں ہے جہاں ابھی خمار محبت میں بھیگے سرور دن ڈھل گئے اور وصل صنم سے قبل پیام آمد ہجراں آ ہی گیا۔

☼ ☼ ☼

عمائلہ دوپہر کی نیند لے کر بے دار ہوئی تو عصر کا وقت قریب تھا۔ وہ فریش ہونے کے ارادے سے واش روم کی سمت بڑھ گئی پندرہ منٹ میں جب وہ کپڑے بدل کر اور بال بنا کر باہر آئی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی یقیناً" مہمان موجود تھے وہاں۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو فریدہ فرقان کے ہمراہ ایک بارعب معمر سی خاتون براجمان نظر آئیں۔ خاتون کی اس پر نظر پڑی تو وہ غیر معمولی تپاک کا مظاہرہ کرتے اسے گلے لگانے اور پیار دینے کے بعد اپنے قریب ہی بٹھالیا۔
"ماشاء اللہ! بہت پیاری بچی ہے۔" وہ اب فریدہ فرقان سے مخاطب تھیں۔ جو مسکرا رہی تھیں۔
عمائلہ حیران پریشان امی سے اشاروں کنایوں میں خاتون کا تعارف دریافت کر رہی تھی لیکن فریدہ فرقان بے نیازی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے اسے مسلسل نظرانداز کر رہی تھیں۔ فریدہ فرقان اور اجنبی خاتون گفتگو میں یوں محو تھیں گویا برسوں سے واقف ہوں حالانکہ عمائلہ نے انہیں اس سے قبل اپنے گھر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"بیٹے بہو کی ایک پلین کریش میں وفات ہو گئی۔ ایک بڑی پوتی ہے شادی شدہ اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں مقیم اور اس سے چھوٹا یہ حسنی' بڑا فرماں بردار بچہ ہے میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ مجھ سے محبت بھی بہت ہے اسے' جب والدین چھوڑ گئے اس وقت سے مجھ سے بہت انسیت رکھتا ہے۔ کوئی بری عادت نہیں۔ ماشاء اللہ خوب صورت ہے برسرروزگار ہے۔ بس اب اس کی شادی کر دوں تو آخری ذمہ داری سے بھی



آزاد ہو جاؤں گی۔" ان کے لہجے کا ٹھہراؤ عمائلہ کو بہت مانوس محسوس ہوا۔
خاتون کی بیشتر گفتگو ان کے پوتے کی تعریف و توصیف سے آراستہ تھی۔ ادھر فریدہ فرقان عمائلہ کی خوب صورتی اور گھرداری میں رطب اللسان تھیں۔ عمائلہ کی چھٹی حس کلک کر رہی تھی۔ وہ خود کو بہلا رہی تھی کہ جو وہ سمجھ رہی ہے ضروری تو نہیں کہ درست ہو مگر اس کے خدشات بے سبب نہیں تھے۔
"میں چائے لاتی ہوں۔" فریدہ فرقان معذرت خواہانہ کہتی باہر چلی گئیں تو وہ خاتون عمائلہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"پڑھائی کے علاوہ کیا مشاغل ہیں۔" ان کے شفیق چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔
"کچھ خاص تو نہیں گھریلو کاموں میں ہی دن گزرتا ہے۔ کوکنگ کرتی ہوں' اپنے کپڑے وغیرہ بھی سی لیتی ہوں پھر بھی وقت مل جائے تو مطالعہ کا شوق ہے سو فراغت میں مطالعہ کرتی ہوں۔" خود اعتمادی سے کہتی عمائلہ انہیں معصوم سی لگی۔
"کیا بھلا سا نام ہے تمہارا؟ دیکھو تو ذہن سے ہی نکل گیا۔" وہ ذہن پر زور دینے لگیں۔
"عمائلہ۔" عمائلہ بول اٹھی تھی۔
"ہاں! عمائلہ بڑا پیارا نام ہے تمہارا۔" انہوں نے لوازمات سے بھری ٹرالی لیے کمرے میں داخل ہوتی فریدہ فرقان کو مسکرا کر دیکھا۔
عمائلہ سے یونہی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی وہ خاتون عمائلہ کو بہت خوش اخلاق لگ رہی تھیں۔ تقریباً" آدھے' پون گھنٹے بعد جب وہ خاتون رخصت ہونے لگیں تو عمائلہ کو گلے سے لگا کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی فریدہ فرقان سے مخاطب ہوئیں۔
"آپ لوگ اب ہمارے گھر اسی ہفتے رونق بخشیں۔ یوں بھی میرے سونے گھر کو عمائلہ جیسی پیاری لڑکی کی اشد ضرورت ہے۔" انہوں نے عمائلہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے مسکرا کر کہا اور عمائلہ اپنے خدشات کی درستگی پر دم بخود رہ گئی۔
"کیوں نہیں مسز عابد ملک! عمائلہ کے والد سے مشورہ کر لوں تو فون پر آمد کے دن اور وقت دونوں سے مطلع کر دوں گی۔" فریدہ فرقان خوش مزاجی سے کہتی انہیں دروازے تک رخصت کرنے چلی آئیں۔
مسز رخشندہ ابراہیم جو عمائلہ کے پڑوس میں رہائش پذیر تھیں ان کے توسط سے عمائلہ کا رشتہ آیا تھا۔ مسز عابد ملک نے رخشندہ سے عمائلہ کی بابت سنا تھا' سو اب عمائلہ کو اپنی بہو بنانے پر مصر تھیں اور بصد اصرار رخشندہ کے ساتھ عمائلہ کے گھر آئی تھیں رخشندہ دونوں کو ملوا کر لوٹ گئیں اور مسز عابد ملک من پسند لڑکی مل جانے پر فریدہ فرقان کو نہایت گرمجوشی سے اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔
"لڑکا بینکر ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں۔ دو ہی بہن بھائی ہیں بہن شادی شدہ ہے کینیڈا میں رہتی ہے یہ اپنی دادی کے ساتھ رہتا ہے۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ عمائلہ ماشاء اللہ سمجھ دار ہے شادی کے قابل ہے۔ چھ مہینوں میں گریجویشن سے فارغ ہو جائے گی۔ لڑکیوں کے رشتے مناسب وقت میں ہی اچھے ملتے ہیں۔"
اسمٰعیل فرقان سے مخاطب فریدہ فرقان انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسمٰعیل صاحب ابھی عمائلہ کی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے خیال میں عمائلہ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔
فریدہ فرقان آخر کو بیٹی کی ماں تھیں نا! اچھی طرح واقف تھیں کہ اچھے رشتوں کا آج کل کس قدر کال پڑا ہے۔ بہترین رشتہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتیں۔ بالآخر اسمٰعیل فرقان حسنی ملک کے گھر جانے پر رضامند ہو ہی گئے۔ ادھر اپنے والدین کے مابین ہونے والی گفتگو نے عمائلہ کو مزید فکرمند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

بے تابی سے داور حسان کے کال کی منتظر عمائلہ اپنے کمرے میں مضطرب سی گول گول چکر کاٹ رہی

تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر کی رات کے دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ روز دس بجے ہی داور حسان کی کال آتی تھی اور آج وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اور بیڈ پر نیم دراز مطالعہ کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اکتا کر کتاب سرہانے پٹخ دی۔ بے قراری کھڑی ہوئی تھی اسی دم موبائل کی مدھری دھن بکھرنے لگی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔

"السلام و علیکم!" عمائلہ نے ریسیو کرتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو خوش رہو۔" شوخ سی آواز عمائلہ کی سماعتوں میں امرت کی مانند اترنے لگی۔

"خاموش کیوں ہو کچھ اور بھی کہہ دو...!" وہ عمائلہ کے خاموش ہو جانے پر گویا ہوا۔

"کیا کہہ دوں...؟" عمائلہ نے غائب دماغی سے سوال کیا۔

"وہی جو تم نے اب تک نہیں کہا۔" اس کا لہجہ سرگوشی میں ڈھلا۔

"میں نے اب تک کیا نہیں کہا...؟" وہ الجھ گئی۔

"یہی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" گمبھیر آواز عمائلہ کے رخسار دہکا گئی۔

"داور! میرے گھر والے میری شادی کر رہے ہیں۔" وہ یک بیک کہہ اٹھی۔ دوسری جانب چھائی خموشی سے عمائلہ کو تشویش ہونے لگی۔

"داور!..." عمائلہ نے اسے پکارا تھا۔

"تم انکار کر دو عمائلہ۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"کس بنا پر؟" عمائلہ کا لہجہ کس قدر تمسخرانہ تھا۔

"محبت سے بڑی بھی کوئی وجہ چاہیے تمہیں۔" وہ جھلایا تھا۔

"گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے والدین کے سامنے یہ داستان محبت بیان کروں۔" داور لاجواب ہوا۔

"پھر..." جھنجلائی ہوئی آواز ابھری۔

"پھر یہ کہ تھرو پراپر چینل میرے والدین سے میرا ہاتھ مانگ لیں۔" وہ رسان سے گویا تھی۔

"ضرور مانگوں گا۔ لیکن مناسب وقت آنے پر ابھی تھی الحال اس مصیبت سے جان چھڑاؤ۔"

"ہماری گفتگو کو ڈھائی تین مہینے ہو چکے ہیں۔ میرے گھر والے میری شادی طے کر رہے ہیں۔ میں قطعی نہیں سمجھ پا رہی کہ آپ کس مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں؟ جب بارات میرے گھر کی دہلیز پر چلی آئے گی اور میرے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچی ہو گی تب آئیں گے آپ؟" عمائلہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

"ریلیکس عمائلہ! مجھے معلوم ہے تم پریشان ہو رہی ہو۔ لیکن ڈونٹ وری میں آج ہی چچا چچی سے بات کرتا ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہے وہ ابروڈ میں ہیں آنے میں بھی وقت لگے گا۔ کاروبار میں فراغت کم ہی ملتی ہے۔ پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ اگلے ہفتے آجائیں۔ مجھ پر بھروسا رکھو پلیز!" عمائلہ کسی حد تک اس کی تسلیوں سے بہل ہی گئی تھی۔

داور حسان نے اپنے متعلق اسے اتنا ہی بتایا تھا کہ 'وہ اکیلا ہے اس کے رشتے داروں میں زیادہ لوگ ابروڈ میں رہائش پذیر ہیں۔ چند ایک ہی پاکستان میں رہتے ہیں۔ سو اب یہی مسئلہ درپیش تھا کہ داور حسان کا سرپرست بن کر عمائلہ کے والدین سے ملنے کے لیے اس کے چچا کو پاکستان آنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔

ادھر اگلے تین دنوں میں اسمٰعیل فرقان اور فریدہ فرقان سر عابد ملک کے گھر ہو آئے اور حسنی ملک میں انہیں وہ ساری خوبیاں نظر آئیں جو ان کی اکلوتی نازوں پلی بیٹی کے شریک سفر میں درکار تھیں۔ انہوں نے چھان بین کے لیے ایک ہفتے کا وقت لے کر آدھی رضا مندی دے دی تھی۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ نہ داور حسان کا پرپوزل آیا نہ ہی عمائلہ کا انتظار تمام ہوا۔ ہاں عمائلہ کے والدین نے حسنی ملک کی نیک نامی اور اس کے متعلق تسلی بخش معلومات سے مطمئن ہو کر عمائلہ کا رشتہ ضرور پکا کر



دیا۔

داور حسان اس سارے عرصے عمائلہ کو محض بہلاوے دیتا رہا اور عمائلہ کے پاس سوائے ان بہلاووں پر یقین کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن آخر کب تک؟ کبھی نہ کبھی تو عمائلہ کو حقیقت کا کڑوا گھونٹ پینا ہی تھا۔

آج اس کی رسم کی چھوٹی سی تقریب تھی۔ تجی تجی عمائلہ کی آنکھوں میں حزن و یاس کی سرخی اس کے حسن پرسوز کو مزید جلا بخش رہی تھی اور کبھی جو بھولے بھٹکے وہ کسی بات پر مسکرا دیتی تو یوں لگتا۔ بدلیوں سے ڈھکے آسمان کے کسی کنارے سے شاہ خاور کی چنچل شعاعیں دھرتی کو چھیڑ گئی ہوں۔

شادی کی تاریخ چھ مہینے بعد کی طے کر دی گئی تھی۔ اسمٰعیل فرقان اور فریدہ فرقان کی خوشی دیدنی تھی۔ اکلوتی لخت جگر کا من پسند رشتہ ہو جانے کی مسرت والدین سے زیادہ کسی کو ہو بھی نہیں سکتی۔ آج عمائلہ نے اس بیچ دروں نیمے بروں والی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور آج اس نے آخری مرتبہ داور حسان سے بات کرنی تھی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب وہ مزید عمائلہ کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ دیر سے ہی سہی عمائلہ کو عقل آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼
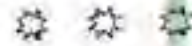
"عمائلہ! تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ ملامت کر رہا تھا۔

"میں نے کچھ اتنا غلط بھی نہیں کیا۔ کس بات کو جواز بنا کر انکار کرتی۔" عمائلہ تلخ ہوئی۔

"تم نے میرا انتظار نہیں کیا۔" وہ شکوہ کر رہا تھا۔

"کیا تھا انتظار۔ پورے ایک ہفتے لمحہ لمحہ گن گن کر انتظار کیا تھا۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"تمہیں معلوم تو ہے چچا نہیں آسکے۔ میں کیا کرتا؟ خود آکر تو تمہارے والد سے مل نہیں سکتا۔" وہ گویا نیچ ہوا۔ عمائلہ کی ہلکی ہلکی سسکی داور حسان کے دل پر ضرب لگا رہی تھی۔

"عمائلہ...!" داور حسان کی پکار میں جذبوں کی لپک تھی۔

"تم اب بھی انکار کر دو عمائلہ! میں کچھ دنوں تک کسی بھی طرح چچا کو یہاں بلوا لوں گا۔ مجھے کچھ دنوں کا وقت دے دو۔ پلیز یوں ظالم نہ بنو۔" ٹوٹا لہجہ عمائلہ کے دل کی دنیا زیر و زبر کر گیا۔

"داور! مجھے کمزور مت کیجیے۔ یہ سب بہت سہل میرے لیے بھی نہیں۔"

"پھر کیوں اذیت کی چادر تانے بیٹھی ہو۔ انکار کر دو۔" وہ اکسا رہا تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں انکار کروں؟"

"مجھ سے محبت نہیں تمہیں؟"

"میں یہ نہیں کر سکتی۔ اپنے ماں باپ کا مان' بھروسہ' اعتبار توڑنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔" وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئی۔

"محبت کیوں کی تھی؟" وہ بے ساختہ بولا تھا۔

"میری بھول تھی۔" وہ کٹھور پن سے بولی۔

"تمہاری بھول میرے لیے زندگی بھر کا روگ بن جائے گی عمائلہ۔" وہ تڑپا تھا۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ اللہ حافظ۔" عمائلہ نے سنگ دلی کی انتہا کر دی۔

"عمائلہ... عمائلہ تم رہ لوگی میرے بغیر؟" اس کی بے تابانہ پکار پر عمائلہ صرف ایک لمحے کے لیے ڈگمگائی تھی۔

"کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ میں بھی رہ لوں گی اور آپ بھی۔" پتھریلا لہجہ داور حسان کو گنگ کر گیا۔

"تم بھی نکلیں نا آخر وہی ٹائم پاس کے لیے محبت کی پینگیں بڑھانے والی عام لڑکی جو وقت گزاری کے بعد ماں باپ کی فرماں برداری کا چولا پہنے ان کی رضا میں راضی خوشی اپنے شوہر کا دل اور آنگن دونوں آباد کرنے سسرال سدھار جاتی ہیں۔ پیچھے کوئی اس کی بلا

سے جہنم رسید ہو یا زندہ درگور۔" وہ سنگ اٹھا تھا۔

کبھی جس داور احسان کی آواز اس کے لب و لہجہ کی خوب صورتی عمائلہ کو سرور انگیز کیفیت سے دوچار کرتی تھی آج اس کا جھنکارتا لہجہ اور لفظوں کی کاٹ عمائلہ کو شدید صدمے کے زیر اثر گنگ کر گئے۔

"اگر تم نے مجھ سے سچی محبت کی ہے نا! عمائلہ تو اس رشتے سے انکار کر کے مجھے فقط اطلاع دے دیتا" میں تمہیں اپنانے چلا آؤں گا۔" وہ اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد اب پرسکون سا کہہ رہا تھا۔

"مجھے محبت ہے یا نہیں؟ سچی ہے یا جھوٹی؟ اس کی وضاحت اب آپ کو دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔" سپاٹ لہجے میں کہتی عمائلہ نے "اب" پر زور دیا۔

"رہی بات شادی سے انکار کر کے آپ کو اطلاع کرنے کی تو انتظار کی زحمت مت کیجیے گا۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔" عمائلہ نے کس وقت سے اتنا کہا وہی جانتی تھی۔

"میں منتظر رہوں گا۔" فون کان سے ہٹاتی عمائلہ نے داور حسان کی موہوم سی آواز سنی تھی۔ شاید آخری مرتبہ کیوں کہ اس کے بعد عمائلہ نے اپنے سیل فون میں سے داور حسان کا کانٹیکٹ نمبر، پیغامات اور اس کی تصویر سب کچھ مٹا دیا۔

اس سے ملنا ہی نہیں دل میں تہیہ کر لیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہ کر لیں
ایک ہی بار یہ گھر راکھ ہو جاں تو چھوٹے
آگ کم ہے تو ہوا اور مہیا کر لیں

☼ ☼ ☼

بیتے وقت کی دھار میں چھ مہینے کب گم ہوئے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ان چھ مہینوں میں عمائلہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ہاں یہ ہے کہ جب فریدہ فرقان محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیشانی چومتے ہوئے کہتیں۔

"عمائلہ جیسی سمجھدار اور فرماں بردار بیٹیاں گھروں کی رحمت ہوتی ہیں۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے اور شوہر کے گھر آنگن میں آباد رکھے۔"

تو کسی کا جھنکارتا لہجہ بام خرد سے جھانکتا اور عمائلہ کے لبوں سے ہنسی اماوس کی راتوں میں ماہ کامل کی مانند ناپید ہو جاتی۔ بیتے دنوں میں عمائلہ نے دانستہ داور حسان کو سوچنے سے گریز کیا تھا کہ اب اس کے خواب و خیال کسی اور کی امانت تھے اور وہ اس امانت میں خیانت کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔

البتہ اس سارے قصے میں اس کی اپنی حقیقت تو اس پر واضح ہو چکی تھی کہ اس کی ذات کا غرور و تمکنت محض بھر بھری ریت کی دیوار تھا جسے داور حسان جیسا کوئی بھی شخص محض لفظوں کی جادوگری سے ڈھیر کر سکتا ہے جیسے داور حسان نے کیا۔ وہ واقعی ان ہی عام لڑکیوں میں سے تھی جو جانے انجانے آدم کے بیٹے کے دام میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور کچھ وقت کے بعد جب وہ بھنورا صفت نئے گل کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ہے تو حوا کی نادان بیٹی کو اپنی مجروح انا اور شکستہ غرور کے ساتھ کسی اور کی دنیا بساتے ہوئے سب کچھ فراموش کرنا ہی پڑتا ہے۔

سب سراسر فریب ہے کیا ان کا اعتبار
یہ پیار، حسن، عشق، جوانی، محبتیں

☼ ☼ ☼

پھولوں سے آراستہ خوب صورت حجلۂ عروسی میں بیٹھی عمائلہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بیڈ کے عین سامنے رکھا سنگھار میز اس کی خوب صورتی کا اعتراف کر رہا تھا۔ سرخ عروسی جوڑے میں لپٹی ڈھیر سارے گجروں سمیت تمام عروسی لوازمات سے مزین عمائلہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے انتظار کے بعد آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی اندر آیا تھا۔ اسٹل کرتے کھسے میں مقید مضبوط مردانہ پاؤں عمائلہ کی نگاہوں کی گرفت میں آ گئے۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ پھر وہ تھوڑا سا سائیڈ ٹیبل کی سمت جھکا تھا۔ اس نے کچھ نکالا تھا دراز سے۔ اب وہ مضبوط قدم بڑھاتا عمائلہ کے نزدیک آ بیٹھا۔ وہ خود میں سمٹ گئی۔ وہ انفاس کی موجودگی کے باوجود کمرے میں



خاموشی رقصاں تھی۔ کتنے ہی پل عمائلہ پر شوق نگاہوں کی حدت سے سرخ ہوتی رہی۔

"تم بلاشبہ میرے تراشیدہ تصوراتی پیکر سے بڑھ کر حسین ہو۔"

مانوس لب و لہجہ، خوب صورت انداز اور مخمور بے خود اعتراف۔ عمائلہ نے چونک کر سر اٹھایا اور ششدر رہ گئی۔

نکاح سے پہلے اس نے تصویر دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نکاح کے وقت اس پر بار بار طاری ہوتی غشی نے حواس سلب کر لیے تھے۔ اس نے داور حسان کا نام سنا ضرور ہو گا لیکن ہوش کب تھا جو عقل کچھ کام کرتی۔

"اتنی حیران مت ہو۔ میں ہی ہوں داور حسان ملک عرف حسنی ملک۔" وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے بت بنے ہوئے انداز میں اپنا ہاتھ داور کے گال پر رکھ کر اس کے ہونے کا یقین کیا۔ وہ ہنس پڑا۔

"یقین کر لو عمائلہ۔ میں ہی ہوں۔" داور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"بہ۔۔۔ پانی!" عمائلہ نے خشک ہوتے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔ پانی پی کر حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے نظر بھر کے داور حسان کی صورت دیکھی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عمائلہ پزل ہوتی رخ پھیر گئی وہ مسکرا دیا۔

"جاننا چاہتی ہو یہ سب کیا ہے؟" وہ گویا ہوا۔ عمائلہ نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

"یہ میری محبت ہے۔" وہ غیر معمولی سنجیدہ تھا۔ "تم ان چھ مہینوں میں سمجھتی رہی ہو گی کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔" وہ تصدیق چاہنے کے لیے ٹھہرا تھا۔ لیکن عمائلہ خاموش تھی۔

"اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوئی ہوتی عمائلہ داور حسان ملک تو تمہارا یہ خیال ضرور درست ہوتا۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے تم سے محبت ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم آج اس طرح میرے سامنے ہو۔" وہ انا پرست شہنشاہ کی مانند لگ رہا تھا جو محبت بھی احسان سمجھ کر کرتے ہیں۔

عمائلہ کو اس کے ساتھ ہوئی آخری گفتگو کی تلخی یاد آنے لگی اور اس کی آنکھوں کا فرش بھیگنے لگا۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا میں آپ کے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔" عمائلہ نے تڑپ کر پلکیں اٹھائیں۔ وہی آغاز تھا باب سیاہ کا۔ جو اس سے اس کی ذات کا غرور چھین کر لے گیا۔

"تمہارا یہ جملہ مجھے تازیانے کی طرح لگا تھا۔ بغیر مجھے جانے جب تم نے مجھ پہ آوارہ مزاجی کا ٹیگ لگا کر خود کو کسی اور دنیا کی مخلوق پوز کیا میں نے اسی دم تم پر تمہاری حقیقت واضح کرنے کی ٹھان لی تھی۔

تم میرے دام میں نہ آتیں تو میں یقیناً" پیچھے ہٹ

سے جہنم رسید ہو یا زندہ در گور۔" وہ سلگ اٹھا تھا۔

کبھی جس داور احسان کی آواز اس کے لب و لہجہ کی خوب صورتی عمائلہ کو سرور انگیز کیفیت سے دوچار کرتی تھی آج اس کا چھنکارتا لہجہ اور لفظوں کی کاٹ عمائلہ کو شدید صدمے کے زیر اثر گنگ کر گئے۔

"اگر تم نے مجھ سے سچی محبت کی ہے نا! عمائلہ تو اس رشتے سے انکار کر کے مجھے فقط اطلاع دے دینا' میں تمہیں اپنانے چلا آؤں گا۔" وہ اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد اب پرسکون سا کہہ رہا تھا۔

"مجھے محبت ہے یا نہیں؟ سچی ہے یا جھوٹی؟ اس کی وضاحت اب آپ کو دینا میں ضروری نہیں سمجھتی۔" سپاٹ لہجے میں کہتی عمائلہ نے "اب" پر زور دیا۔

"رہی بات شادی سے انکار کر کے آپ کو اطلاع کرنے کی تو انتظار کی زحمت مت کیجیے گا۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔" عمائلہ نے کس وقت سے اتنا کہا وہی جانتی تھی۔

"میں منتظر رہوں گا۔" فون کان سے ہٹاتی عمائلہ نے داور حسان کی موہوم سی آواز سنی تھی۔ شاید آخری مرتبہ کیوں کہ اس کے بعد عمائلہ نے اپنے سیل فون میں سے داور حسان کا کانٹیکٹ نمبر' پیغامات اور اس کی تصویر سب کچھ مٹا دیا۔

اس سے ملنا ہی نہیں دل میں تہیہ کر لیں
وہ خود آئے تو بہت سرد رویہ کر لیں
ایک ہی بار یہ گھر راکھ ہو جائے تو چھوٹے
آگ کم ہے تو ہوا اور مہیا کر لیں

☼ ☼ ☼

بیتے وقت کی دھار میں چھ مہینے کب گم ہوئے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ان چھ مہینوں میں عمائلہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ہاں یہ ہے کہ جب فریدہ فرقان محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیشانی چومتے ہوئے کہتیں۔

"عمائلہ جیسی سمجھدار اور فرماں بردار بیٹیاں گھر والوں کی رحمت ہوتی ہیں۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے اور شوہر کے گھر آنگن میں آباد رکھے۔"

تو کسی کا چھنکارتا لہجہ بام خرد سے جھانکتا اور عمائلہ کے لبوں سے ہنسی اماوس کی راتوں میں ماہ کامل کی مانند ناپید ہو جاتی۔ بیتے دنوں میں عمائلہ نے دانستہ داور حسان کو سوچنے سے گریز کیا تھا کہ اب اس کے خواب و خیال کسی اور کی امانت تھے اور وہ اس امانت میں خیانت کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔

البتہ اس سارے قصے میں اس کی اپنی حقیقت تو اس پر واضح ہو چکی تھی کہ اس کی ذات کا غرور و تمکنت محض بھربھری ریت کی دیوار تھا جسے داور حسان جیسا کوئی بھی شخص محض لفظوں کی جادوگری سے ڈھیر کر سکتا ہے جیسے داور حسان نے کیا۔ وہ واقعی ان ہی عام لڑکیوں میں سے تھی جو جانے انجانے توم کے بیٹے کے دام میں گرفتار ہو جاتی ہیں اور کچھ وقت کے بعد جب وہ بھنورا صفت نئے گل کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ہے تو حوا کی نادان بیٹی کو اپنی مجروح انا اور شکستہ غرور کے ساتھ کسی اور کی دنیا بساتے ہوئے سب کچھ فراموش کرنا ہی پڑتا ہے۔

سب سربسر فریب ہے' کیا ان کا اعتبار
یہ پیار' حسن' عشق' جوانی' محبتیں

☼ ☼ ☼

پھولوں سے آراستہ خوب صورت حجلہ عروسی میں بیٹھی عمائلہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بیڈ کے عین سامنے رکھا سنگھار میز اس کی خوب صورتی کا اعتراف کر رہا تھا۔ سرخ عروسی جوڑے میں لپٹی ڈھیر سارے گجروں سے مہکتی' تمام عروسی لوازمات سے مزین عمائلہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ تقریباً" آدھے گھنٹے انتظار کے بعد آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی اندر آیا تھا۔ داخل کرے کمرے میں مقید مضبوط مردانہ پاؤں عمائلہ کی نگاہوں کے گرفت میں آ گئے۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ پھر وہ تھوڑا سا سائیڈ ٹیبل کی سمت جھکا تھا" اس نے کچھ نکالا تھا دراز سے۔ اب وہ مضبوط قدم بڑھاتا عمائلہ کے نزدیک آ بیٹھا۔ وہ خود میں سمٹ گئی۔ دو انفاس کی موجودگی کے باوجود کمرے میں



خاموشی رقصاں تھی۔ کتنے ہی پل عمائلہ پر شوق نگاہوں کی حدت سے سرخ ہوتی رہی۔

"تم بلاشبہ میرے تراشیدہ تصوراتی پیکر سے بڑھ کر حسین ہو۔"

مانوس لب و لہجہ' خوب صورت انداز اور مخمور و بے خود اعتراف عمائلہ نے چونک کر سر اٹھایا اور ششدر رہ گئی۔

نکاح سے پہلے اس نے تصویر دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نکاح کے وقت اس پر بار بار طاری ہوتی غشی نے حواس سلب کر لیے تھے۔ اس نے داور حسان کا نام سنا ضرور ہو گا لیکن ہوش کب تھا جو عقل کچھ کام کرتی۔

"اتنی حیران مت ہو۔ میں ہی ہوں داور حسان ملک عرف حسنی ملک۔" وہ اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے بہت سہمے ہوئے انداز میں اپنا ہاتھ داور کے گال پر رکھ کر اس کے ہونے کا یقین کیا۔ وہ ہنس پڑا۔

"یقین کر لو عمائلہ۔ میں ہی ہوں۔" داور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"پ۔ پانی!" عمائلہ نے خشک ہوتے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔ پانی پی کر حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے نظر بھر کے داور حسان کی صورت دیکھی وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عمائلہ پزل ہوتی رخ پھیر گئی وہ مسکرا دیا۔

"جاننا چاہتی ہو یہ سب کیا ہے؟" وہ گویا ہوا۔ عمائلہ نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

"یہ میری محبت ہے۔" وہ غیر معمولی سنجیدہ تھا۔

"تم ان چھ مہینوں میں سمجھتی رہی ہو گی کہ میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔" وہ تصدیق چاہنے کے لیے ٹھہرا تھا۔ لیکن عمائلہ خاموش تھی۔

"اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوئی ہوتی عمائلہ داور حسان ملک تو تمہارا یہ خیال ضرور درست ہوتا۔ لیکن تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے تم سے محبت ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم آج اس طرح میرے سامنے ہو۔" وہ انا پرست شہنشاہ کی مانند لگ رہا تھا جو محبت بھی احسان سمجھ کر کرتے ہیں۔

عمائلہ کو اس کے ساتھ ہوئی آخری گفتگو کی تلخی یاد آنے لگی اور اس کی آنکھوں کا فرش بھیگنے لگا۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا میں آپ کے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں۔" عمائلہ نے تڑپ کر پلکیں اٹھائیں۔ وہ ہی آغاز تھا باب سیاہ کا۔ جو اس سے اس کی ذات کا غرور چھین کر لے گیا۔

"تمہارا یہ جملہ مجھے تازیانے کی طرح لگا تھا۔ بغیر مجھے جانے جب تم نے مجھ پہ آوارہ مزاجی کا ٹیگ لگا کر خود کو کسی اور دنیا کی مخلوق پوز کیا میں نے اسی دم تم پہ تمہاری حقیقت واضح کرنے کی ٹھان لی تھی۔

تم میرے دام میں نہ آتیں تو میں یقیناً" پیچھے ہٹ

جاتا لیکن تم بھی عام لڑکیوں کی طرح محض دو چار جذباتی جملوں سے پگھل گئیں اور میں اپنے اندازے کی درستگی پر سرشار ہو اٹھا۔ پھر میں نے تم سے تمہاری تصویر مانگی جو تم نے میرے بے حد اصرار پر بھی نہیں دی۔ یہاں میں تھوڑا سا بددل ہوا کہ شاید تم واقعی مختلف ہو۔ لیکن جب میں نے کالج کے باہر آکر تمہیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور تم معمولی سے تردد کے بعد مان گئیں تو میں نے پھر کرسی پر تمہیں نچاؤ کھانے کی اور اس کے بعد میرا ارادہ تمہیں ڈیٹ پر لے جانے کا بھی تھا لیکن۔۔۔"

اتنا کہہ کر داور خاموش ہوا تھا۔ عمائلہ کی آنکھوں سے ابلتے آنسو اس کی پلکوں کے بند توڑتے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ سسکیاں سرخ لبوں پر سرنج رہی تھیں۔ داور حسان کی پوریں عمائلہ کے اشک سنبھالنے لگیں۔

"لیکن۔۔۔ برا ہو اس محبت کا۔" وہ بہت آہستہ بولا تھا عمائلہ بمشکل سن پائی۔

"تم واقعی میرے ٹائپ کی لڑکی نہیں تھیں عمائلہ لیکن میں چاہتے ہوئے بھی تم سے منہ نہیں موڑ سکا اور یا اللہ بی بی جان کو بھیج کر تمہیں اپنے نام کروا لیا۔" عمائلہ نے اسے کنکھیوں نظروں سے گھورا اس کے دل میں آویزاں تصویر اس شخص کی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناکہ اس شادی سے انکار کر کے مجھے مطلع کر دینا۔ گو میرے ضدی دل نے تمہارے قرب کی ضد باندھ رکھی تھی۔ لیکن اگر تم نے انکار کر دیا ہوتا نا عمائلہ! تو یہاں میں اپنی محبت سے بھی دستبردار ہو جاتا کہ جسے اپنے ماں باپ کے مان رضامندی اور عزت و محبت کا پاس نہیں وہ میری پہلی نظر کی نوخیز محبت کی کیا قدر کرے گی۔" عمائلہ رنجیدگی سے اسے تکے رہی تھی۔

"اتنی غمزدہ کیوں ہو رہی ہو عمائلہ؟" داور نے سائیڈ پر دھرا مخملیں کیس اٹھا کر اس میں سے کنگن نکالے اور عمائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے تم سے کتنی محبت ہے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔" اس نے عمائلہ کی کلائی میں کنگن سجانے کے بعد اسے انگلی سے چھیڑا۔ نتیجتاً کنگن نے عمائلہ کی کلائی میں بل کھایا۔

"یقین کرو عمائلہ۔ ہماری آخری مرتبہ ہوئی گفتگو کے بعد میں نے خود غرض دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی وہ سم تبدیل کر دی کہ کہیں تمہارا فون نہ آجائے۔ کہیں تم انکار نہ کر دو اور کہیں مجھے تم سے دستبردار نہ ہونا پڑے۔ میں ہر روز دعا کرتا تھا کہ تم انکار نہ کرو بھلے تم اپنے داور حسان کو بھلانے کی کوشش مت کرو۔ بھلے تمہارے دل میں حسنی ملک نہ بس سکے۔"

عمائلہ کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔ داور حسان نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کا نفیس سا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔ اس نے بیگ کھول کر عمائلہ کا سیل فون نکال کر اس میں سے سم نکالی اور اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ عمائلہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا اس کے لب کچھ کہنے کی خواہش میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ پھر داور حسان ملک نے وہیں بیٹھے بیٹھے سیل فون دائیں طرف کی دیوار پہ کھینچ مارا نتیجتاً سیل فون ٹکڑے ٹکڑے ہو تا زمین پر بکھر گیا۔

اب وہ عمائلہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا لٹھے کی مانند سفید ہوا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر کہنے لگا۔

"میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا عمائلہ! تم سے بے انتہا محبت کروں گا لیکن۔۔۔" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی وہ اٹھ کر باہر گیا تھا۔ پھر ہوٹی عمائلہ کی سماعتوں میں اس کا آخری ادھورا جملہ گونج رہا تھا۔

"میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا عمائلہ! تم سے بے انتہا محبت کروں گا لیکن۔۔۔؟ اعتبار نہیں کروں گا۔"

اس پل پتھر ہوئی عمائلہ کو لگا کہ اب وہ کبھی کھل کر سانس نہ لے سکے گی۔

❀ ❀

"اماں.....!" وہ احتجاجاً چلائی۔

مگر اماں نے ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دی اور اپنے سابقہ کام میں اسی طرح مشغول رہیں۔ جیسے اس کے چلانے سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"اماں آپ جلدی نہیں کر رہیں یہ سب کرکے؟" اب اس نے پاس پڑے پیپر سمیٹنے شروع کر دیے تھے۔ اماں پھر سے نوٹس لیے بغیر مشغول تھیں۔

"آپ اپنی مرضی نہیں کر سکتیں۔" اس نے اماں کو قائل کرنے کا کام جاری رکھا۔

"تو اپنی مرضی نہ چلا تیری مانے گا کون؟" اماں گویا ہوئیں، وہ حیرت سے دنگ ماں کو دیکھتی رہ گئی، اس کی موٹی موٹی خوب صورت آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں گویا چھلکنے کو تیار ہوں۔

"ہاں، جو میری مرضی مانتا تھا وہ کون سا اب یہاں ہے، میں کسی اور سے کیا امید رکھوں! میرا ہے ہی کون؟ جو تھا اسے تو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا۔" دو سال پہلے کا غم پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔ بابا جان کی موت کا منظر پھر سے نظروں کے سامنے آنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ماں سے شکوہ کناں ہو گئی۔ اماں کا ویک پوائنٹ اس کے ہاتھ لگ گیا، وہ بھی نرم پڑ گئیں۔

"دیکھ ماہین زندگی اکیلے نہیں کٹتی۔" اماں سمجھانے والے انداز میں گویا ہوئیں۔

"میں نے کب انکار کیا ہے؟" وہ زچ ہوئی۔

"پھر مسئلہ کیا ہے؟" اماں کو اس کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اماں مجھے پڑھنا ہے۔" وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ اماں کا جی چاہا جوتا پکڑ کر اس کی دھنائی کر دیں۔

"اور کتنا پڑھے گی؟" اماں کی جھنجلائی ہوئی آواز نے اس کے کئی آنسوؤں کو بہنے پہ مجبور کیا۔

"بابا کا خواب پورا کرنا ہے، کم از کم ایم اے تو کرنے دو، پھر چاہے جو جی میں کر دیں۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔" اس شان بے نیازی سے کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی اور اماں کا اس کے کم از کم کہنے پہ پھر سے پارہ ہائی ہو گیا۔

"ہاں ہاں تو ایم اے نہیں کرے گی تو دنیاداری تو رک ہی جائے گی نا! مجھے یہ بتا تو نے کوئی نوکری کرلی ہے؟ یا یہ گھر تمہارے سہارے چلے گا۔" اماں کو اب چپ کروانا محال تھا، وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

صارم اس کی اکلوتی پھپھو کا بیٹا، اس کے بچپن کا منگیتر، اس دیوار کے پار ہی تو رہتا تھا۔ اس کی دنیا بہت محدود سی تھی۔ اماں، صارم (صارم کی امی) پھپھو اور رجا (صارم کی بہن) بابا دو سال پہلے انتقال کر گئے تھے۔ صارم اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے بابا کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی۔ ایم اے کی ڈگری لینا اس کے بابا کا ہی نہیں خود اس کا بھی خواب تھا رجا، ماہین کی بچپن کی دوست اور کزن بھی، ماہین کے ساتھ ساتھ بی اے فائنل میں تھی۔

پھر نہ کرنے کے باوجود اس کا نکاح صارم سے ہو گیا۔ بے شک سگی پھپھو تھیں مگر وہ اس ہنگامے کو فی الحال تو دو، تین سال تک اٹکائے رکھنا چاہتی تھی کہ تاکہ مزید پڑھ سکے مگر کہاں! تقدیر کے آگے کس کی بس چلتا ہے؟

اس نے تو بہت تدبیریں کیں کہ فی الحال شادی نام کا موضوع نہ ہی شروع ہو۔

شاید صارم کی دعائیں رنگ لائیں اور اس طرح وہ صارم کے نکاح میں آ گئی۔ اس کے وجود میں اک عجیب سی بہار اتر آئی رنگوں کو وہ ہتھیلیوں پہ سمیٹنے لگی اور خوشبوؤں کے سنگ اب کے بار بہار عجیب سی سرشاری لے کر آئی اور اس کے وجود کے پور پور کو مہکانے لگی۔

"نکاح کے دو بولوں میں اتنا اثر ہے؟" وہ خود سے سوال کرتی اور پھر خود ہی مسکراتی۔

نکاح کے دن وہ گلابی شرارہ پہنے دلہن بنی بے حد تروپ ہو رہی تھی۔ تبھی اس کے پاس بیٹھی رجا کا سیل فون بجا اور وہ ایکسکیوز کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔



ماہین نے بہتیرا پکارا، مگر وہ رجا ہی کیا جو فون کا پیچھا چھوڑ دے۔ اس دوران صارم نہ جانے کب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھے گئی۔

"شرم کرو میں تمہارا مجازی خدا ہوں، نگاہیں نیچے رکھو۔" صارم اس کے گھورنے پر ڈانٹنے لگا۔

رجا کے باہر جانے کی منطق اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بہت میسنے ہیں یہ دونوں بہن بھائی، وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

"آپ کس مراقبے میں ہو؟" صارم اب کی بار زور سے بولا۔ تو اس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہونے لگیں۔

"اوکے اوکے..... سوری بابا۔" وہ کان پکڑے کھڑا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

اور صارم نے اس مہکتے وجود کو جو آنکھوں میں نمی لیے صرف اس کی خاطر مسکرا رہا تھا، بھرپور توجہ سے اپنے اندر اترتے محسوس کیا۔

"ہائے۔" وہ دل پہ ہاتھ رکھ کر الٹا سیدھا ہونے لگا۔

"کیا ہو گیا۔" وہ ایک دم بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ قاتل ادائیں لے ڈوبیں۔" صارم نے دہائی دی۔ ماہین نے اسے ایک زور سے دھپ لگائی۔

"ڈرگی باز آجا میں تجھے پہلے بھی بتا چکا کہ میں تیرا مجازی خدا ہوں۔" اب کی بار وہ کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔

اچانک صارم نے اس کے لال گلال مہندی سے رچے ہاتھ تھام لیے۔

"تم میرے لیے کیا ہو تم سمجھ کے بھی نہیں سمجھ سکیں، میں تمہیں دنیا کی تمام خوشیاں دینے کی کوشش کروں گا۔" اس نے یقین دہانی کرواتے ہوئے اس کا سر پر ہاتھ دبایا۔

"وعدہ؟" ماہین نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"گناہ گار مت کرو یار۔" صارم نے حسب توقع جواب دیا۔ صارم کی عجیب سی سوچ تھی، وہ کہتا تھا وعدہ نہیں کرنا چاہیے ٹوٹ جائے تو گناہ ہوتا ہے۔

"تم ایم اے کرنا چاہتی ہو نا؟" صارم نے اس سے پوچھا تو اس نے پرجوش ہوتے سر کو زور سے ہلایا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ رخصتی تمہارے ماسٹرز کے بعد ہو گی۔" اس سے پہلے وہ کوئی گستاخی کرتا، ماہین اٹھ کر باہر کی طرف دوڑی، تب صارم کا قہقہہ اپنے پیچھے واضح سنائی دیا۔

☼ ☼ ☼
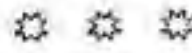
"ماہی! او ماہی! ادھر دیکھو، اف اللہ کیا لڑکی ہے یار۔" رجا کسی سے جلدی ایمپریس نہیں ہوتی تھی۔ اب اس قدر اشتیاق سے کہہ رہی تھی تو تیز تیز چلتی ماہین اس لڑکی کو دیکھنے لگی جو شاید کالج میں نئی آئی تھی۔

"کچھ خاص نہیں ہے، ذرا ادائیں ہی ہیں، ورنہ اس سے پیاری تو ہماری رجا ہی ہے۔" ماہین بولی۔

"ویسے کوئی کام ہے؟" رجا اس کی تعریف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ہاں ہے نا، مجھے انگلش کے نوٹس چاہئیں۔" ماہی کون سا دینے والی تھی۔ وہ دونوں ہنستی ہوئیں کینٹین کی طرف چل دیں۔

"اف یار کتنا کھانے لگی ہے تو؟" رجا اس کے سراپے کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی جو آج کل کچھ پھیل رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی برا مانے بغیر برابر سموسوں سے انصاف کرتی رہی۔ چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے رجا کی بات کا جواب دینا فرض سمجھا۔

"تم بھی کھاؤ مرو، ویسے تو ہو ہی سوکھی لکڑی۔ تمہارا بھائی بعد میں مجھے طعنے دے گا کہ میری بہن کو بھوکا رکھ کر مار دیا۔"

"واہ۔" اپنی بات کے جواب میں اس نے رجا کی چیخ نما آواز سنی۔

"اب کون سا بھوت نظر آ گیا تمہیں، جو....." سامنے دیکھ کر اس کی نان اسٹاپ بولتی بھی بند ہو گئی۔ آفس سے نکلتا وہ خوبرو سا شخص۔

"کون ہے یہ؟" رجا نے تجسس کے احساسات کو زبان دے کر ساتھ والی چیئر پر بیٹھی تمثیلہ سے پوچھا۔
"کمپیوٹر کے نئے ٹیچر ہیں۔" جواب تھا یا بم ماہین کے منہ کو جاتا چائے کا کپ چھلک گیا حیرت کی بات اس بندے کا ٹیچر ہونا نہیں تھی بلکہ وہ نئی لڑکی بڑے دھڑلے کے ساتھ اس ٹیچر کے ساتھ باتیں بگھارنے میں مگن تھی۔ کسی بھی لڑکی کا "یوں" ٹیچر کے ساتھ فری ہونا کچھ عجیب سا تھا ان سب کے لیے۔ اتنے میں کلاس کی بیل ہونے پر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کلاس لینے کے لیے چل دیں۔
تھوڑی دیر بعد وہ میڈم زرینہ کے دیے جانے والے نوٹس میں سر کھپا کر پہلے والی بے اطمینانی کھو چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پہلی کلاس اگلے دن کمپیوٹر کی تھی۔ وہی ہینڈسم سا بندہ کلاس میں داخل ہوا تو سب نے ایک دوسروں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے کیے۔
اور وہ نئی اسٹوڈنٹ جس کا نام حریرہ تھا ببل چباتی کسی سوچ میں گم مگر اس ٹیچر کو فوکس کیے ہوئے تھی۔
آج تعارف کا دن تھا۔ سب سے اپنے آپ کو متعارف کروانے کے بعد وہ لیکچر کی بابت دریافت کرنے لگا۔
وہ دل چسپ سا شخص اس سارے پینتالیس منٹ میں ساری کلاس کی توجہ کا مرکز رہا۔

☼ ☼ ☼

"تم کیسے جانتی ہو اس لڑکی کو؟" رجا آج تمثیلہ کے سر پر سوار تھی۔
"یار میں اس کے ساتھ میرا مطلب ہے اس کی کلاس فیلو رہ چکی ہوں پورے دو سال۔" تمثیلہ کا وضاحتی لہجہ ماہین کو ہنسنے پہ مجبور کر رہا تھا واضح ہو رہا تھا کہ تمثیلہ اس ہٹلر سے ڈر رہی ہے۔ جو کمر پر ہاتھ رکھے لڑاکا عورتوں کی طرح دوسرا ہاتھ نچا نچا کر تفتیشی انداز میں گویا تھی۔
"تم تو اپنی مکھی بند کرو۔" رجا کو ماہین کی ہنسی پہ اعتراض ہوا۔
"اچھا بتاؤ۔" توپ کا رخ پھر سے تمثیلہ کی جانب مڑ گیا تھا۔
"کیا؟" تمثیلہ تو بے چاری آج بری پھنسی تھی۔
"اس کے بارے میں۔" رجا نے آنکھیں مٹکائیں۔
"سر کے بارے میں۔" تمثیلہ کنفیوز سی تھی۔
"نہیں بے وقوف اس کے بارے میں۔" رجا نے گراؤنڈ میں بیٹھی حریرہ کی طرف اشارہ کیا۔
"ایک نمبر کی فلرٹ لڑکی ہے۔ نت نئے بوائے فرینڈز' فون' گفٹس' بڑے بڑے نوٹ ہمہ وقت اس کی پاکٹ میں ہوتے ہیں۔ جہاں تک میں جانتی ہوں یہ مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھنے والی معمولی سی لڑکی ہوتی تھی مگر اب اس کے رنگ ڈھنگ سے اندازہ مشکل ہے کہ اس سب کے پیچھے کیا وجوہ ہیں۔" تمثیلہ نے جو انکشافات شروع کیے تو ماہین کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں اور اس نے اپنے حلق کے آگے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔
رجا کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔
"تم دونوں بچ کے رہنا۔" رجا کا جب حیرت سے برا حال تھا تو تمثیلہ نے بحال اوسان کے ساتھ نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔
"میں امیر ہوں اور نہ ہی اتنے بڑے بڑے قیمتی گفٹس افورڈ کر سکتی ہوں۔ اور تمہیں ماہی کی مونچھیں نظر آرہی ہیں جو ہمیں بچنے کا مشورہ دے رہی ہو؟" رجا کی وقتی حیرت اپنے اختتام کو پہنچی تو اس نے تمثیلہ کی خوب کلاس لے ڈالی تمثیلہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔
جب وہ دونوں سیڑھیوں سے اتر رہی تھیں تو خوشبو سے نہایا ہوا اک وجود ان کے پاس سے گزرا۔
"ہونہہ۔" رجا نے منہ بنایا۔
جبکہ حریرہ سے ماہین کو بھی خاصی چڑ ہو چلی تھی۔

☼ ☼ ☼



"یہ موا موبائل کب سے بج رہا ہے کہاں ہو تم لڑکی؟" اماں نے چھت کی طرف منہ کر کے اسے کئی آوازیں دے ڈالیں۔
ابھی ایک ڈیڑھ ہفتے پہلے ہی نیا موبائل سیٹ صارم نے اسے گفٹ کیا تھا اماں نے نکاح کے بعد ڈائریکٹ ملنے پر پابندی لگا دی تھی تو صارم نے موبائل سیٹ پھپھو کے ذریعے اسے بھیجا تھا۔
"آرہی ہوں اماں۔" وہ دھپ دھپ کرتی چھت سے اتری۔
"کیا کر رہی تھی؟" اماں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔
"کپڑے اتار رہی تھی۔" وہ منمنائی۔
"کہاں ہیں؟" اس کو خالی ہاتھ دیکھ کر اماں کو تاؤ آگیا۔
"وہیں رہ گئے۔" اب کیسے بتاتی صارم چھت پہ بیٹھا تھا۔
اس نے سیل فون اٹھایا تو رجا کے ڈھیروں ایس ایم ایس تھے چند ایک دوسری کلاس فیلوز کے تھے اس نے کچھ کے ریپلائی دیے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اٹھنے ہی لگی تھی۔ کال آگئی دوسری طرف صارم تھا۔
"کون ہے؟" اماں صحن میں کھڑی پوچھ رہی تھیں۔
"آپ کا بھتیجا۔" اماں کو پتہ تھا اب ایک آدھ گھنٹہ تو لگے گا ہی وہ سوچتی ہوئیں خود ہی سیڑھیاں چڑھنے لگیں جہاں کپڑے اتوار ہونے کے باعث دھو کر پھیلائے گئے تھے۔
اندر ماہین ہنس ہنس کے دوہری ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرا بھائی اس ٹیچر کا کلاس فیلو تھا۔" تمثیلہ کا نام لیتے ہی سب نے جیمز بانڈ نہیں رکھا تھا۔ سراغ رساں تمثیلہ سے بہتر کوئی تھا نہیں آج پھر رجا اس کی معلومات سے فیض یاب ہو رہی تھی۔ لائبریری میں تمثیلہ اور رجا کی سرگوشیاں جاری تھیں۔
لائبریرین نے کئی بار سر اٹھا کر ان سرگوشیوں کا پتہ لگانا چاہا مگر سب لوگ انہماک سے پڑھنے میں مصروف تھے ماہین اپنے اور رجا کے نوٹس بنا رہی تھی۔ رجا کو بھوک نے ستایا تو وہ کینٹین سے کچھ لینے تمثیلہ کے ساتھ باہر نکل آئی۔
تبھی ان کی ناپسندیدہ ہستی لائبریری میں داخل ہوئی وہ ماہین سے بات کرنا چاہتی تھی۔ ماہین حیران ہوئی اور اس کو کچھ دیر لائبریری میں رکنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

"اف اللہ کیسے اس لڑکی نے سب کو اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔ آج کل میڈم زرینہ جو کبھی کسی کو لفٹ نہیں کراتیں اب حریرہ کو سب پہ ریفرنس دیتی ہیں تم تمثیلہ کی باتیں سنو تو دنگ رہ جاؤ۔" رجا کو ماہین کی لاتعلقی محسوس نہ ہوئی تبھی وہ بات جاری رکھے ہوئے تھی۔
"اس نے دو بار خود کشی کی کوشش کی ہے' محترمہ ایک بار کسی کے لیے بھاگنے کی ناکام کوشش بھی کر چکی ہیں۔ اف توبہ توبہ۔" رجا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"اگر بھائی کو اس کے کرتوت پتہ چل گئے نا تو ہو گیا ہم دونوں کا ایم اے وہ ہمیں یونیورسٹی میں بھی ایڈمیشن نہیں لینے دیں گے۔" اس وقت وہ چھٹی کے بعد گیٹ پہ کھڑیں صارم کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔
اب رجا بھی ماہین کو اپنی باتوں کی لپیٹ میں لے چکی تھی۔
پھر ماہین کی نظر اچانک باہر اٹھی جہاں ایک روح فرسا منظر شاید اسی کی نظر کا ہی منتظر تھا۔
صارم سامنے بائیک لیے کھڑا تھا۔ کار پچھلے کچھ دنوں سے خراب تھی' اور حریرہ بڑی ادا سے سامنے کھڑی وین میں بیٹھ گئی پھر اس نے دیکھا وہ صارم کو بڑے عجیب سے انداز میں نظروں کے حصار میں لیے ہوئے ہے۔
"کیا بت بن گئی ہو؟ میرا بھائی ہے ہی اتنا

خوبصورت' میرا بھائی جو ہے چلو اب یا رکھنے کا ارادہ ہے؟" رجا اسے بازو سے پکڑے، گھسیٹتی ہوئی لے جا رہی تھی۔

"نظروں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔" اس نے سوچا۔

"مگر صارم کون سا متوجہ تھا۔" وہ خود کو تسلی دے کر مطمئن سی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کس نے بتایا؟" اس نے اک سرگوشی سنی۔

"مجھے تھرڈ ائیر کی مدیحہ نے اور تمہیں؟" اک اور آواز ابھری۔

"مجھے عائلہ نے۔" نقار خانے میں طوطی بولنے لگا۔

"تمہیں بھی پتا ہے؟" اشتیاق سے لبریز آواز اسے لگا جیسے ڈھول بج رہا ہے ڈھم ڈھم ہر آواز پر نئے سرے سے دھمک تیز ہو جاتی۔

"اچھا؟" ایک اور سرگوشی۔

وہ کلاس میں سب سے آخر میں بیٹھی تھی اس دھمک سے اس کا سر پھٹنے لگا رنگ برنگی سرگوشیوں سے اسے وحشت ہونے لگی۔ ماہین نے آگے بیٹھی درخشاں سے پوچھا ماجرا کیا ہے؟

"وہ ہے ناں حریرہ سلیم وہ کمپیوٹر کے نئے ٹیچر کے ساتھ...؟" درخشاں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ساتھ پھنسا کر کہا۔

ماہین شرم کے مارے سر جھکا گئی۔

"زیادہ بکواس نہ کیا کرو تم شیور ہو اس بارے میں؟" رجا بولی۔

"تو میں نے کیا کہا؟" درخشاں منہ بنا کر بولی۔

"ساری کلاس کو پتا ہے۔" درخشاں نے گویا ساری کلاس سے تائید چاہی' رجا دم سادھے سب کے ہلتے سروں کو دیکھنے لگی۔

آج پھر وہ لیٹ آئی۔ وہی شوخیاں' منہ میں ببل' ادائیں دکھاتی وہ کلاس میں داخل ہوئی۔ اگلی سیٹ پر وہ درخشاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ چند ساعتوں کے بعد کمپیوٹر کی کلاس شروع ہو گئی ٹیچر اندر آئے ساری کلاس بظاہر لیکچر نوٹ کر رہی تھی۔ سر جھکائے بیٹھی ماہین کے سر پہ کچھ لگا تو وہ چونکی اس کے سر پہ لگنے والا پرچہ اسے پڑھتے دیکھ کر "سر" سٹپٹائے۔ وہ خستہ کاغذ اس کے ہاتھ میں دیکھ کر پیلی پڑ گئی۔

"آج کا وعدہ تھا۔" محض چار لفظوں کی تحریر پڑھ کر ماہین کی حالت غیر ہونے لگی۔ ساری کلاس بمعہ رجا نوٹس میں گم تھیں پتا نہیں کیسے ان سب کا دھیان نوٹس کی طرف ہو گیا تھا۔ ماہین کاغذ حریرہ کو پکڑا کر پانی پینے کے بہانے اٹھ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں پتا ہے رجا وہ جو عائلہ ہے ناں اس کی کزن بھی تھرڈ ائیر میں ہے اس کے بھائی پہ بھی "اس" نے ڈورے ڈال رکھے ہیں؟" پتہ نہیں کیوں اب تمثیلہ ہر وقت یہ قصہ کھولے رکھتی تھی۔ خاص طور پر ان دونوں کے سامنے یا شاید اسے ان دونوں کی دلچسپی اس قصے میں محسوس ہوتی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔" رجا اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ ماہین نے اسے "اس" نوٹ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ پھر ان دونوں نے عجیب منظر دیکھا۔ عائلہ کا کزن بڑی گہری نظروں سے بے نیازی حریرہ کو گھور رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے یار بیوی کہاں ہو؟"

"ماہی ماہی او ماہی آ گیا تیرا راہی"

"تیرا پیا گھر آیا او ماہی جی تیرا پیار گھر آیا۔"

صارم اپنی مخصوص ترنگ میں گھر داخل ہوا۔ پھپھو آج اماں کے پاس گئی ہوئی تھیں۔

وہ خالص گھریلو حلیے میں کچن سے نکلی ہاتھ میں کفگیر پکڑے ہوئے۔ اس کی ڈھیلی چوٹی سے چند لٹیں نکل کر چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ صارم نے



والہانہ انداز میں تکے گیا۔

وہ جھینپ گئی۔ اس سے پہلے وہ کوئی جسارت کرتا۔

"شادی کو ایک سال ہو گیا ہے مسٹر صارم اور آپ کی یہ حرکتیں؟" رجا نے صارم کو جتایا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے جاؤ یہاں سے ڈسٹرب نہ کرو آج میری بیوی بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔" صارم نے آخر پہ پھر سے ٹریک بدلا۔

"او ہو یہ حسن یہ نزاکت" رجا اس کو چڑاتی کمرے کی طرف مڑ گئی۔

ماہین واپس کچن کو پلٹنے لگی تو صارم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

"تم بھی میرے بارے میں یقیناً" وہی سوچتی ہو گی جو تقریباً "سب لوگ یہاں سوچتے ہیں۔" اس نے بات شروع کی۔

"مگر" خلاف عادت ماہین نے بات میں مداخلت کی۔ "مگر تم مجھ سے بات کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"شاید تم ان سب سے الگ ہو یا مجھے لگتی ہو۔" وہ بولی۔

"میرا ماحول ایسا نہیں ہے جیسا عام گھرانوں کا ہوتا ہے۔" اس نے سلسلہ گفتگو وہیں سے جوڑا جہاں سے شروع کیا تھا۔

"میری ماں ایک ان پڑھ عورت جس نے ساری زندگی اپنے نشئی شوہر کی چاکری کرتے مار کھاتے خود کو تباہ کر ڈالا نہ وہ اپنی ہو سکی نہ اولاد کی۔" وہ ذرا رکی۔

"مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" ماہین نے پہلو بدلا۔

"مگر مجھے تمہیں بتانا ہی ہے۔ باپ جواری اور بھائی" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی جیسے خود کا ہی مذاق اڑا رہی ہو اس ہنسی میں اس کی آنکھیں لبوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھیں۔

"دو بھائی تھے ایک نے شادی کے بعد ہم سب کو

خرچہ دینا بند کر دیا۔ اس سے چھوٹا جسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر اماں اسے کالج جانے کے لیے فورس کرتی تھیں وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ پتا نہیں کہاں گیا اب وہ گھر نہیں آئے گا۔" وہ دور اسانس لینے کو رکی۔

"اور بہنیں" وہ گویا جوئے میں ہار آیا۔ ایک اس محاذ کے خلاف گھر سے بھاگ گئی۔ اس بچی پھپھو فیملی کو سپورٹ میں کرتے تھکی کیسے! یہ تم لوگوں سے ڈھکا چھپا تو نہیں۔

کمپیوٹر کے ٹیچر میرے وہی بھائی ہیں جو گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا مگر آئے نہیں وہ اس زنداں خانے میں واپس نہیں آنا چاہتے۔" اس نے گہری سانس لی گویا لمبی مسافت طے کر آئی ہو۔

"اور وہ گیٹ والا۔" ماہین نے اپنی اجنبی سی آواز سنی۔

"مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے آج کل اسی کو آزما رہی ہوں۔" ماہین کو ان دو آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔

"اچھا اللہ حافظ۔" وہ اٹھی جھٹکے سے بال سیدھے کیے فائل تھاما اور چل دی جہاں گیٹ پر "کوئی" اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ☼ ☼ ☼

اس کے بعد حریہ ماہین سے کبھی نہیں ملی۔ کچھ ہفتوں بعد سب نے سنا اس کی شادی ہو گئی۔

"مگر عائلہ کا کزن تو نہیں پھر کون؟" اس سوال نے سب کے تجسس کے اشتیاق کو جگا ڈالا۔

"اس کے باپ نے اس کو چار بچوں کے باپ کے ساتھ بیاہ دیا۔" کوئی خبر تھی یا بم ساری کلاس سکتے میں آ گئی اور ماہین بے ہوش ہوتے ہوتے بچی یعنی اس کے باپ نے تیسری بیٹی کو بھی...... ! وہ اس سے آگے سوچ نہ سکی۔ ☼ ☼ ☼

اس نے ماسٹرز کا ایک سال چھوڑ دیا وہ پڑھ نہ سکی کتابیں کھولتی تو مغرور سی سر اٹھا کر چلتی حریہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی۔

اس نے کسی کو کچھ بھی نہ بتایا رجا کو بھی نہیں۔ ماہین خود سے شرمندہ تھی کیا سوچتی ہو گی وہ ہماری ذہنیت کے بارے میں! وہ خود سے سوال کرتی تھک جاتی پھر تعلیم چھوڑنے کے بعد اس نے شادی کا عندیہ ماں کو دے دیا اور یوں دو ماہ بعد وہ صارم کے سنگ چلی آئی وہ اکثر اک چپ میں گھری رہتی۔ صارم اس پر بے پناہ توجہ دیتا اس کو خوش رہنے کی تلقین کرتا وہ خود اپنی کیفیت سے مجبور تھی۔

"کیا اکثر ناپختہ ذہن والدین کے غلط فیصلے اور رویوں سے دل برداشتہ ہو کر غیروں میں سکون تلاش کرتا ہے۔ بے سہاروں کی تلاش میں کوئی کتنا آگے جا سکتا ہے؟ اگر ایسا تھا تو حریہ کیوں مر گئی وہ تو اپنوں کو جوڑے رکھنے کی خواہش میں خود تختہ مشق بنی رہی۔"

اکثر بے خیالی میں آنسوؤں کی لکیر اس کی گالوں پہ لڑھک جاتی۔

ماہین اکثر اس کیفیت میں ہوتی تو سوچتی کہ وہ اسے ہی خاص طور پر مطلع کر کے گئی کیوں؟

اس لیے وہ ثابت قدم رہے؟

یا آئندہ نسل کی بہتر بنیاد رکھے؟

یا وجہ کچھ اور تھی؟

اس کا جواب بھی ماہین کو چند دنوں بعد مل گیا۔

صارم کی الماری صاف کرتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹکی تھی سارا کاغذ دھندلا سا تھا یا اس کی آنکھوں کے آگے دھند کی دبیز دیوار تھی جو کاغذ کو دھندلا کر رہی تھی بس آخری سطر پہ نظریں جامد ہو گئیں۔

"حریہ"

سب سوالوں کے جوابات مل گئے تھے۔

اسے ہی خاص طور پر وہ کیوں بتا گئی تھی۔

"گیٹ والا۔"

"محبت کا دعوے دار ہے۔"

"آزما رہی ہوں۔"

آوازیں گڈمڈ ہو کر اس کے اطراف میں چکرا رہی تھیں اور وہ تھی ڈھال اپنے ٹوٹے انا و وجود کی کرچیاں سمیٹنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ ☼ ☼ ☼



سنبل

# سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا

تنگ محسوس ہوا تو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
فراق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

"ارسل بیٹا! تو یہ سب کیوں کر رہا ہے میں نے اور تیرے بابا نے تجھے جو قناعت کا سبق دیا تھا وہ کیوں بھول گیا تو؟" اماں کے بیٹے آج بڑے عرصے بعد ارسلان احمد لگے تھے سو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی ورنہ ارسلان احمد ان کی بیوی اور بچوں کی مصروفیات اور دلچسپیوں میں اماں کا گزر کہیں نہیں تھا وہ کھڑے کھڑے بھی ان کی خیریت معلوم کرنے کے روادار نہیں تھے اپنے شوہر فرقان احمد کی موت کے بعد سے وہ اس گھر میں کسی عضوئے معطل کی طرح سے تھیں جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ارسلان احمد اماں کا اشارہ سمجھ چکے تھے۔

"اوہو! اماں آپ کو کیا پتا ضروریات زندگی کی قیمتیں کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہیں۔ اشیائے صرف کا حصول کتنا مشکل ہو گیا ہے بیوی بچوں کی ضروریات۔ بچوں کی تعلیم کس قدر مہنگی ہو گئی ہے۔ اس سب کو مینیج کرنے کے لیے سب کرنا پڑتا ہے سب جائز ہے۔ آپ کو کیا پتا مہنگائی آج کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے آپ تو یہاں ایک کونے میں سکون سے ہیں آپ کو کیا خبر زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔" ارسلان احمد نے تنگ کر کہا اور اماں یہ بھی نہ پوچھ سکیں کہ مجھے کونے میں ڈالنے والا کون ہے۔ وہ جانتی تھیں الفاظ ضرور ارسلان احمد کے ہیں مگر ان کے منہ میں زبان سونیا ارسلان کی ہے ورنہ ارسلان احمد تو ان اولادوں میں سے تھے جنہوں نے ماں باپ کو کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ کسی بات سے اختلاف نہیں کیا اور اب ان کے لہجے میں واضح گستاخی نظر آنے لگی تھی۔

"زندگی پہلے بھی آسان نہیں تھی۔ مگر پہلے تیرے پاس قناعت کی دولت تھی۔ اب تیرے پاس دنیاوی دولت تو ہے مگر قناعت کی دولت نہیں ہے اور تجھے پتا ہے تو کیا کما رہا ہے اپنے لیے جہنم کی آگ اور اپنے پیچھے والوں کے لیے مال۔" اماں نے اپنا ماں ہونے کا فرض نبھایا حالانکہ ارسلان احمد کے لہجے نے انہیں بہت ہرٹ کیا تھا۔

"اوہو اماں آپ کے پاس آؤ تو آپ کے واعظ شروع ہو جاتے ہیں سونیا صحیح کہتی ہے کہ۔۔۔" باقی کے الفاظ ارسلان احمد نے منہ میں روک لیے۔

"رک کیوں گئے بیٹا! کہہ دو کہ اکیلے رہتے رہتے میں سنکی اور پاگل ہوتی جا رہی ہوں جو بات ہو بیاآواز بلند کہتی ہے وہ تم دل میں کیوں رکھو۔" اماں کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"اماں! آپ نے تو کبھی اسے دل سے قبول کیا ہی نہیں حالانکہ وہ آپ کی کتنی خدمت کرتی ہے مگر آپ کی زبان سے اس کے لیے میں نے کبھی تعریف کا لفظ سنا ہی نہیں۔" ارسلان احمد نے خاصی بدمزگی سے کہا۔

"ہاں بیٹا! میں ہوں ہی ناگن' تمہاری بیوی جیسے ہیرے کی قدر ہی نہ کر سکی۔" اماں نے کہہ کر سر جھکا لیا۔ اب وہ ارسلان احمد جیسے بیٹے کو کیا بتاتیں کہ اس خدمت گزار بہو کی شکل دیکھے انہیں چھ چھ مہینے ہو جاتے ہیں کھانا بھی اگر ان کی پرانی خدمت گزار نذیراں نہ ہوتی تو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ کہہ دیا کرتیں جب تک زندگی تھی گزار رہا تو کئی بار سوچتی تھیں کہ اب کچھ نہیں بولیں گی بیٹے وہ جب بیٹا جو شکل دکھاتا ہے تو کوئی شکوہ شکایت نہیں کریں گی مگر بیٹے کو جہنم کی آگ میں گرتا دیکھ کر رہ نہ پاتی تھیں اور ٹوک دیتیں اور ارسلان احمد ہمیشہ غصے میں ان کے پاس سے اٹھتا اور پھر ہفتوں ڈیڑھ مہینے تک ان کے پاس نہ آتا اور وہ بے کسی سے انتظار کرتی رہ جاتیں۔

٭ ٭ ٭

ارسلان احمد کے والد فرقان احمد کا ایک فلور مل تھا۔ جس میں وہ بہترین قسم کا گندم پسوا کر اس کا آٹا بنواتے تھے انہوں نے ہمیشہ ایمانداری کو ترجیح دی تھی۔ وہ معیار پر کبھی سمجھوتہ نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے مل میں کام کرنے والے ورکرز کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے انہوں نے اپنے معمولی سے معمولی ورکرز کو بھی بڑی مراعات دے رکھی تھیں اور وہ سب آسودہ تھے اور آرام دہ اور پرسکون ماحول میں کام کرتے تھے وہ سب فرقان احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ مل کے علاوہ بھی گھر میں بھی ان کا اور ان کی بیگم خدیجہ کا دستور تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صدقہ اور خیرات دیا کرتے تھے۔ ان کے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں گیا یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر میں آسودگی تھی۔ مگر وہ لوگ حد سے زیادہ روپے پیسے کی ریل پیل کے قائل نہیں تھے اس لیے جمع کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ سو ان کی اکلوتی مل اکلوتی ہی رہی۔ ارسلان احمد کو انہوں نے ہمیشہ حلال کھلایا وہ ان کے بڑے فرمانبردار اور مطیع بیٹے تھے۔ ان کی دو ہی اولادیں تھیں ارسلان احمد اور ارسلہ فرقان۔ ارسلہ کی شادی انہوں نے اس کی گریجویشن کے بعد اپنے ایک دوست کے بیٹے سے کر دی تھی جو آج کل شارجہ میں مقیم تھی۔ کبھی اس کا فون آ جاتا تھا تو اماں کی آنکھیں تھیں نواسوں اور نواسی سے بھی بات ہوتی تھی۔ وہ بھی نانی سے بے پناہ محبت کرتے تھے ورنہ پوتا پوتی تو کبھی ان کے کمرے میں جھانکتے بھی نہیں تھے۔

فرقان احمد کی وفات کے بعد کافی عرصے تک معاملات اسی طرح چلتے رہے اسی دوران انہوں نے ارسلان کی پسند سے اس کی شادی سونیا سے کر دی۔ سونیا کی فیملی حیثیت میں ان سے بہت بلند تھی اور خدیجہ بیگم کی مرضی نہیں تھی مگر انہوں نے بیٹے کی پسند کو ترجیح دی۔

سونیا کی فیملی پیسے کمانے کا ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرنے کو جائز سمجھتی تھی۔ ان کی کئی فیکٹریز اور کئی ملز تھے۔ سونیا خود بے انتہا لالچی' نخریلی اور تنگ مزاج تھی اور یہیں سے ارسلان احمد کے منہ کو پیسہ لگ گیا۔ ارسلان احمد کے سالوں اور سسر نے اسے بھی اپنی راہ پہ لگا لیا۔ جائز و ناجائز طریقے سے دولت کا حصول ان کا مطمع نظر بن گیا رشوت' چور بازاری' اشیاء کی مصنوعی بحران قیمتوں میں اضافہ بس ان کی زندگی کا یہی مقصد رہ گیا۔ جلد ہی ان کے ایک مل کی جگہ تین ملز اور دو فیکٹریوں کا اضافہ ہو گیا اور جوں ہی حرام پیٹ میں اترا ارسلان احمد کی آنکھوں پر چربی چڑھ گئی سال کی عزت واحترام وہ سب بھول گئے۔ عموماً" اماں سے ملتے ہی نہیں تھے انہیں ایک کمرے تک محدود کر دیا تھا اور اگر ملتے بھی تھے تو تنخ کلامی کر کے ہی اٹھتے تھے۔ وہ مستقل دو اور دو چار میں لگے ہوئے تھے اور آج کل تو آٹے کے بحران نے ان کی چاندی کی ہوئی تھی اپنے ملک کی بہترین سنہری مائل گندم باہر اسمگل کر کے باہر سے غیر معیاری سیاہی مائل گندم منگوا کر پسوا کر آٹا بنایا جا رہا تھا اور ________ دس کلو کی بوری جو کہ آرام سے ڈیڑھ سو کی مل جاتی تھی ڈھائی سو میں بک رہی تھی اور غریب پیٹ پر پتھر باندھ رہا تھا اور سرمایہ دار اپنے تجوریاں بھر رہا تھا اور اسی بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے والوں میں ارسلان احمد بھی شامل تھے۔ اماں کو ابھی اس معاملے کا معلوم نہیں تھا کیونکہ ٹی وی وہ دیکھتی نہیں تھیں اور اخبار کی ان تک دسترس نہیں تھی۔

٭ ٭ ٭

اس دن نذیراں آئی تو کافی افسردہ لگ رہی تھی۔ کھانے کی ٹرے اماں کے سامنے رکھ کر خاموش ہو کر بیٹھ گئی اماں نے اسے یوں بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے نذیراں! کوئی پریشانی ہے کیا؟" انہوں نے اس کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہونا کیا ہے وہی ایک بات ہے بی بی! جس نے سارے ملک کو پریشان کر رکھا ہے۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اللہ خیر کرے ایسی کون سی بات ہو گئی جس سے پورا ملک پریشان ہے۔" اماں نے دل تھام لیا۔

"آپ کو نہیں پتا بی بی! پورے ملک میں آٹے کا بحران ہے بڑی مشکلوں سے ڈیڑھ سو والی بوری تین سو میں مل رہی ہے اور چاول ہے تو روز بروز اس کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں خراب سے خراب چاول کی قیمتیں بھی

اچھے والے چاولوں کے برابر آ گئی ہیں اور اچھے چاولوں کا تو کیا ہی کہنا۔ ہفتہ بھر سے گھر میں نہ آٹا ہے نہ چاول یا تو میاں سے بچا کھچا مل جاتا ہے یا آلو ابال کر بچوں اور میاں کے پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑتا ہے۔" نذیراں نم آنکھوں سے بولتی چلی گئی۔

"آٹے کا بحران۔ مگر کل ہی میں نے کھڑکی سے ایک من آٹے والی بوری آتی دیکھی ہے چلو میں دلواتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نا! بی بی جی میرے کول اپنی بات مت خراب کرو چھوٹی بی بی کو میں کئی واری بول چکی ہوں انہیں دینا ہوتا تو دے دیتیں۔" نذیراں نے انہیں روکنا چاہا مگر وہ رکی نہیں۔

"یہاں کتنے جی ہیں کھانے والے من بھر آٹے میں کیڑا ہی پڑتا ہے اچھا ہے کسی کے منہ پڑ جائے۔" انہوں نے کہا اور باہر نکل آئیں سامنے سے سونیا آتی دکھائی دیں اور ان کا منہ بن گیا۔

"اماں! آپ کو کتنی بار منع کیا ہے کہ کمرے سے باہر مت نکلا کریں۔ آپ کو ہر چیز جب کمرے میں مل جاتی ہے تو باہر آنے کی کیا ضرورت ہے آپ کے بڑھاپے کا تاثر ہے سو بیماریاں جان سے چمٹی ہوتی ہیں میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"بہو! تمہیں تو پتا ہے میں خود باہر آنا نہیں پسند کرتی مگر یہ نذیراں کے گھر میں کئی دنوں سے آٹے کا مسئلہ ہے اسے کچھ آٹا اور چاول دے دو۔" انہوں نے انسانیت سے کہا۔

"کیوں ہم نے کوئی خیراتی ادارہ کھولا ہوا ہے کیا نذیراں کو تنخواہ نہیں ملتی جو فضول میں اسے اٹھا کر دے دوں آٹا اور چاول۔" سونیا نے دو دھاری ہو کر کہا۔

"بیٹا! دے دو دینے سے زیادہ ملتا ہے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

"پتا نہیں کن لوگوں کو دینے سے زیادہ ملتا ہے میرا میاں تو کما کما کر ختم ہو گیا مگر لوگوں کو ہوس ۔۔۔ سے ہی فرصت نہیں۔" سونیا کو پتا نہیں کیوں آگ لگی ہوئی تھی۔

"اللہ کا خوف کرو سونیا! ہم لاکھوں کروڑوں سے بہتر ہیں اسی ملک بلکہ اسی شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کئی کئی وقت فاقے سے رہتے ہیں اور تب بھی ان کی زبان پر اللہ کا شکر ہی ہوتا ہے۔" اماں نے دکھ سے کہا کہ کبھی ان کے گھر سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اور آج وہ گھر کی ملازمہ کو تھوڑا سا آٹا دینے سے قاصر تھیں۔

"ہاں آپ کی نظریں ہی تو کھا گئیں ہمیں اور نذیراں تو تو صاحب کو آنے دے بہت مظلومیت کے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر ہمدردیاں بٹورتی پھرتی ہے تیرا تو حساب کرواتی ہوں۔" سونیا پاؤں پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی اور اماں نے بے بسی سے نذیراں کو دیکھا۔

"بی بی جی! آپ دکھی مت ہو رب ہمارا ابھی ہے کہیں نہ کہیں ہمارا رزق بھی لکھا ہو گا۔" نذیراں نے اماں کو دیکھ کر کہا اور اماں ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں کہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔

شام میں ارسلان احمد آئے تو ایک نیا [illegible] تھا آخر کو اماں نے ارسلان احمد کی عزیز از جان بیوی سے بدتمیزی کی تھی۔ یہ بہت بڑا احسان کیا کہ نذیراں کو نہیں نکالا۔

"اماں آپ کیوں خواہ مخواہ گھر کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں سونیا جانتی ہے گھر کس طرح چلانا ہے خدا کے لیے گھر کو اپنی راجدھانی سمجھنا چھوڑ دیں ہمیں سکون سے جینے دیں۔ سونیا نے قائم کیا خود ساختہ علو ختم کر دیں۔" ارسلان احمد نے بدتمیزی کی انتہا کر دی اور اماں پھٹی پھٹی نظروں سے ارسلان احمد کو دیکھتی رہ گئیں اور اس رات کی اماں کی زندگی میں صبح نہیں ہوئی اور انہوں نے زمین اوڑھ لی نذیراں کو سب سے زیادہ دکھ تھا۔ ارسلان احمد اور سونیا کو دنیا دکھاوے کو دکھ تھا تیسرے دن وہ بھی ختم ہوا اور نذیراں اماں کے بعد وہاں رکی نہیں اور اس نے وہاں سے کام چھوڑ دیا۔



☆ ☆ ☆

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اور اسی طرح سے اماں کے انتقال کو دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ نہ پہلے کبھی کچھ فرق پڑا تھا نہ اب۔ مہنگائی اب بھی روز افزوں بڑھ رہی تھی۔ امیر امیر تر اور غریب غریب ہوتا جا رہا تھا اور آج کل تو نیا ہی ہو رہا تھا۔ جس چیز کے دام بڑھانے ہوتے تھے اس کا مصنوعی بحران پیدا کر دیا جاتا تھا۔ لوگ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق منہ مانگی قیمتوں پر اشیاء صرف خریدتے اور بعد میں وہی منہ مانگی قیمت ان چیزوں کی مقرر ہو جاتی تھی۔ تجوریاں بھرتی جا رہی تھیں اور جھونپڑیوں کے تنکے بکھر رہے تھے لوگ فاقے کرنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے غریبوں نے پیٹوں پر پتھر باندھ لیے تھے مگر سرمایہ داروں کی تجوری کی بھوک بھرتی ہی نہ تھی۔

ان ہی دنوں ایک دن دونوں بچوں کو اپنے کسی فرینڈ کی سالگرہ میں جانا تھا۔ بچوں کو وہاں ڈراپ کر کے وہ دونوں واپس آ رہے تھے کہ ایک بے قابو ٹرالر نے ان کی گاڑی کو کچل ڈالا ارسلان احمد کے دماغ پر شدید چوٹ آئی اور وہ کومے میں چلا گیا سونیا کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور وہ بیڈ پر آ گئی۔ ارسلان احمد ڈیڑھ مہینہ کومے میں رہ کر انتقال کر گیا اور اپاہج سونیا بیڈ کی ہو کر رہ گئی۔ اس کے میکے والے جو جائز اور ناجائز کے چکر میں پڑے بغیر دولت جمع کرنے کے قائل تھے وہ ارسلان احمد کے تمام کاروبار پر قابض ہو گئے۔ بچے اور سونیا اپنی ہی جائیداد ہونے کے باوجود آج اپنے ہی میکے میں ایسے رہتے ہیں جیسے کسی کا احسان لے رہے ہوں جیسے وہاں کے ملازمین یا بھکاری ہوں۔

اور آج اس کے بچے معمولی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی کوئی عزت نہیں ہے ذلت پھٹکار ان کا نصیب ہے اور اعتماد سے قطعی عاری بچے ہیں سونیا کا یوں تو کوئی علاج ہوتا ہی نہیں ہے اگر کبھی کچھ کر دیا جائے تو سو احسان جتا کر اور آج سونیا سوچتی ہے کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے ارسلان احمد کو حلال سے حرام کمانے پر لگایا کہ وہ راج کرے گی۔ مگر راج تو کیا کرنا تھا۔ ارسلان احمد اپنے حصے کی دوزخ تک جا رہا ہو گا اور وہ اور اس کے بچے بھکاریوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔

مگر اب اس کے سامنے ایک بڑا سا کاش تھا۔ پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بچے جنہیں دنیا تسخیر کرنی تھی وہ کسی کے سامنے بولنے میں بھی ہکلاتے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا اب تو سب ٹھاٹھ پڑا رہ گیا تھا کیونکہ بنجارہ لاد چلا تھا۔

اچھے والے چاولوں کے برابر آگئی ہیں اور اچھے چاولوں کا تو کیا ہی کہنا۔ ہفتہ بھر سے گھر میں نہ آٹا ہے نہ چاول یا تو یہاں سے بچا کھچا مل جاتا ہے یا آلو ابال کر بچوں اور میاں کے پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑتا ہے۔" نذیراں نم آنکھوں سے بولتی چلی گئی۔

"آٹے کا بحران۔ مگر کل ہی میں نے کھڑکی سے ایک من آٹے والی بوری آتی دیکھی ہے چلو میں دلواتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"نا! بی بی جی میرے کول اپنی بات مت خراب کرو چھوٹی بی بی کو میں کئی واری بول چکی ہوں انہیں دینا ہوتا تو دے دیتیں۔" نذیراں نے انہیں روکنا چاہا مگر وہ رکی نہیں۔

"یہاں کتنے جی ہیں کھانے والے من بھر آٹے میں کیڑا ہی پڑتا ہے اچھا ہے کسی کے منہ پڑ جائے۔" انہوں نے کہا اور باہر نکل آئیں سامنے سے سونیا آتی دکھائی دیں اور ان کا منہ بن گیا۔

"اماں! آپ کو کتنی بار منع کیا ہے کہ کمرے سے باہر مت نکلا کریں۔ آپ کو ہر چیز جب کمرے میں مل جاتی ہے تو باہر آنے کی کیا ضرورت ہے آپ کے بڑھاپے کا ٹائم ہے سو بیماریاں جان سے چمٹی ہوتی ہیں میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"بہو! تمہیں تو پتا ہے میں خود باہر آنا نہیں پسند کرتی مگر یہ نذیراں کے گھر میں کئی دنوں سے آٹے کا مسئلہ ہے اسے کچھ آٹا اور چاول دے دو۔" انہوں نے انسانیت سے کہا۔

"کیوں ہم نے کوئی خیراتی ادارہ کھولا ہوا ہے کیا نذیراں کو تنخواہ نہیں ملتی جو فضول میں اسے اٹھا کر دے دوں آٹا اور چاول۔" سونیا نے دو دھاری ہو کر کہا۔

"بٹیا! دے دو دینے سے زیادہ ملتا ہے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

"پتا نہیں کن لوگوں کو دینے سے زیادہ ملتا ہے میرا میاں تو کما کما کر ختم ہو گیا مگر لوگوں کو ہوس [illegible] فرصت نہیں۔" سونیا کو پتا نہیں کیوں آگ لگی ہوئی تھی۔

"اللہ کا خوف کرو سونیا! ہم لاکھوں کروڑوں سے بہتر ہیں اسی ملک بلکہ اسی شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کئی کئی وقت فاقے سے رہتے ہیں اور تب بھی ان کی زبان پر اللہ کا شکر ہی ہوتا ہے۔" اماں نے دکھ سے کہا کہ کبھی ان کے گھر سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا اور آج وہ گھر کی ملازمہ کو تھوڑا سا آٹا دینے سے قاصر تھیں۔

"ہاں آپ کی نظریں ہی تو کھا گئیں ہمیں اور نذیراں تو تو صاحب کو آنے دے، بہت مظلومیت کے ڈھنڈورے پیٹ پیٹ کر ہمدردیاں بٹورتی پھرتی ہے تیرا تو حساب کرواتی ہوں۔" سونیا پاؤں پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی اور اماں نے بے بسی سے نذیراں کو دیکھا۔

"بی بی جی! آپ دکھی مت ہو رب ہمارا ابھی ہے کہیں نہ کہیں ہمارا رزق بھی لکھا ہوگا۔" نذیراں نے اماں کو دیکھ کر کہا اور اماں ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں کہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔

شام میں ارسلان احمد آئے تو ایک نیا فیصلہ تھا آخر کو اماں نے ارسلان احمد کی عزیز از جان بیوی سے بدتمیزی کی تھی۔ یہ بہت بڑا احسان کیا کہ نذیراں کو نہیں نکالا۔

"اماں آپ کیوں خوامخواہ گھر کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں سونیا جانتی ہے گھر کس طرح چلانا ہے خدا کے لیے گھر کو اپنی راجدھانی سمجھنا چھوڑ دیں ہمیں سکون سے جینے دیں۔ سونیا سے قائم کیا خود ساختہ عتاب ختم کر دیں۔" ارسلان احمد نے بدتمیزی کی انتہا کر دی اور اماں پھٹی پھٹی نظروں سے ارسلان احمد کو دیکھتی رہ گئیں اور اس رات کی اماں کی زندگی میں صبح نہیں ہوئی اور انہوں نے زمین اوڑھ لی نذیراں کو سب سے زیادہ دکھ تھا۔ ارسلان احمد اور سونیا کو دنیا دکھاوے کو دکھ تھا تیسرے دن وہ بھی ختم ہوا اور نذیراں اماں کے بعد وہاں رکی نہیں اور اس نے وہاں سے کام چھوڑ دیا۔



☆ ☆ ☆

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اور اسی طرح سے اماں کے انتقال کو دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ نہ پہلے کبھی کچھ فرق پڑا تھا نہ اب۔ مہنگائی اب بھی روز افزوں بڑھ رہی تھی۔ امیر امیر تر اور غریب غریب ہوتا جا رہا تھا اور آج کل تو یہی ہو رہا تھا۔ جس چیز کے دام بڑھانے ہوتے تھے۔ اس کا مصنوعی بحران پیدا کر دیا جاتا تھا۔ لوگ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق منہ مانگی قیمتوں پر اشیاء صرف خریدتے اور بعد میں وہی منہ مانگی قیمت ان چیزوں کی مقرر ہو جاتی تھی۔ تجوریاں بھرتی جا رہی تھیں اور جھونپڑیوں کے تنکے بکھر رہے تھے لوگ فاقے کرنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے غریبوں نے پیٹوں پر پتھر باندھ لیے تھے۔ مگر سرمایہ داری تجوری کی بھوک بھرتی ہی نہ تھی۔

ان ہی دنوں ایک دن وہ دونوں بچوں کو لے کر کسی فرینڈ کی سالگرہ میں جا رہا تھا۔ بچوں کو وہاں ڈراپ کر کے وہ دونوں واپس آ رہے تھے کہ ایک بے قابو ٹرالر نے ان کی گاڑی کو کچل ڈالا ارسلان احمد کے دماغ پر بند چوٹ آئی اور وہ کومے میں چلا گیا سونیا کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور وہ بیڈ پر آگئی۔ ارسلان احمد ڈیڑھ مہینہ کومے میں رہ کر انتقال کر گیا اور اپاہج سونیا بیڈ کی ہو کر رہ گئی۔ اس کے میکے والے جو جائز اور ناجائز کے چکر میں پڑے بغیر دولت جمع کرنے کے قائل تھے وہ ارسلان احمد کے تمام کاروبار پر قابض ہو گئے۔ بچے اور سونیا اپنی ہی جائیداد ہونے کے باوجود آج اپنے ہی میکے میں ایسے رہتے ہیں جیسے کسی کا احسان لے رہے ہوں جیسے وہاں کے ملازمین یا بھکاری ہوں۔

اور آج اس کے بچے معمولی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی کوئی عزت نہیں ہے ڈانٹ پھٹکار ان کا نصیب ہے اور اعتماد سے قطعی عاری بچے ہیں سونیا کا یوں تو کوئی علاج ہوتا ہی نہیں ہے اگر کبھی کچھ کر دیا جائے تو سو احسان جتا کر اور آج سونیا سوچتی ہے کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے ارسلان احمد کو حلال سے حرام کمانے پر لگایا کہ وہ راج کرے گی۔ مگر راج تو کوئی کرتا تھا۔ ارسلان احمد اپنے حصے کی دوزخ میں [illegible] رہا ہوگا اور وہ اور اس کے بچے بھکاریوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔

مگر اب اس کے سامنے ایک بڑا سا کاش تھا۔ پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بچے جنہیں دنیا تسخیر کرنی تھی وہ کسی کے سامنے بولنے میں بھی ہکلاتے تھے مگر اب کیا ہو سکتا تھا اب تو سب ٹھاٹھ پڑا رہ گیا تھا کیونکہ بنجارہ لاد چلا تھا۔

تھیں وہاں ان کی بہن سخت علیل تھیں۔ ویسے تو راس ماسی کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ملتان گئی ہیں تاکہ میری اور نصیر احمد کی انڈر اسٹینڈنگ جلد ہو سکے۔

"کیا ان کے ساتھ کوئی اور بھی آ رہا ہے؟" میں نے ناشتے کے خالی برتن اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے ساتھ بھلا اور کون آئے گا۔ ماسی تو خود بیمار ہیں۔" نصیر احمد اپنی خالہ کو ماسی کہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کھانا بناؤں گی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔" میں نے مسکرا کر نصیر احمد کی تسلی کرائی۔ تب وہ مجھے اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اور میں کچن میں آ کر نسیم باجی کو کام سمجھانے لگی۔ نسیم باجی یہاں کام کرنے والی عورت تھی۔ کوئی پینتالیس سے پچاس برس کے درمیان کی دبلی پتلی عورت۔ جو واقعی اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں باہر صحن میں موجود چھوٹے سے باغیچے میں آ گئی۔ موتیا کے سفید سفید کھلے ہوئے پھول پورے باغیچے میں خوب چھپ دکھا رہے تھے اور ان کی خوشبو زبردستی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک تو ابھی صبح ہی تھی کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا دوسرا آج آسمان بھی ابر آلود تھا۔ اس لیے موسم تقریباً" سہانا ہی تھا۔ میں نے چپل اتار دی۔ اور نرم نرم گھاس پر کچھ دیر چہل قدمی کرتی رہی پھر موتیا کے پھول چننے لگی۔ میں نے اپنے دوپٹے میں ڈھیر سارے موتیا کے پھول بھر لیے تھے۔ اور انہیں نرمی سے تھامے ہوئے واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر میں نے وہ سارے پھول اپنے تکیے کے ساتھ رکھ دیے اور یونہی انہیں چھونے لگی۔

"موتیا کے پھول۔ اور میں؟"

"موتیا کے پھول اور وجیہہ۔"

"پھول اور خوشبو۔ میں اور وجیہہ۔" میرے اندر بہت سی سرسراہٹیں ہونے لگیں۔

"پتا نہیں وجیہہ کیسا ہو گا؟" یہ خیال آتے ہی میرا دل اتنا اداس ہوا کہ میں نے اس کا موبائل نمبر ڈائل کر لیا۔

تیسری بیل پر وجیہہ کا فون اٹینڈ ہو گیا۔ مگر آگے وجیہہ کی جگہ فضل تھا۔

"کیسی ہو دلنشین بہن؟" وہ بڑے ہی پیار سے پوچھ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" میں نے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں پوچھا۔

"شکر ہے میرے رب کا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ پھر خود ہی بتانے لگا۔

"لاڈی سائیں تو آج کل مدینے میں ہیں۔ اور وہاں فون تو وہ لے کر نہیں گئے۔" فضل جانتا تھا کہ میں پوچھوں گی کہ وجیہہ کہاں ہے؟

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

"وجیہہ وہاں پر ہے۔ مدینے میں؟" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ریڑھ کی ہڈی تک سنسناہٹ ہونے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر بہت سی آوازیں ہوں اور سب کی سب سے ایک ہی صدا آتی ہو۔

(اے اللہ! میں حاضر ہوں) میں اٹھی اور وضو کرنے چل دی۔

☼ ☼ ☼

خالہ جان آئیں تو بے حد خوش تھیں۔ میرے لیے ملتان سے بہت سے تحائف لائی تھیں۔

"عصمہ! یہ ملتانی سوہن حلوہ بہت مزے دار ہے۔ یہ خاص تمہارے لیے ہے۔ سنبھال کر رکھ لینا۔ مجھے پتا ہے تمہیں بچپن سے حلوہ بہت پسند ہے۔ اور۔ اور یہ دیکھو! ملتانی کھسے۔ یہ چپل۔ اور یہ کڑھائی والا سوٹ۔" وہ ایک ایک چیز مجھے دکھا رہی تھیں اور بچوں کی طرح سے خوش ہو رہی تھیں۔

"جی بہت اچھی ہیں تمام چیزیں۔" مجھے واقعی ساری چیزیں بہت پسند آئی تھیں۔ میں نے انہیں اٹھا کر اپنی الماری میں رکھ دیا۔

"اچھا بھئی تم دونوں ساس بہو اب کرو باتیں میں واپس آفس پہنچوں۔" نصیر احمد نے کھانا کھاتے ہی اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ واپس آفس چلا گیا۔ اور خالہ جان آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ کتنی عام اور روز مرہ کی مصروفیات والی زندگی ہو گئی تھی۔ میں لیٹ کر سوچنے لگی۔

نصیر احمد سے میرے نکاح کو کوئی پندرہ روز ہونے کو تھے اور میں نے معمولات زندگی کی اس ڈگر کو نکاح کے تیسرے روز سے ہی اپنا لیا تھا۔ اس شادی شدہ زندگی میں کہیں کوئی نیا پن نہ تھا۔ میں تو خیر نویلی دلہن نہ تھی۔ مگر نصیر احمد؟ وہ بھی تو بالکل نارمل تھا۔ اگرچہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ مگر اس کے جذبات میں کوئی طغیانی نہ تھی۔ وہ بالکل ٹھہرے ہوئے پانیوں جیسا شفاف اور بے شکن تھا۔ اس کے اندر جو کچھ بھی تھا صاف دکھائی دیتا تھا۔

"نصیر احمد۔ کیسا تھا۔؟" میں جان بوجھ کے اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

سانولی سلونی سی رنگت پر بالکل عام سے نقوش۔ البتہ اس کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا۔ جھکی جھکی سی نظریں اور گمبھیر لہجہ۔ اس کے انداز سے اس کی بہترین تعلیم اور تربیت جھلکتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر۔ وہ بے حد ہمدرد اور غمگسار تھا۔ کیونکہ شروع کے پانچ چھ روز میں اس نے میری بہت دلجوئی کی تھی۔ وہ بہت اچھا دوست تھا۔

"دوست!" میرے احساس نے میرے دل پر ایک چٹکی بھری۔ اور میں قدرے شرمندہ ہو گئی۔

"عصمہ بی بی! وہ تمہارا شوہر اور تم اس کی منکوحہ؟ پھر بھی تم دونوں کے بیچ ازدواجی تعلقات مفقود ہیں؟

کیا تمہارے اندر کا چور ابھی بے دار بیٹھا ہے۔ اور اس شریف النفس کی زندگی سے خوشیاں چرا کر اپنی بیاہ آرام گاہ کو دوبارہ سجانا چاہتا ہے؟" میری سوچوں کے منہ نوکیلے ہو کر مجھے کھرچنے لگے۔ میرے پاس ان باتوں کے کوئی جواب نہ تھے۔ میں نے اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی۔ نجمہ شاہین کی شاعری کی کتاب "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں" اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

ہجر میں بھی یہ مری سانس اگر باقی ہے
اس کا مطلب ہے محبت میں اثر باقی ہے

میں ایک غزل کے اشعار پڑھنے لگی۔ نجمہ شاہین کو میں نے پہلے نہیں پڑھا تھا۔ یہ شعری مجموعہ نصیر احمد میرے لیے خرید کر لایا تھا۔ نصیر احمد کا ذوق ادب بہت اعلا تھا۔ اس کے پاس پوری ایک لائبریری موجود تھی۔ اور ابھی پرسوں شام ہی اس نے مجھے کچھ کتابیں لا کر تحفہ کی تھیں۔ ان میں یہ مجموعہ بھی تھا جسے میں نے ابھی کھولا تھا۔ مجھے یہ غزل اپنے ہی حسب حال لگی۔ مجھے لگا میں ان اشعار کو پڑھنے کی بجائے لکھ رہی ہوں۔

چھوڑ یہ بات ملے زخم کہاں سے تجھ کو
زندگی اتنا بتا کتنا سفر باقی ہے
ہجر کی آگ میں جلنے سے نہیں ڈرتی میں
عشق مجھ میں ابھی بے خوف و خطر باقی ہے

سانس لینا تو شاہین نہیں ہے جیون
ڈھونڈ کر لاؤ میری روح اگر باقی ہے

غزل پڑھتے پڑھتے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا اور میرے وجود کی وہ ساری کرچیاں پھر سے بکھر گئیں جنہیں چنتے چنتے میرے احساس کی انگلیاں لہولہان ہو گئی تھیں۔ اور میرا مردہ وجود اپنی بچھڑی ہوئی روح کے لیے مچلنے لگا۔

"میں کس قدر اذیت و کرب کا شکار تھی۔ یہ میں ہی جانتی تھی۔ یا پھر مجھ جیسی حرماں نصیب وہ عورتیں جو ایسی دودھاری تلوار پر چل رہی ہوں کہ ان کے دل میں کوئی اور بستا ہو اور وہ خود کسی اور کے خواب سجاتی ہوں۔

میں نے وہ کتاب بند کر کے اپنی زندگی کے اس کربناک باب زندگی کو بند کرنا چاہا۔ جو اب ناممکن ہو چکا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا۔ میرا دل میری آنکھوں کے بند توڑ کے تکیے پر آ گیا ہو۔

"وجیہہ۔" یہ وہ بے ساختہ سسکی تھی جو خود بخود میرے لبوں سے آزاد ہوتی رہتی تھی۔

"وجیہہ! تم کہاں ہو؟ آئی مس یو۔"

میں نے اپنی آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور اپنے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی۔ وہاں پر چھپائی ہوئی اپنی ڈائری نکالی اور وجیہہ سے باتیں کرنے لگی۔ میرے پاس وجیہہ سے باتیں کرنے کے یہی دو تین ذریعے تھے۔ موبائل فون، خیالات اور یہ ڈائری۔ پہلے دو ذریعے اگر میسر نہ آتے تو پھر یہی ڈائری میرے اندر کو اظہار بخشتی تھی۔ یہ میرا دوسرا دل تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے دل میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اور پھر میں گردوپیش سے بے خبر ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"عصمہ! ابھی تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اگلی دوپہر نصیر احمد کا آفس سے فون آیا۔

"خیریت تو ہے۔ اس وقت کہاں جانا ہے۔" مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس دوپہر میں ہم نے کہاں جانا ہے جو میں تیار ہو جاؤں۔

"بس تم تیار ہو۔ میں بس یوں آیا۔" نصیر احمد نے جذباتی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے بھی فوراً ہی غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے ہلکے پھلکے سے میک اپ کے ساتھ تیار ہو گئی۔

"ارے واہ! تم تو خاصی ایکٹو ہو۔" مجھے یوں تیار پا کر نصیر احمد نے حیرانی کے ساتھ ساتھ ستائشی نظروں سے بھی دیکھا۔

"شکر ہے تم نے تو تیار ہونے میں دیر لگائی ہو اور نہ بہت مصنوعی انداز میں تیار ہوتی ہو۔" نصیر احمد نے میری کمر کے گرد بازو حمائل کر کے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"اچھا تو ہم نے جانا کہاں تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے نصیر احمد کا یوں اپنے قریب آنا، اظہار الفت کرنا برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کا اظہار محبت تو مجھے بہت ہی سادہ اور معصوم سا لگتا تھا۔ جس میں کوئی ضد یا زور زبردستی نہیں ہوتی تھی۔

"میں نے کہا نا وجیہہ محترمہ آپ چلیں تو سہی۔ کہیں تو جائیں گے ہی۔ ہو سکتا ہے تمہیں کہیں بھگا کر لے جانے کا پروگرام ہو۔"

وہ شرارت سے میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خالص ریس لگانے والے اسٹائل میں کھڑی ہو گئی۔

"لو کے"

وہ مجھے تقریباً بھگاتا ہوا باہر لے گیا۔

"ارے۔ رے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ رکو۔ کیا ہم بھاگنے سے بچے ہیں۔" میں نے کار پورچ میں پہنچ کے اس کا ہاتھ کھینچا۔

"کیوں خوش ہونے کے لیے کیا بچہ ہونا شرط ہے۔؟" وہ ذرا رکا اور اپنی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"نہیں بچہ ہونا نہیں۔ بلکہ خوش ہونے کے لیے



زندہ دل ہونا ضروری ہے۔" بلاارادہ ہی میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔

"بالکل غلط۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"بلکہ کسی بھی دل کی زندگی کے لیے خوشی ناگزیر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں خوش رہنے کی کوشش جان بوجھ کر بھی کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ ہمارا دل زندہ اور ہماری روح مطمئن رہے۔" اس نے میری ناک کی نوک کو بالکل وجیہہ کے انداز میں پکڑ کر چٹکی میں دبایا۔ اور پھر ہنس دیا۔

"بیٹھو۔ بادام عصمہ ورنہ دیر ہو جائے گی۔ اور پاسپورٹ آفس کا وقت ختم ہو جائے گا۔" اس نے گاڑی کا دروازہ میرے لیے کھولا۔

"پاسپورٹ آفس؟" مجھے مزید حیرت ہوئی۔

"جی ہاں۔ پاسپورٹ آفس۔" اس کی مسکراہٹ گہری اور معنی خیز تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بتایا تو ہم ملک سے باہر رہے ہیں۔ مگر کہاں یہ مجھے خود معلوم نہیں۔" اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ کیا تم آج ادھوری باتیں کر رہے ہو۔؟" مجھے ہر بات کے سامنے لگا سوالیہ نشان کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

"میری دوست! قسم لے لو اپنی کہ مجھے واقعی خبر نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وہ تو باس نے مجھے آفس میں بلایا۔ شادی کی مبارکباد دی اور کہا کہ تمہاری شادی پر میں آ نہیں سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر تمہارے لیے کمپنی کی۔ اور میری طرف سے ایک زبردست سرپرائز گفٹ ہے۔"

"میں نے پوچھا کیا؟" وہ بولے۔ "یہی تو سرپرائز ہے۔ بس تم جاؤ اور جا کر اپنا اور اپنی مسز کا پاسپورٹ بنواؤ۔ اب دیکھیں تمہارے نام کا قرعہ کہاں کا نکلے اور تمہارا ہنی مون اوپر والے نے کہاں پلان کیا ہو۔"

نصیر احمد نے مجھے بتایا۔ یہ بات میرے لیے بھی خوشی اور سسپنس کی تھی۔ اور اس کا جواب ہم دونوں

کو معلوم نہ تھا اس لیے ہم نے بس خاموشی سے پاسپورٹ بننے کی سرکاری و کاغذی کارروائی مکمل کروائی اور گھر واپس آ گئے۔

☼ ☼ ☼

"عصمہ!" رات کو نصیر احمد نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے توجہ میری طرف کی۔

"ہاں کہو۔" میں جو ٹی وی پر اپنا فیورٹ پروگرام دیکھ رہی تھی، ٹی وی بند کر کے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہارا کیا دل کرتا ہے کہ ہم کہاں جائیں۔؟"

وہ میرا بازو سیدھا کر کے اس پر اپنا سر رکھ کے لیٹ گیا۔

"ہاں۔ یہ تو سوچنے کی بات ہے۔؟" میں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں ہلکی ہلکی پھیرنی شروع کر دیں۔ اب کوئی میرے بے حد قریب ہو تا یا میں کسی کے قریب تو میں اپنا اظہار محبت ایسے ہی کرتی تھی۔ ماما ہوتیں تو میں یا تو ان کی کنپٹیاں دبانے لگتی یا پھر پاؤں سیدھے کر کے اپنی گود میں رکھ لیتی اور ہولے ہولے دبانے لگتی۔ یہ عادت پچھلے چند ماہ سے ہی مجھ میں عود کر آئی تھی۔ ورنہ تو میں بڑی کٹھور دل کی تھی۔ میرا دل کسی ایویں تیویں پر بھلا کب پسیجتا تھا۔

"عصمہ! تمہارے ہاتھوں میں کتنی نرماہٹ ہے؟"

اس نے میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں۔" میں نے اترا کر کہا۔

"اچھا بڑا اعتماد ہے۔" وہ گھوم کر الٹا ہو گیا۔ اب ہم دونوں کے چہرے آمنے سامنے تھے۔ وہ کچھ لمحے مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا۔ پھر میرے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا۔ "پگلی۔"

"اچھا! اگر ہم لوگ ملائیشیا جائیں تو؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"تو۔ کیا؟ جہاں بھی جانا ہو گا وہ تو قرعہ اندازی ہی سے معلوم ہو گا۔ ہم کیوں اپنے خوابوں کو پریشان کریں۔"

اب میں نے بھی اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا دی تھی۔

"ارے۔" وہ ہنس پڑا۔

"حساب برابر۔" اس کی انگلی میری طرف تھی۔ اور میں اقرار میں گردن ہلا رہی تھی۔

"تم نا عصمہ ذرا ابھی نہیں بدلیں۔" نصیر احمد نے میرے چہرے پر میرا بچپن تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بار ہم لڑکے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ تم نوراں مائی کے ساتھ کہیں سے آ رہی تھیں۔ میں نے ہٹ لگائی تو گیند تمہیں لگ گیا۔"

وہ میرے بچپن کا ہی کوئی واقعہ بیان کر رہا تھا۔

"اچھا پھر۔" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تم ذرا بھی نہیں روئیں اور وہی گیند اٹھا کر میرے قریب آئیں اور بال میرے سینے پر ماری، بچ اتنی زور سے کہ اس روز سے آج تک یہاں درد ہے۔" نصیر نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب ٹھیک دل کی جگہ پر رکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"ہوں۔ تو یہ خاصا پرانا مرض ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے چھیڑا۔

"بہت پرانا۔ تب تم اتنی سی تھیں۔"

اس نے ہاتھ کو زمین سے کوئی تین فٹ اونچا کر کے کہا۔

"اور تم۔ تم کتنے بڑے تھے؟" میں نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے جرح کے انداز میں پوچھا۔

"میں تم سے کوئی اتنا بڑا ہوں گا تب۔" اب کی بار اس نے اپنا ہاتھ کوئی تین فٹ اونچا کیا زمین سے۔

"میں تم سے عمر میں بھی تو بڑا ہوں۔ کوئی سات آٹھ برس۔" مجھے حیران پا کر اس نے وضاحت کی۔ اور میں اسے غور سے دیکھنے لگی۔ یہ وہی نصیر احمد تھا جو مجھے کبھی ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور آج اس کے ساتھ باتیں کرنا، ہنسنا، سونا جاگنا یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا۔ ہماری زندگی میں اور کوئی کشش نہ تھی۔ نہ کوئی بے جا کا سیر سپاٹا، نہ گھر میں آسائش و آرائش۔ بے حد سادہ اور آسان سی زندگی تھی۔ مگر کیسی جاذب لگنے لگی تھی۔

ہم کل چار افراد تھے۔ خالہ جان، نسیم باجی، نصیر احمد اور میں۔ جن میں سے نسیم باجی تو شام کو واپس اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ اور خالہ جان وہ تو بے حد بے ضرر سی ہستی تھیں۔ جن کا کام عبادت اور محبت کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ تو بس آتے جاتے مجھے پیار کرتیں اور دعائیں دیتیں۔ کچن میں نسیم باجی میرے ساتھ کچھ ہاتھ بٹاتیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتیں۔ میں اور نصیر احمد۔ جب تک ساتھ ہوتے باتیں کرتے۔ نصیر احمد کی حس مزاح بھی بلا کی اچھی تھی۔ وہ کوئی نا کوئی چٹکلے بھی سنا سنا کر مجھے ہنساتا رہتا تھا۔

یہ وہی نصیر احمد تھا جسے میں نے کبھی نظر بھر کے اٹھا کر بے تکلفانہ گفتگو کرتے نہ پایا تھا۔ اور اب یہ جتنی دیر میرے ساتھ ہوتا، میرا ہاتھ تھامے رہتا۔ مجھے اپنے زانو پر سر رکھنے کو کہتا۔ یا میرے بازو پر اپنا سر رکھ کے لیٹتا۔ اس کے سارے کے سارے جذبات اور محبت بس اتنی ہی روا تو ہی تھی۔ ایک حد تک ایک دائرہ اخلاق کے اندر۔ اس کے آگے بڑھنے کی کوشش تو اس نے کبھی نہ کی تھی۔ حالانکہ وہ اس کا حق رکھتا تھا۔ میرے اور نصیر احمد کے درمیان ابھی بھی ایک ان دیکھی فصیل تھی بلند اور موٹی سی فصیل۔

"عصمہ! تمہیں پتا ہے میں تمہیں کب سے چاہتا ہوں۔ اور کتنا چاہتا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ تم بتاؤ۔" مجھے اس کی آنکھوں کی یہ شفاف اور ٹھنڈے پانیوں والی گہری جھیلیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

"شاید تب سے، جب ابھی تم نے پاؤں پاؤں بھی چلنا نہیں سیکھا تھا۔

پتا ہے تم بہت صحت مند اور خوب صورت تھیں، گلابی گلابی سی 'اماں کہتی ہیں' میں تمہیں گھنٹوں گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا اور پھر تب ہی سے اماں نے کہنا شروع کر دیا تھا۔ نصیر احمد تیری دلہن تو میں عصمہ جیسی لاؤں گی اور میں کہتا تھا میں عصمہ سے ہی شادی کروں گا ورنہ کروں گا ہی نہیں۔" وہ خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

"اچھا تو تمہاری نیت بچپن سے ہی مجھ پر خراب تھی۔ یعنی تم تو اچھے خاصے ٹھگ تھے۔ وہ کیا کہتے ہیں، شکل مومناں اور کرتوت کافراں۔" میں نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے منہ پھلا کر کہا۔

"میں بدنیت یا بدنظر نہیں تھا عصمہ! بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔" وہ شرمندہ اور سنجیدہ ہو گیا۔

"چلو دل کے معاملے پر تمہارا جرم معاف کیا۔ اور تمہیں باعزت بری کیا۔" میں نے اس کا جھکا ہوا سر اٹھانے کے لیے اس کے چہرے کو اوپر کیا اور اس کے منہ پر بجے ہوئے بارہ دیکھ کر ہنس پڑی اور وہ بھی میرے ساتھ ہی ہنسنے لگا۔

☼ ☼ ☼

ہمارے پاسپورٹ بن کے آ گئے تھے۔ بلکہ نصیر احمد کے آفس میں جمع بھی ہو گئے تھے۔ اب نصیر احمد کو ایک بے کلی لگ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری جگہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو سوئٹزرلینڈ، پھر ملائیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ میرا دل اور میرے خیالات بالکل کورے تھے۔ اس طرف سوچنے کو میرا دل ہی نہیں کر رہا تھا، بلکہ سچ کہوں تو نصیر احمد کے ساتھ تنہا اتنی دور جاتے ہوئے مجھے الجھن سی ہو رہی تھی اور نا چاہتے ہوئے بھی وجیہہ کے ساتھ کھوئی ہوئی وادی سوات میرے حواسوں پر چھانے لگتی تھی۔ میری آنکھوں کے کونے آج کل گیلے ہی رہتے تھے۔ میرا دل بھی اداس سا تھا۔

"عصمہ بیٹی۔" شام کو میں اور خالہ جان باہر باغیچے میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں، جب انہوں نے مجھے کہا۔

"جی خالہ جان۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مجھے لگتا ہے آج کل تم کچھ اداس سی ہو، چاہو تو دو چار روز کے لیے اپنی ماما کے پاس چلی جاؤ۔" انہوں نے یقیناً میرے چہرے پر میرا دل دیکھ لیا تھا۔

"جی وہ ماما کی طبیعت پتا نہیں کیسی ہو گی؟" میں نے عجیب سا جواب دیا۔ حالانکہ ماما سے تو میری پابندی سے فون پر بات ہوتی تھی اور کئی بار میں اور نصیر احمد..... جا کے چائے بھی ساتھ پی آئے تھے۔

"تو ایسا کرو تم تیار ہو جاؤ' ویسے بھی نصیر احمد تو اب دو روز کے بعد ہی آئے گا' تم یہ دو روز اپنی ماما کے ساتھ رہ آؤ جا کر۔" وہ مجھے گم سم سا دیکھ کر مسکرائیں۔ نصیر احمد دراصل آج صبح ہی اپنی کسی آفیشل کانفرنس کے لیے بھوربن گئے تھے۔ اس لیے میں تنہا بھی تھی۔

"بلکہ چلو ہم دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔ مجھے بھی کئی دن ہو گئے' نفیسہ بیگم سے ملے ہوئے۔" خالہ جان بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

"جی بہتر ہے۔" میں بغیر کسی حیل و حجت کے تیار ہو گئی۔ نسیم بابا جا کر رکشا لے آئیں۔ حالانکہ اب مجھے ڈرائیونگ آتی تھی اور نصیر احمد کی گاڑی بھی گھر ہی میں کھڑی تھی۔ مگر میں نے رکشا پر جانا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنے دو جوڑے ایک ہینڈ بیگ میں ڈالے اور ہم دونوں کچھ ہی دیر میں ماما کے پاس پہنچ گئیں۔

ماما ہمیں یوں اچانک اور ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور نوراں ماسی کا چہرہ تو مارے خوشی کے دمکنے لگا۔

"ارے بیٹا! سچ کہیں تو آج ہم نے آپ کو خواب میں بھی دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح سے خاتون خالہ کے ساتھ۔" وہ میرا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

"ارے ماسی آپ تو انہیں خالہ نہ کہا کریں۔" مجھے آج ان کا نصیر کی والدہ کو خالہ کہنا اچھا نہ لگا۔

"کوئی تو یہ بات ہے۔" وہ مجھے سر سے پاؤں تک معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرائیں۔

"دیکھا نفیسہ بیگم' دیکھا آپ تو خوامخواہ بیٹیا کی فکر کرتی رہتی ہیں' حالانکہ بیٹیا تو خاصی سمجھ دار ہو گئی ہیں۔" انہوں نے ماما کو دیکھ کر بھی میری طرف اسی شرارت سے اشارہ کیا۔

"تو ٹھیک ہے نا نوراں ماسی! اگر وہ ان کی عزت اور رہنے کی فکر نہیں کرے گی تو کون کرے گا۔" میں نے دیکھا میری ماما کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ تب مجھے اپنی ماما پر ٹوٹ کر پیار آیا اور میں ان کے پاس آکر ان کے کندھے سے لگ کے بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"عصمہ بیٹی! تم خوش تو ہو نا؟" رات کو کھانے کے بعد جب میں ماما کے کندھے دبا رہی تھی تو انہوں نے اچانک ہی مجھ سے پوچھ لیا۔

"جی... جی ماما۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ مگر جانے کیوں میرے ہاتھوں میں لرزش سی آگئی تھی۔

"عصمہ! نصیر احمد بہت نفیس انسان ہے' اس کی قدر کرنا اور کبھی اس کا دل نہ دکھانا' اب جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے اور جو کچھ بعد میں ہونا چاہیے وہ اس نصیر احمد سے ہی منسلک ہونا چاہیے۔" ماما نے میرے ہاتھ تھام کے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"جی ماما۔" میں نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"عصمہ! جو لڑکیاں اپنے ماضی اپنے حال کو ساتھ رکھ کے جیتی ہیں' وہ کبھی بھی اپنے اصل فرائض منصبی ایمانداری سے ادا نہیں کر سکتیں۔" وہ میرے چہرے کو اپنی طرف اٹھاتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

"تم میری بات کو سمجھ رہی ہو نا عصمہ؟" وہ مجھ سے اقرار ہی نہیں بلکہ یقین دہانی کی خواہاں تھیں۔

"جی ماما۔" میرے لبوں سے بار بار صرف یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

"مجھے تمہاری زندگی کا اطمینان نہیں بلکہ تمہاری ازدواجی زندگی کا اطمینان چاہیے۔ نصیر احمد تمہارا شوہر ہے اور وہ ایک مرد ہے اور ایک مرد ہونے کی تمام تر جبلت سے بھرپور ایک انسان بھی۔ اسے زیادہ دیر تک آزمائش میں نہ ڈالنا کہ وہ رب العالمین تم سے پھر خفا ہو جائے' اس نے تمہیں — بڑی جان سے اپنایا ہے عصمہ! تم بھی اپنے اندر اس کی محبت کو اسی شدت



سے اتارو۔" ——— وہ نرمی سے مجھے سمجھا رہی تھیں اور میں ——— یہ سوچ رہی تھی کہ آخر یہ مائیں بیٹیوں کے اندر اتنی گہرائی سے کیسے جھانک لیتی ہیں کہ ان سے بیٹیوں کے خواب و خیال تک بھی چھپے نہیں رہتے۔

"جاؤ اب جا کر آرام کرو' اللہ تمہارے نصیب میں وہ سارے سکھ اور خوشیاں لکھ دے' جو وہ اپنی پسندیدہ بندیوں کے لیے چاہتا ہے۔" تب میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"آمین' ثم آمین۔"

☆ ☆ ☆

رات کو میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں لیٹی تو مجھے عجیب سی وحشت ہونے لگی' اکیلی تو میں برسوں سے اس کمرے میں پہلے بھی سویا کرتی تھی۔ میرا یہ کمرہ وجیہہ کے ساتھ شادی سے پہلے جس طرح آراستہ تھا آج بھی بالکل اسی طرح سے تھا اور اب تو وجیہہ کے بعد یہ ہی کمرہ میری پناہ گاہ' میرا مسکن رہا تھا۔ یہاں مجھے کبھی خوف نہیں آیا تھا مگر آج عجیب سی محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز کے بعد کے اذکار وغیرہ کیے اور بستر پر آگئی۔ چاہا کہ نیند آجائے مگر آنکھیں تو سونے سے صاف انکاری تھیں۔

"کیا کروں؟" میں نے اپنے اڈنے والے بے شمار خیالات سے راہ فرار کے لیے سوچا اور اٹھ کر اپنی بک شیلف کی طرف آگئی۔ میری بک شیلف بے شمار ادب پاروں سے آراستہ تھی اور اس میں کئی نامور شعراء کے شعری مجموعے بھی نگینوں کی طرح رکھے تھے۔ مگر کچھ بھی دل کو نہ بھا رہا تھا۔ شاید میرے اندر اداسی کی ایک دبیز تہ آہستہ آہستہ سے میرے حواسوں کو جکڑ رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے کون یاد آرہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو موند لیا اور ایزی چیئر پر دھیرے دھیرے جھولنے لگی۔

"وجیہہ!" وہ مجسم سے میری پلکوں تلے اتر آیا۔

"کیا بات ہے دلنشین! تم اس قدر اداس کیوں ہو کہ تمہارے چہرے کی چمک ماند پڑ کے اس پر زردی چھا رہی ہے۔" وہ میری ٹھوڑی کو اوپر اٹھائے میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"میرا دل پریشان ہے وجیہہ!" میں نے اسے بتایا۔

"کس بات کی پریشانی؟" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"وجیہہ! میں اب بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔" میں نے اپنا حال دل کہنے کی کوشش کی۔

"وجیہہ! میں کیا کروں' میں تو پل صراط پہ کھڑی ہوں۔" مجھ سے اب اپنی اور بے بسی برداشت نہ ہوتی تھی۔

"پل صراط؟" وہ لمحہ بھر کو کسی سوچ میں ڈوبا' چند لکیریں فکر کی اس کی پیشانی پر ابھریں جو جلد ہی زائل ہو گئیں۔

"پل صراط ہی تو دراصل وہ راستہ ہے جس کے بعد ہر انسان کو منزل نصیب ہوتی ہے۔ دائمی منزل ہمیشہ کا ٹھکانہ۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"مگر اس پر چلنا بہت دشوار ہے' یہ راستہ تو تلوار کی دھار جیسا ہے۔" مجھے لگا کوئی دھار میرے وجود کو ——— چیرتی میری شہ رگ تک آگئی ہو۔

"یہ تلوار کی دھار دکھائی دیتی ہے' مگر ہے نہیں' تم ذرا حوصلے سے یہ قدم تو بڑھاؤ۔" اس نے مجھے آگے کو قدم بڑھانے کی تحریک دیتے ہوئے کہا۔

"میرے پاؤں کے ٹکڑے کٹ جائیں گے۔ میں نہیں چل پاؤں گی۔" مجھے وہ چمکتی ہوئی دھار خوف زدہ کیے دے رہی تھی۔

"تم آؤ نا میرے ساتھ۔ پلیز میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے ذرا سہارا دو۔" میں نے اپنا ہاتھ وجیہہ کی طرف بڑھایا۔

"م... م... میں؟" وجیہہ پریشان ہو کر کئی قدم پیچھے کو ہو گیا۔

"کیا ہوا وجیہہ! آؤ نا؟" مجھے اس کے پیچھے ہٹنے پر کوفت ہوئی۔

"میں تمہارے ساتھ اس راستے پر نہیں چل سکتا؟" وہ اپنی نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

"لیکن کیوں وجیہہ! تم نے تو کہا تھا ہم جنم سے مرگ تک کے ساتھی ہیں۔" میں نے اسے یاد کرانا چاہا۔

"کہا تھا۔ مگر میں عہد پر قائم نہیں رہ پایا گو کہ اب میں تمہارا ہم سفر نہیں ہوں' یہ... یہ پل صراط تو تمہیں تنہا ہی عبور کرنا ہو گا۔" وہ ایک وجود سے ہیولے میں تبدیل ہونے لگا۔

"لیکن وجیہہ! میں تمہارے بغیر؟" میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا تو میرے قدم ہی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

"میرے پاؤں! میرے پاؤں؟" میں پریشان ہو کر رونے لگی۔ اتنے میں میرے سامنے وجیہہ کا ہیولا دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے مٹ رہا تھا۔ لیکن اس لمحے مجھے وجیہہ کے ہیولے سے زیادہ اپنے پاؤں کی فکر تھی۔ میں اپنے پاؤں کھو جانے کے صدمے سے نڈھال تھی اور تڑپ رہی تھی کہ میرے پاؤں مجھے واپس مل جائیں۔ وجیہہ کہاں غائب ہو گیا۔ دھواں ہو کر ہوا میں پھیل گیا یا آسمان کو پرواز کر گیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں تو اگر نوحہ کناں تھی تو اسی پر کہ اب میرا کیا ہو گا۔ کیونکہ میرے اردگرد اک الاؤ تھا جو دہکنے لگا تھا اور سامنے وہی تلوار کی دھار کی طرح چمکتا ہوا پل۔

"یا اللہ! مجھ پر کرم کر' یا الٰہی! میرے پاؤں لوٹا دے تاکہ میں چل سکوں۔" میں آسمان کی طرف چہرہ اٹھائے گڑگڑانے لگی تھی اور میرا وجود میرے ٹخنوں پر ڈولنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک عجیب ہولناک خواب تھا جو میں نے جاگتے میں دیکھا تھا۔ یہ خواب اتنا شفاف تھا کہ حقیقت سے بھی نمایاں تھا۔ مجھے اپنے وجود کے ہر ریشے میں سے پسینہ بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں ایسی کیفیت سے دوچار تھی۔ جیسے ابھی ابھی مجھ پر وہ سب بیتا ہو پھر میرا خوف اتنا بڑھا کہ میں رات کے دو بجے اپنے کمرے سے نکل کے ماما کے پاس آ گئی۔

"کیا ہوا' میری جان! خیر تو ہے۔" جب میں چپکے سے ان کے ساتھ لیٹ رہی تھی تو وہ ایسے جاگ گئیں' جیسے سوئی ہی نہ ہوں۔

"ماما! مجھے ڈر لگ رہا ہے؟" میں نے ان کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم نے کوئی برا سا خواب دیکھا ہے؟" انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر اپنے بازو میرے گرد حائل کرتے ہوئے کہا۔

"جی ماما!" میرا لہجہ اب بھی کانپ رہا تھا۔

"اچھا تم آنکھیں بند کرو' میں آیت الکرسی پڑھ کے پھونکتی ہوں۔" ماما پیار سے بولیں' ماما نے مجھ پر کیا کیا پڑھ کے پھونکا مجھے یاد نہیں' مگر اس کے بعد فوراً" ہی مجھے گہری نیند آ گئی تھی۔

"عصمہ!" صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو ماما نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"جی ماما!" میں نے مسکرا کے پوچھا۔

"آج اپنے ہاتھ سے کوئی صدقہ دو' اور بہتر ہے نصیر احمد کے واپس آنے تک تم اپنا محاسبہ کرو' اپنے خوابوں اور خیالوں کا جائزہ لو۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ تب میں بھی اقرار میں سر ہلا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

"ماما! کیا میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں۔ وہ نصیر آئے گا اور میں گھر نہیں ہوں گی تو؟" کچھ ہی دیر کے بعد میں ماما سے پوچھ رہی تھی۔ میری بات سن کر انہوں نے اک گہری سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا' پھر بولیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم نے ایسا سوچا' کوئی بیوی اگر اپنے ذہن میں اس سوچ کو بسا کر رکھے کہ جب اس کا شوہر گھر واپس آئے تو وہ خوش دلی سے اس کا استقبال کرے تو یقین کرو اس کے شوہر کے دل میں اس کی محبت اور قدرو منزلت کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے مجھے سمجھا رہی تھیں۔



"اچھا کو میں تمہارے لیے کچھ کھانا بنوا دوں' تاکہ تمہیں جا کر نہ بنانا پڑے۔" انہوں نے پیار سے کہا اور نوراں ماسی کے ساتھ مل کر میرے لیے خود کھانا بنانے لگیں۔

ماما نے بہت ساری چیزیں بنا دی تھیں۔ نصیر احمد کی پسند کے کباب' بریانی اور چنے کی دال کا حلوہ۔ میری ماما نہ صرف بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں بلکہ بے حد جلدی بھی بنا لیتی تھیں۔ جبکہ مجھ سے کچن کا کام بہت تیزی سے نہ ہوتا تھا۔ تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے کے بعد لیاجان مجھے خود چھوڑنے جا رہے تھے۔ وہ بھی بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ جب میں آ رہی تھی تو میری ماما نے مجھے نرمی سے سمجھایا تھا۔

"عصمہ! نصیر احمد کو بے تکلفی کی بجائے دلی محبت اور احترام سے پکارا کرو' اچھا لگتا ہے اور تہذیب یافتہ بھی۔"

☼ ☼ ☼

شام کو میں نے بڑے اہتمام سے غسل کیا اور اپنی الماری میں سے سب سے اچھا لباس نکال کے زیب تن کیا۔

آف وائٹ شلوار' قمیص پر سرخ اور سیاہ بوشیا کا بڑا سادہ پٹہ' یہ جوڑا بھی میری بری کا جوڑا تھا اور نصیر احمد نے اپنی پسند سے خریدا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ کر کے میں نے بہت دنوں کے بعد اپنا فیورٹ پرفیوم بھی لگایا تھا۔ پہلے میں نے اپنے بالوں کو کھلا چھوڑنے کا سوچا' مگر پھر کسی خیال کے آتے ہی میں نے انہیں ہلکی سی چوٹی میں باندھ لیا۔ میں بالکل تیار تھی اور بہت دنوں کے بعد مجھے اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے کئی بار آئینہ دیکھا اور ہر بار آئینہ دیکھتے ہوئے مجھے حیا سی آ گئی۔

نصیر احمد اپنے بتائے ہوئے وقت پر آ گئے تھے۔ لمبے سفر سے آنے کے باوجود ان کے چہرے پر بشاشت تھی اور کچھ وہ مجھے یوں تازہ دم دیکھ کر بھی فریش ہو گئے تھے۔ آج تو خالہ جان بھی بہت خوش تھیں اور مجھے کئی بار کہہ چکی تھیں۔

"عصمہ! اسی طرح سے تیار ہو کر رہا کرو' سہاگنیں بنی سنوری ہی اچھی لگتی ہیں۔" انہوں نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کے مجھے بہت سی دعائیں بھی دی تھیں۔ نصیر احمد آئے تو ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا' بعد میں نسیمہ باجی قہوہ بنا کر لے آئیں۔

"بیٹا! اب تم لوگ یہ قہوہ اپنے کمرے میں جا کر پیو' میں بھی اپنے کمرے میں جاؤں گی۔ آج ذرا طبیعت بوجھل سی ہے' میں جلد عشاء کی نماز پڑھ کر سونا چاہتی ہوں۔" خالہ جان نے کہا تو نصیر پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا' اماں آپ کو کیا ہو گیا۔ طبیعت کیوں بوجھل ہے؟" وہ انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"ارے بیٹا کچھ نہیں ہوا مجھے' صرف بڑھاپا ہے' سو بیماریوں کی ایک بیماری' ایسے میں کبھی طبیعت بوجھل رہتی ہے تو کبھی جسم میں درد' تم میری فکر نہ کرو اور جا کر آرام کرو' اتنا سفر کر کے آئے ہو۔" انہوں نے بیٹے کے گال محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☼ ☼ ☼

"ہاں تو کیا ہوتا رہا میرے بعد؟" کمرے میں آ کر نصیر نے مجھے کندھوں سے تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

"سچ بتاؤں یا روایتی بیویوں والا جھوٹ؟" میں نے قہوے والی پیالیوں کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے ان کی طرف دیکھا۔

"بیویوں والا جھوٹ کیوں۔ جبکہ ہم تو اچھے دوست ہیں' صرف دوست؟" نصیر احمد نے تو سادگی ہی سے کہا تھا' مگر جانے کیوں مجھے وہ لفظ دوست اپنے اندر چبھتا ہوا محسوس ہوا۔

"بتاؤ نا کیا سوچنے لگیں؟" وہ بیڈ پر بیٹھ کر قہوہ پینے لگے۔

"نصیر! آپ بہت اچھے ہیں۔" مجھے اور کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے ان کی تعریف کر دی۔

"یہ آپ جناب کہاں سے آگئے ہمارے بیچ؟ خیریت تو ہے نا؟" وہ مجھے کچھ حیرت سے دیکھنے لگے۔

"نصیر! آپ میرے دوست بھی ہیں مگر۔" مجھے سمجھ نہ آرہی تھی کہ اپنے جذبات کی وضاحت کس طرح سے کروں۔

"مگر کیا؟" وہ کچھ سنجیدہ ہوگئے۔

"مگر آپ میرے شوہر ہیں اور بیویوں کو بے تکلف ہونے سے زیادہ اپنے شوہروں کے ساتھ دلی محبت اور احترام کا رویہ بھی اپنانا چاہیے۔" میں نے ماما کے کہے ہوئے الفاظ کو ہو بہو کہہ دیا۔ وہ چند لمحے تو سنجیدہ سی شکل کے ساتھ مجھے دیکھتے رہے، پھر زور سے ہنس پڑے۔

"یہ... یہ تمہیں خالہ جان نے سمجھایا ہوگا، ہے نا؟" وہ میری طرف اپنی انگلی کیے ہنس رہے تھے۔

"ہاں۔" میں نے سادگی سے کہا اور پھر چند لمحوں کے بعد میں بھی نصیر احمد کے ساتھ مل کر ہنس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں ناشتا بنا کر ٹرے کمرے میں ہی لے آئی۔ خالہ جان تو نماز فجر کے بعد چائے کے ساتھ رس لیا کرتی تھیں اور پھر ناشتا نہیں کرتی تھیں اس لیے میں اور نصیر ناشتا اکثر کمرے میں کیا کرتے تھے۔

"نصیر! نصیر!" میں نے ٹرے رکھ کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔

"نصیر! ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا آپ شیو بعد میں کرلیں پہلے ناشتا کرلیں آکر۔" مجھے واقعی چائے اور انڈے کے ٹھنڈا ہو جانے کی فکر تھی۔

"اچھا جناب! جو حکم آپ کا۔" وہ فوراً ہی باہر آگئے۔

"ارے آپ تو شیو بھی کر چکے۔ میں سمجھی آپ شیو کر رہے ہوں گے۔" میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ تازہ تازہ شیو کے بعد وہ بے حد اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ ہی کئی لمحوں تک انہیں غور سے دیکھا تو وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے شرارت سے بولے۔

"او زوجہ محترمہ! کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" اور میں شرمندہ ہونے کی بجائے اعتماد سے بولی۔

"جس نظر میں محبت کے ساتھ ساتھ دعا بھی ہو وہ لگ کر فائدہ ہی دیتی ہے۔"

"اچھا جی۔ بہت باتیں آگئی ہیں۔" میری بات سن کر وہ مجھے گھورنے لگے۔

"آپ ہی سے سیکھی ہیں؟" میں نے مسکرا کر کہا اور چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا۔ پھر نصیر تیار ہونے لگے، میں آگے بڑھی اور وارڈ روب میں سے ایک ہینگر اتار کے ان کے سامنے کر دیا۔

"آج آپ یہ پہنیں۔" میرے ہاتھ میں اپنی پسند کی شرٹ تھی۔

"یہ..." وائٹ اور بلیک لائننگ والی شرٹ کو وہ دیکھ کر سوچنے لگے۔ نصیر احمد کو زیادہ تر سفید یا پھر لائٹ کلرز کی پلین شرٹس پسند تھیں۔

"ہاں آپ یہ ہی پہنیں گے۔" میں نے آگے بڑھ کر ان کے بازو سیدھے کیے۔ اور شرٹ انہیں پہنا کر بٹن بند کر دیے۔

"اب دیکھیں؟" میں نے انہیں کندھوں سے تھام کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کر دیا۔

"دیکھیں! آپ کتنے اسمارٹ اور ڈیشنگ لگ رہے ہیں۔" میں نے انہیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو یقیناً ایسا ہی لگ رہا ہوں گا۔" انہوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اچھا اب اگر مجھے موزے بھی مل جائیں تو۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"لیں جی موزے۔" میں نے جھٹ سے دراز میں سے موزے نکال کر انہیں دیے۔ پھر ان کے بوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے اور جاتے ہوئے انہیں

پرفیوم بھی لگایا۔

"نہیں جی... یہ آپ کا آفس بیگ اور اب آپ جائیں۔" میں نے ان کا بیگ ان کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"عصمہ!" وہ جانے کی بجائے میرا رخ اپنی طرف کر کے کھڑے ہو گئے۔

"جی..." وہ مجھے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے میری نظریں جھکنے لگیں۔

"تم واقعی بہت اچھی ہو۔" انہوں نے میرے گال کو ہولے سے اپنے ہاتھ سے چھوا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

"میں... اچھی!" میں نصیر احمد کے پیچھے پورچ تک جانے کی بجائے وہیں بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔

"میں اچھی ہوں۔" یہ میرا خود سے سوال تھا۔

"لیکن میں اچھی کیا ہوں؟" یہ میرے سوال کا پہلا جز تھا۔

"اچھی عورت؟ اچھی دوست؟ یا پھر اچھی بیوی؟" میرے سوال کے چوتھے جز کی نوک پر بہت سے کانٹے تھے۔ جو سارے کے سارے میرے دل و دماغ میں اتر گئے۔ اور میں اپنے دونوں پیروں کو دیکھنے لگی کہ "کیا میرے ٹخنوں کے نیچے میرے پیر سلامت ہیں؟"

☼ ☼ ☼

"نصیر!" رات کو میں ان سے پوچھ رہی تھی۔ "نصیر وہ ہمارے پاسپورٹس کا کیا بنا؟ کیا ادھر سے ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا؟" اچانک ہی مجھے خیال آیا تو میں نے پوچھ لیا۔

"پاسپورٹ!" وہ اپنے لیپ ٹاپ پر جھکے کچھ کام کرنے میں مصروف تھے سر اٹھا کر بولے۔

"ہاں یار! تم نے اچھا یاد کرایا۔ ہمارے تو پاسپورٹ گئے ہوئے ہیں اور میں بھول ہی گیا۔" انہوں نے لیپ ٹاپ کو بند کیا میری طرف مکمل متوجہ ہو گئے۔

"وہ ہمارے پاس نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ لگتا ہے وہ بھی بھول گئے ہیں؟ صبح میں ان سے پوچھوں گا۔" نصیر احمد کو ہنی مون یاد آ گیا اور وہ سنجیدہ ہو گئے۔

"اچھا چھوڑو پاسپورٹس کا ذکر' اگر کہیں جانا ہو گا تو چلے جائیں گے' تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہم مری چلیں۔" وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

"مری؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں مری نہیں۔ مری مجھے بہت زیادہ پسند نہیں۔ یہ اتنا سا مری ہے۔" میں نے ہمیشہ کی طرح مری سے صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر سوات چلیں۔ سچ سوات کی کیا بات ہے۔ میں ایک بار اپنے کالج ٹرپ کے ساتھ گیا تھا۔" وہ مجھے بتانے لگے۔

"سوات؟" میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میری رگ و پے میں دریائے سوات کا پانی جاری ہو گیا۔ تیز بہاؤ کے ساتھ میرے اندر اک سیلاب سا آ گیا۔

"بتاؤ نا سوات چلیں؟" نصیر احمد مجھے پوچھ رہے تھے اور میں نے۔

"نہیں۔" کہہ کر اپنی آنکھیں جھکا لیں' تاکہ ان کے کناروں سے چھلکتے ہوئے ریلے میرا کوئی پراسرار راز نہ کھول دیں۔

"چلو کوئی بات نہیں' اگر سوات بھی تمہیں پسند نہیں تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ خوابوں کی حسین وادیوں میں چلتے ہیں' جہاں جانے کے لیے کسی پاسپورٹ پر لگے ویزے کی ضرورت ہے اور نہ ہی آفس سے لمبی چھٹی کی۔ اگر ضرورت ہے تو بس نرم تکیوں پر سر رکھ کے آنکھیں موند کے سہانی اور گداز سوچوں کی ہے۔"

نصیر احمد نے مجھے کھینچ کے تکیے پر گرایا اور اپنی ہتھیلیوں کو میری آنکھوں پر رکھ دیا' بڑی ہی نرمی اور محبت سے وہ ہولے ہولے سے کچھ گنگنا رہے تھے۔

تم سے گر دوستی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

تم تبسم ہو میرے ہونٹوں کا
بن تمہارے ہنسی نہیں ہوتی



تیری چاہت میں عبادت ہے
عشق میں دل لگی نہیں ہوتی

وہ اپنا حال دل سنا رہے تھے اور میرے اندر کے سیلاب پر بند باندھ رہے تھے۔ اب اگر کچھ لہریں دل میں امنڈ رہی تھیں تو وہ خود تشنہ تھیں۔ جانے کیوں میرے اندر کی طغیانیوں کو اب نصیر احمد کی ذات کے کنارے درکار تھے۔ نصیر احمد نے اپنے ہاتھوں کو میری آنکھوں سے ہٹایا۔ اور میرا بازو سیدھا کر کے اس پر سر رکھ کے پرسکون ہو گئے۔

"نصیر!" میں... چند لمحوں کے انتظار کے بعد اٹھی۔

"نصیر!" میں نے ہولے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا نصیر احمد کے لبوں پر اک دھیمی سی مسکان تھی اور چہرے پر بلا کا سکون' وہ ایک چھوٹے سے معصوم بچے کی مانند سو رہے تھے۔

نصیر احمد کو بہت جلد نیند آ جاتی تھی۔ "آج جانے کیوں مجھے ان کی نیند پر غصہ آ گیا۔ جی چاہا کہ انہیں جھنجوڑ کے اٹھا دوں۔

مگر مجھے ان کے چہرے کا سکون اس وقت اپنے اندر کے تلاطم سے زیادہ عزیز تھا۔ سو میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور آنکھوں کو زور سے میچ لیا۔

☼ ☼ ☼

"عصمہ!"

"عصمہ!" نصیر احمد اپنے آفس کے مقررہ وقت کے ختم ہونے سے قبل ہی آ گئے تھے اور مجھے آوازیں دیتے آ رہے تھے۔

"عصمہ!" ان کی آواز میں ایک عجب سی لرزش تھی جیسے خوشی کی انتہا کی بدولت انسان اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے تو آواز رندھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح سے وہ مجھے لرزتی ہوئی آواز میں بلا رہے تھے۔

"جی نصیر! میں یہاں ہوں؟" میں جو کچن میں تھی باہر آتے ہوئے بولی۔

"عصمہ! میں کتنا خوش ہوں تمہیں بتا نہیں سکتا۔" انہوں نے مجھے کندھوں سے تھام کے اپنے سامنے کر لیا۔ انہوں نے آج مجھے ذرا سختی سے پکڑا تھا' ان کی انگلیاں میرے کندھوں میں کچھ دھنس سی گئی تھیں۔ اور آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ جیسے بہت سارے آنسو رکے ہوئے ہوں۔ "خیر تو ہے نصیر۔" مجھے ان کے یوں خوش ہونے سے بھی ڈر ہی لگا۔ "عصمہ! ہمارے پاسپورٹ پر ویزے لگ کر آ گئے ہیں۔" وہ اپنے جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولے۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" مجھے ان کی خوشی کی سمجھ آ گئی تو میں ہنس دی۔

"ہاں۔ ہم جا رہے ہیں؟" وہ بہت سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ "کہاں۔ کیا سوئٹزرلینڈ؟" مجھے لگا وہ سوئٹزرلینڈ کو بہت آئیڈیل کر رہے تھے ہنی مون کے لیے تو وہیں کا ویزا لگ جانے پر اتنے جذباتی ہو رہے ہیں۔

"یہ لو خود دیکھو!" نصیر نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور اپنے کوٹ کی جیب سے پاسپورٹ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔

"کیا ہے نصیر؟" مجھے ان کے چہرے پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں نے پریشان کر دیا۔ میں نے پاسپورٹ ان کے ہاتھ سے لیے اور کھول کر دیکھنے لگی۔

"عمرے کا ویزا۔ وہ بھی براستہ مدینہ۔" ایک ٹھنڈی یخ سی لکیر میرے سر سے پاؤں تک یوں سرائیت کرتی چلی گئی جیسے پل صراط کی تلوار کی وہ چمکیلی اور تیز دھار۔

"ہائے میرے پاؤں؟" میں نے کراہتے ہوئے نصیر احمد کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیے' اور میرے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا۔

"نصیر احمد میرے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔ میں وہاں پر کیسے جاؤں گی۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

سعدیہ راجپوت

## عشق آتش

### چھٹی قسط ۶

عبداللہ کو سنجیدہ دیکھ کر لوہار بھی اب کچھ سنجیدہ ہوا۔

"مسلاں کدی ایہہ کم کیتا اے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا پھر کہا۔

"یاد نہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی عبداللہ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے، جیسے دماغ پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسے پریشان ہوتا دیکھ کر لوہار جلدی سے بولا۔

"کوئی گل نہیں میں سکھاویاں گا۔" اس کے جملے

**مکمل ناول**

پر وہ خود سے چونکا پھر پہلے کی طرح ہی پرسکون ہو گیا اور اس کے بعد لوہار اسے لوہا پگھلا کر کوٹنے کا طریقہ سمجھانے لگا پھر جب اچھی طرح سمجھا چکا تو عبداللہ کو آزمائشی طور پر ایک کمان کے جیسی مڑی سلاخ پگھلا کر سیدھی کرنے کو دی۔

عبداللہ نے اسے بھٹی میں ڈال کر انگارے کی مانند سرخ کر لیا پھر اسے سل پر رکھ کر ہولڈر سے پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ میں وزن دار ہتھوڑا لے کر تولا۔ ہتھوڑا کافی بھاری تھا اور اسے اٹھا کر پورا ہاتھ اوپر کر کے لوہے پر چوٹ کرنے کے لیے کافی طاقت کی ضرورت تھی یہ کام واقعی مشکل تھا مگر عبداللہ نے ہی نہ چرایا حالانکہ جب اس نے پوری طاقت سے لوہے پر

پہلی ضرب ماری تو لوہے سے نکلتی سرخ چنگاریوں کو دیکھ کر اسے لگا کہ وہ اس کے چہرے اور آنکھوں کو جلا دیں گی بلکہ اس نے تو بے ساختہ ہی اپنا چہرہ بھی بازو میں چھپانے کی کوشش کی تھی مگر دو تین ضربوں کے بعد اسے مزا آنے لگا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آگ کا کھیل کھیل رہا ہو۔

پورا دن گزار کر جب شام میں دکان بند کرنے کا وقت ہو گیا اور لوہار سامان اٹھا اٹھا کر دکان کے اندرونی حصے میں رکھنے لگا تو عبداللہ بیٹھا اپنی چھالوں بھری ہتھیلیوں کو دیکھ رہا تھا اسے یاد آیا کہ اس نے کبھی اتنی مشقت والا کام نہیں کیا تھا۔ سامان اندر کر کے لوہار نے شٹر کھینچ کر گرایا اور تالا لگا دیا پھر وہ عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا اور جیب میں سے کچھ روپے نکال کر کے

بلند عبداللہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ایہہ تیری اج دی دیہاڑی۔" پھر کہا۔

"کل دی آئیں گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"صبح ہی آجاؤں گا۔" اور روپے پکڑ کر گنے بغیر ہی جیب میں رکھ لیے۔

مغرب کی جماعت ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی اور ابھی مولوی عبدالخالق بھی گھر آ گئے تھے جب عبداللہ گھر لوٹا۔

"آؤ عبداللہ آؤ۔ سنا ہے آج سارا دن حیدر لوہار کی دکان پر بیٹھے لوہا پگھلاتے رہے دل پر چڑھا خول بھی پگھلایا یا نہیں۔" اسے دیکھ کر مولوی عبدالخالق نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں مگر سخت تیزی سے کہا۔ پر اس نے

تو جیسے اب ان سے بحث نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ بولتا ہی نہیں تھا۔ پر جب سے وہ چپ ہوا تھا مولوی صاحب بہت بولنے لگے تھے۔ ملانی جی ان کی معنی خیز مسکراہٹ پر دھیان دیے بغیر تیزی سے اٹھ کر عبداللہ کے پاس آگئیں — ان کی اس عجلت کی وجہ عبداللہ کے ہاتھوں کے چھالے تھے جن پر ان کی نظر پڑ گئی تھی۔ پاس آکر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ پریشان ہو کر بولیں۔

"ہائے میرے ربا۔ عبداللہ! یہ کیا ہے۔ تجھ اور کوئی کام نہیں ملا۔" مولوی عبدالخالق پیچھے سے بولے۔

"اسے پتا چلنے دے ہاجرہ کہ اگر لوہے کو بھی سیدھا کرنا ہو تو پہلے اسے بھٹی میں پگھلانا پڑتا ہے تب شاید اس کی عقل میں بات آجائے کہ لوہا ہو سونا ہو یا آدمی — سنوارنے کے لیے سختیوں سے گزارنا ضروری ہے کیونکہ جو پگھلایا گیا ہو وہی سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔" وہ اب بھی ذو معنی انداز میں بات کر رہے تھے۔ عبداللہ نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں اور ملانی جی سے ہاتھ چھڑا کر وہ بچے کے پاس آگیا۔ پھر جیب سے پیسے نکال کر بچے کی مٹھی میں پکڑانے کے بعد وہ کسی کو دیکھے بغیر کمرے سے چلا گیا اس کے جانے کے بعد ملانی جی مولوی عبدالخالق سے بولیں۔

"آپ ہر وقت عبداللہ سے یہ کیا بولتے رہتے ہیں مجال ہے جو آپ کی ایک بھی بات میرے پلے پڑ جائے۔" وہ ملانی جی کو دیکھ کر مسکرائے۔

"لوہے کو اگر پگھلا کر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ٹھنڈا ہونے پر مڑ تڑ جاتا اور اس کی شکل پہلی حالت سے بھی بری ہو جاتی ہے اس لیے گرم لوہے پر چوٹ کرنی پڑتی ہے تاکہ اس کی نئی ہیئت پہلے سے بہتر ہو۔" وہ گہرے لہجے میں معرفت کے اصول سمجھا رہے تھے۔

"چوٹ بھی کر لیجیے گا مگر ابھی تو جا کر اس کے ہاتھوں پر مرہم لگا دیں۔" مولوی صاحب نے سنا تو شکایت کرنے لگے۔

"میں تو مرہم لگانا چاہتا ہوں پر وہ لگوائے تب نا — زخم پر تو ہاتھ نہیں دھرنے دیتا۔" وہ خفگی سے بول کر اٹھے اور دیوار گیر الماری سے مرہم نکال کر ہاتھ میں پکڑے باہر آگئے۔

☼ ☼ ☼

"تجھے میرے ساتھ کھیل کھیلنے میں بہت مزا آتا ہے نا۔ بس ایک آرزو کی تھی اور تو نے میرے دل کو ویران کر دیا — لیکن اب جب میں اپنی آرزو ہی تیاگ چکا اور فنا کے راستے کو تلاش کر رہا تھا تو نے ایک اور آرزو میرے دل میں ڈال دی مگر اب میرے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"عبداللہ۔" وہ صحن میں بچھی ننگی چارپائی پر چت لیٹا تاریک آسمان کو گھورتا ہوا اپنے دل میں اللہ سے مخاطب تھا کہ ملانی جی نے اسے آواز دی۔ اس نے سر گھما کر ہینڈ پمپ پر برتن دھوتی ملانی جی کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بولیں۔

"تو کاکے کے پاس جا کر بیٹھ جا۔ مولوی صاحب تو کب کے نماز پڑھانے چلے گئے ہیں وہ اندر اکیلا — ڈر جائے گا۔" ان کی بات سن کر وہ اٹھا، چپل پہن کر اندر کی طرف بڑھ گیا مگر دروازے پر پہنچ کر اس کے پیر جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے دروازے کے فریم میں اسٹیچو کی طرح ایستادہ اندر کے منظر کو دیکھ کر حسرتیں اس کی آنکھوں میں کروٹ لینے لگیں چارپائی پر سوئے بچے کے قریب وہ کہنی کے بل نیم دراز اس پر جھکی بہت پیار سے سوئے ہوئے بچے کو دیکھ رہی تھی اور بچے کے پیٹ پر رکھا اس کا نازک ہاتھ دھیرے دھیرے اسے تھپک رہا تھا عبداللہ کی موجودگی کو محسوس کر کے اس نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا اور عبداللہ کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے مسکرا کر بچے کی طرف دیکھا پھر عبداللہ کی طرف جیسے کہہ رہی ہو۔

"آگئے ہو تو اپنی امانت سنبھالو۔" اور ایک ادا سے زمین پر پیر رکھ کر بستر سے اٹھ گئی پھر چھوٹے چھوٹے



قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر عبداللہ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے گئے جیسے اس کے ہر قدم کے ساتھ عبداللہ کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ عبداللہ نے اس سے نظر ہٹاتے ہوئے نگاہ کو جھکا لیا۔ وہ چلتی ہوئی عبداللہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی عبداللہ نے نگاہ نہیں اٹھائی مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے چہرے پر عبداللہ کو دیکھتے ہوئے فدا ہو جانے والی مسکراہٹ ہے۔ عبداللہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا مگر چوڑے دروازے میں اتنی جگہ تو تھی کہ اس جیسی دبلی پتلی لڑکی ترچھی ہو کر اس کے برابر سے نکل جاتی۔ وہ چند سیکنڈ عبداللہ کا چہرہ دیکھتی رہی پھر سمٹ کر اس کے سامنے سے ہو کر نکل گئی۔

وہ اس کے اتنے پاس سے ہو کر گئی تھی کہ عبداللہ با آسانی اس کا ہاتھ تھام سکتا تھا اس کے لباس کی سرسراہٹ نے عبداللہ کو مضطرب بھی کیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ بڑھایا تو دونوں کے درمیان وہ چند انچ کی دوری کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلوں میں بدل جائے گی۔ وہ چلی گئی تو بھی عبداللہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے پلٹ کر دیکھتا ہے وہ اب وہاں نہیں تھی یہ پہیلی عبداللہ کے لیے ایسے ہی تھی کہ کوئی اس کے جبڑے کے راستے ایک سلاخ اس کی کھوپڑی میں گھسا کر زور سے ہلائے کہ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھے۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

بچوں کے سبق پڑھنے کی آوازوں کے بیچ عبداللہ چٹائی پر بیٹھا ایک بچے کو سائنس کا مضمون سمجھا رہا تھا اب یہ اس کی روٹین بن چکی تھی پہلے وہ مغرب کے بعد دکان سے گھر آتا اب عصر کے بعد ہی آجاتا تھا اور محلے کے بچوں کو فری آف کوسٹ ٹیوشن پڑھاتا۔ یہ ذمہ داری عبداللہ نے خود قبول نہیں کی تھی بلکہ مولوی صاحب نے غیر محسوس انداز میں اسے اس روٹین میں شامل کر لیا تھا۔ اس دن دکان پر کام زیادہ نہیں تھا اس لیے عبداللہ بھی جلدی فارغ ہو گیا گھر آیا تو مولوی عبدالخالق بچوں کے درمیان بیٹھے انہیں پڑھا رہے تھے ساتھ میں دکان بھی کھول رکھی تھی جب کوئی گاہک آکر آواز لگاتا تو مولوی صاحب اٹھ کر دکان میں چلے جاتے پھر گاہک کو فارغ کر کے واپس صحن میں آکر بچوں کو پڑھانے لگتے۔ عبداللہ آیا تو ہاتھ منہ دھو کر صحن میں ہی چارپائی بچھا کر لیٹ گیا۔ مولوی عبدالخالق گاہے بگاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتے تبھی ایک گاہک نے دکان کے کاؤنٹر پر آکر آواز لگائی تھی مولوی صاحب کو بہانہ ہاتھ آگیا فوراً اسے آواز دے کر پاس بلایا۔

"عبداللہ ادھر آ۔" وہ اٹھ کر پاس آیا تو بولے۔

"تم تنویر کو حساب کا سوال سمجھا دو میں گاہک کو دیکھ لوں۔"

"مگر مولوی صاحب میں۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تو وہ ڈپٹ کر بولے۔

"مشکل سے ایم اے، بی اے لگتا ہے دوسری کلاس کے بچے کو حساب کا سوال بھی نہیں بتا سکتا۔ جا تنویر عبداللہ تجھے حساب کا سوال سمجھا دے گا۔ اسے ویسے بھی حساب کتاب کا بڑا شوق ہے۔ احمق نے اللہ کے ساتھ بھی کھاتہ کھول رکھا ہے۔" وہ بچے سے کہہ کر آخر میں کھل کر بولے تھے۔ بچے نے فوراً اپنی کاپی مولوی عبدالخالق کے قریب زمین پر بیٹھے عبداللہ کی ران پر رکھ دی مولوی عبدالخالق اٹھ کر جا چکے تھے اور بچہ منہ اٹھائے اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ گہرا سانس بھر کر کاپی پر لکھے سوال کو یوں دیکھنے لگا جیسے عجوبہ ہو۔ تقسیم کا وہ آسان سا سوال بھی عبداللہ کو لگا کہ وہ نہیں کر پائے گا اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کو حل کس طرح کرنا ہے مگر جب اس نے بچے کے ہاتھ سے پنسل لے کر سوال کرنا شروع کیا تو بنا ہاتھ روکے اس نے ایک بار میں ہی سوال حل کر دیا پھر تو بچہ مچل ہی گیا اور باقی سوال حل کرنے کی فرمائش کر دی۔

"یہ سوال بھی حل کر دیں ماسٹر جی نہیں تو کل

اسکول میں یاد پڑے گی۔"

"میں تمہیں طریقہ سمجھاتا ہوں سوال تم خود حل کرو۔" وہ کہہ کر بچے کو سمجھانے لگا پھر اسے فارغ کیا تو دوسرے بچے بھی اپنی کتابیں کاپیاں لیے اس سے سبق پوچھنے چلے آئے۔ اندر دوکان میں مولوی صاحب گاہک کو دو کلو آٹا تول کر دے چکے تھے اور اس سے پیسے بھی لے چکے تھے مگر ٹائم پاس کے لیے بیٹھے اس سے باتیں بگھارنے لگے تھے انہوں نے جو باہر کا منظر دیکھا تو مسکرا کر دل میں بولے۔

"کل تک جو رسیاں تڑا رہا تھا اب کیسے کام پر لگ گیا ہے۔ واہ مالک تیرے کام نرالے ہیں۔" بچوں کو مولوی صاحب کے پر شفقت انداز کے مقابلے عبداللہ کے نپے تلے انداز میں کشش محسوس ہوتی تھی وہ یوں بھی گاؤں والوں کے لیے مسٹری مین تھا اور یہی چیز اس کے متعلق تجسس کو ابھارتی تھی۔

بچوں نے فرمائش کردی کہ کل سے عبداللہ ہی اسکول کا کام کرائے اور عبداللہ انکار نہیں کر سکا اب تو وہ گاؤں میں ماسٹر عبداللہ کے نام سے جانا جانے لگا تھا نماز کا وقت قریب آیا تو مولوی عبدالخالق نے دوکان بند کردی اور صحن میں آکر وضو کرنے لگے۔ وہ دروازے سے نکلنے لگے تھے کہ ایک خیال آیا تو مڑ کر عبداللہ کو دیکھنے لگے۔ صحن میں موجود چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر سارے بڑے بچے نماز کے لیے بستے سپارے بند کر کے وضو کرنے لگے تھے پر عبداللہ آرام سے بیٹھا تھا۔

"عبداللہ۔" وہ آواز دے کر بولے۔

"چل اٹھ وضو کر ذرا دیر میں جا کر اذان دے دوں گا تجھے نماز نہیں پڑھنی۔"

ان کا خیال تھا کہ اگر وہ نماز پڑھنے نہ بھی اٹھا تو بھی چپ رہے گا۔ اس کی آنکھیں اچانک ہی بہت سرخ ہو گئیں اس نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا پھر پتھریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" یہ ایک لفظ کہہ کر اس نے سر جھکایا اور بچے کی کتاب میں سے سبق پڑھ کر اسے یاد کرانے لگا۔

"بہت سخت ناراض ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں ہم منالیں گے۔" اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے دل میں کہا اور مسجد کی طرف جانے کو دروازے سے نکل پڑے۔

☼ ☼ ☼

"مولوی صاحب آپ عبداللہ پر کچھ دم درود کیوں نہیں پھونکتے۔"

ملانی جی نے کہا تو وہ بولے۔ "کیسا دم درود۔"

"میں کیا جانوں۔" انہوں نے کندھے اچکا دیے پھر کہا۔

"لیکن مجھے لگتا ہے مولوی صاحب کہ عبداللہ پر جنات کا قبضہ ہے۔"

"اچھا۔" وہ محظوظ انداز میں ہنس پڑے۔

وہ جون کی گرم رات تھی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی جس سے حبس بڑھ گیا تھا۔ عبداللہ پیپل کے درخت کے نیچے چٹائی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا تھا اور پچھ واگر میں اس کے آس پاس منڈلا رہا تھا وہ گھوم پھر کر عبداللہ کے پاس آتا تو عبداللہ ہلکے سے دھکیلے سے وہ واگر پیچھے دھکیل دیتا لیکن وہ دوبارہ واگر عبداللہ پاس آجاتا تو دونوں ہنسنے لگتے۔ مولوی صاحب صحن میں بچھی چارپائی پر سونے لگے تھے ملانی جی ساتھ والے بستر پر بیٹھی تھیں جب وہ مولوی عبدالخالق سے عبداللہ کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرنے لگیں۔ جسے مولوی صاحب نے ہنسی میں اڑا دیا گو وہ ابنا بہت سنجیدگی سے کہتی گئیں۔

"آپ کیا کہوں مولوی صاحب کہ میں نے عبداللہ میں کئی بھی عجیب باتیں محسوس کی ہیں۔ اچھا بھلا بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا ہے کہ اچانک ہی کسی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہاں کوئی ہو پھر اس کی حالت عجیب ہو جاتی ہے چہرہ تن جاتا ہے اور آنکھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خدانخواستہ جان کنی کا عالم ہو اس کے بعد الگ تھلگ گوشے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے میں نے کئی بار چھپ کر دیکھا ہے کہ یوں

کونوں میں منہ چھپا کر بیٹھ کر وہ آنسوؤں سے روتا ہے سچ کہتی ہوں مولوی صاحب اتنے جوان مرد کو روتے دیکھ کر میرا تو دل بھینچ جاتا ہے یہ حرکات یہاں ختم نہیں ہوتی میں نے اکثر اسے تنہائی میں کسی سے باتیں کرتے دیکھا ہے پھر ابھی شام میں کیا ہوا۔ چلو نماز نہیں پڑھتا روزے بھی نہیں رکھتے پر بہت سے لوگ ہیں جو نماز روزے کے معاملے میں غفلت کرتے ہیں لیکن کوئی اس طرح تو نماز کے لیے منع نہیں کرتا جس طرح آج عبداللہ نے کیا۔ اس کا لہجہ سن کر تو ایسا لگ رہا تھا کہ آپ نے اسے کوئی بہت ہی مشکل کام کرنے کو کہہ دیا ہو۔ میں نے سنا ہے۔ جس پر جنات قبضہ کرلیں اسے نماز روزے سے روک دیتے ہیں کیونکہ ان کا وجود ناپاک ہوتا ہے اس لیے جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے یہ وہاں نہیں ٹھہر پاتے۔" ان کی باتیں سنتے مولوی صاحب اٹھ بیٹھے تھے اور گہری نظروں سے عبداللہ کو دیکھنے لگے جب ملانی جی خاموش ہوئیں تو سانس بھر کر دھیمے لہجے میں بولے۔

"جنت تو ہے اس پر مگر جنات کا نہیں ہے۔" وہ نا سمجھی سے جھنجلا کر بولیں۔

"چلیں جس کا بھی ہو پر دم درود کر کے اس کی جان چھڑائیں۔"

"جس نے اپنی جان وار دی وہ بھلا اس کی جان کیوں چھوڑے۔" ہلکی سرگوشی میں بول کر وہ ملانی جی سے کہنے لگے۔

"تو نہ سوچا کر ان باتوں کو وہ روئے یا باتیں کرے تیرا کیا نقصان ہے۔" پھر پیپل کے درخت کی طرف منہ کر کے زور سے بولے۔

"عبداللہ آکر سوجا بہت رات ہو گئی ہے۔" ان کی بات سن کر وہ فوراً اٹھ گیا اور بچے کو بھی واگر سے نکال کر گود میں لیتا ملانی جی کے پاس آیا اور بچہ ان کی گود میں دے کر اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

نور الہدیٰ نے گاڑی پورچ میں لے جا کر روکی پھر وہ اور مریم ساتھ ساتھ چلتے قصر فاروقی میں داخل ہو گئے۔ نور الہدیٰ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے لاؤنج میں لے آئے۔

"تم بیٹھو میں بابا جان کو بلا کر لاتا ہوں۔" اسے بٹھا کر وہ بابا جان کو بلانے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو مریم ان کے ساتھ گرے بالوں والے سرخ و سفید رنگت کے بارعب شخص کو دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی جنہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ یقیناً فوجی رہے ہوں گے سفید شلوار کرتے میں ملبوس ان کے پیروں میں کالے رنگ کے سادہ سے چپل تھے اور آنکھوں پر سنہرے فریم والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ مریم ایک ہی نظر میں ان سے متاثر ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم انکل۔" وہ عام طور پر "ہیلو" سے کام چلاتی تھی پر ان کی شخصیت کا رعب تھا کہ ادب سے سلام کرتے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹھو۔" "شکریہ بیٹھ چکے تو مریم نے کہا۔

"میں بتا نہیں سکتی انکل کہ آپ سے مل کر کتنا اچھا لگ رہا ہے پر ساتھ میں افسوس بھی ہو رہا ہے کہ میں آپ سے پہلے کیوں نہیں ملی مگر غلطی میری نہیں ہے میں نے نور الہدیٰ سے کئی بار کہا تھا کہ آپ سے ملوا دے پر یہ سنتا ہی نہیں اور آج بھی یہ تو ٹال مٹول ہی کر رہا تھا پر میں زبردستی اس کے ساتھ چلی آئی۔"

"بہت اچھا کیا۔" بابا جان دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"اور میں تو آپ کے گھر کو دیکھ کر بہت امپریسڈ ہوں۔ قصر فاروقی واقعی کسی محل کی طرح خوبصورت ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوشدلی سے کہہ رہی تھی۔

"محل خوبصورت تو ہوتے ہیں مگر ویران سے لگتے ہیں۔" بابا جان کا لہجہ تھکن بھرا تھا مریم جلدی سے بولی۔

"لیکن مجھے قصر فاروقی تو ویران نہیں لگتا۔ ہاں بس یہاں خاموشی بہت ہے پر اس کی بھی وجہ ہے گھر میں بس آپ اور نور الہدیٰ ہی تو ہیں بلکہ اصل میں تو آپ ہی ہوتے ہیں نور الہدیٰ تو آدھی رات تک باہر ہوتا ہے۔ ایسے میں خاموشی تو ہوگی ہی۔" بابا اور چائے لے آیا تھا مریم نے اسے کہا۔

"چائے میں بناؤں گی تم جاؤ۔" اس نے بابا جان کو دیکھا پھر ان کے اشارے پر ٹرالی چھوڑ کر چلا گیا۔ مریم نے ٹرالی اپنے سامنے کھسکائی اور چائے بنانے لگی۔

"یہ لیجیے ایک کپ آپ کا دوسرا میرا۔ اور نور الہدیٰ تو چائے پیتا نہیں۔" اس نے دو کپ چائے بنا کر ایک کپ بابا جان کو پکڑایا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر صوفے پر پیچھے ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"نور الہدیٰ سگریٹ اور سگار نہیں پیتا تو وجہ سمجھ میں آتی ہے یہ صحت کے لیے مضر ہیں پر چائے سے پرہیز سمجھ نہیں آتا۔"

"تم کیا کرتی ہو۔" بابا جان اس کے تبصرے کو نظر انداز کرکے بولے اور وہ چنچل سی مسکراہٹ کے ساتھ نور الہدیٰ کو دیکھ کر بولی۔

"پہلے کچھ نہیں کرتی تھی لیکن اب نور الہدیٰ کا سر کھاتی ہوں۔" نور الہدیٰ نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تو اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"تم کیوں چپ ہو کچھ بولتے کیوں نہیں۔"

"میں بول کر کیا کروں گا تم بابا جان سے ملنے آئی ہو۔ ان سے باتیں کرکے جان پہچان بڑھاؤ۔ میں تو انہیں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" ان کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار کو محسوس کرکے مریم کو بہت عجیب لگا اس نے آج تک نور الہدیٰ کو اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تو اسے لگا اسے وہم ہوا ہے پر بابا جان کا چہرہ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ زہر کے اثر سے ان کا تنفس رکنے لگا ہو ہاتھ کی لرزش پر بمشکل قابو پا کر انہوں نے کپ رکھا اور اٹھ گئے۔

"تم لوگ باتیں کرو میں اب اپنے کمرے میں چلوں گا۔" انہوں نے سنبھل کر مریم سے کہا اور چلے گئے۔

مریم کو یہ سب بہت عجیب لگا مگر نور الہدیٰ سے اس بارے میں بات نہیں کر سکتی تھی یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا مگر وہ الجھ ضرور گئی تھی۔ اس نے چائے کا کپ سائیڈ میں رکھا اور اپنی کیفیت کو نارمل کرنے کے لیے اٹھ کر دیوار پہ لگی تصویریں دیکھنے لگی۔

نور الہدیٰ نے اسے تصویروں کی طرف متوجہ دیکھا تو اس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر بتانے لگے۔

"یہ میاں جی ہیں۔"

"تمہارے دادا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں اور ان کی رائٹ سائیڈ پر بابا جان ہیں اور لیفٹ پر پاپا۔" وہ چونک کر مڑی اور کہا۔

"یہ بابا، پاپا کا کیا چکر ہے۔"

"بابا جان میرے چچا ہیں میرے اپنے پیرنٹس کا انتقال تو تبھی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہو گیا تھا جب میں تین سال کا تھا۔" نور الہدیٰ نے بتایا تو متاسف انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس او کے۔" انہوں نے کہا۔

"امی اور بابا جان نے مجھے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ ویسے بھی میں اس وقت اتنا چھوٹا تھا کہ اپنے والدین کے چہرے بھی مجھے یاد نہیں ماں باپ کے رشتے میں میں نے ہمیشہ امی اور بابا جان کو ہی دیکھا ہے۔" ان کی باتوں کو سن کر مسکرائی مریم کو یقین ہو گیا کہ اس نے جو کچھ دیر پہلے محسوس کیا تھا وہ صرف اس کا وہم ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اب ایک دوسری تصویر کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہ تصویر بہت انٹرسٹنگ ہے اس دن میں پہلی بار کھڑا ہوا تھا لیکن بابا جان بتاتے ہیں کہ جتنی دیر میں بابا کیمرا لے کر پہنچے میں گر چکا تھا۔" مریم نے اس تصویر کو دیکھا جس میں ایک بچہ زمین پر گرا منہ بسور رہا تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

"یہ امی کی تصویر ہے یہ میں نے اس دن کھینچی تھی جب میں لندن جا رہا تھا اور جانتی ہو میں نے کیا کیا۔" وہ



مزے سے بولے۔

"کیا کیا؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"میں نے کیمرے میں سے ریل نکالی اور چھپا کر اپنے ساتھ لندن لے گیا پھر دو سال پہلے میرے پاکستان آنے کے بعد ہی یہ تصویر پاکستان پہنچ سکی۔" مریم نے دلچسپی سے مسکراتے ہوئے ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"یہ تم ہو نا۔" نور الہدیٰ نے اس تصویر کو دیکھ کر اثبات میں جواب دیا۔

"دیکھا کتنی آسانی سے تمہیں پہچان لیا۔" وہ ناز سے بول کر ہنسی پھر دوبارہ سے تصویر کو دیکھنے لگی۔

"یہ اتنی کیوٹ سی بے بی کون ہے۔" سات آٹھ سال کے نور الہدیٰ کی گود میں پھولے پھولے گالوں والی بچی کی طرف اشارہ کرکے مریم نے پوچھا۔ نور الہدیٰ بہت دلچسپ انداز میں اسے تصویریں دکھا رہے تھے اس تصویر کو دیکھ کر ان کا لہجہ سست ہو گیا۔

"یہ ملیحہ ہے۔ بابا جان کی بیٹی۔"

"اچھا۔" وہ مگن سی بول کر مزید تصویریں دیکھنے لگی۔

"یہ ضرور ملیحہ ہو گی۔" اس نے ایک نوجوان لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔

"ہاں۔" وہ اس تصویر کو دیکھ کر آہستگی سے بولے۔

"ویری پریٹی۔ اب تو اس سے ملنا پڑے گا۔ جاؤ بلا کر لاؤ۔ اور تم نے اب تک مجھے اپنی کزن سے ملوایا کیوں نہیں۔" وہ پلٹ کر لڑنے کے سے انداز میں نور الہدیٰ سے بولی تو نور الہدیٰ نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظر چراتے ہوئے کہا۔

"ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولی۔

"واٹ؟ کیا کہا تم نے۔" نور الہدیٰ نے اسے دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔ وہ ان کے دیکھنے سے سمجھ گئی کہ اس نے جو سنا صحیح سنا تھا اس نے افسوس بھری نظر اس نوجوان لڑکی کی تصویر پر ڈالی۔

"یقین نہیں آتا چھوٹی عمر میں۔ کیا کوئی حادثہ ہوا تھا۔"

"مریم پلیز۔" بمشکل خود پر ضبط کرتے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مریم کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

"اس بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ اٹس پرسنل۔"

"آئی ایم سوری۔" اس نے جلدی سے کہا مگر نور الہدیٰ کی حالت نہیں سنبھلی وہ پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ظاہر نہیں کیا تھا مگر مریم نے محسوس کر لیا کہ بے چینی ان کے وجود میں پھیل گئی تھی۔ ایک کزن کی موت پر اتنا صدمہ... وہ بھی اس کے انتقال کے اتنے عرصے بعد... مریم کو یہ سب نارمل نہیں لگا۔ وہ اندیشوں میں الجھی نور الہدیٰ کے برابر جا بیٹھی پھر اچانک ہی اس نے کہا۔

"میں کسی کی محبت میں مبتلا ہوں۔" نور الہدیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر یہ انکشاف کرتے ہوئے چمک نہیں بلکہ کشمکش تھی پھر بولے۔

"مبارک ہو۔"

"تم مجھ سے اس کا نام نہیں پوچھو گے۔" وہ اب انہیں دیکھ رہی تھی۔ نور الہدیٰ نے پل بھر کے توقف کے بعد کہا۔

"نہیں۔" جواب غیر متوقع تھا وہ حیرت سے بولی۔

"کیوں؟" نور الہدیٰ نے سر جھکا کر کچھ دیر غور کیا پھر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

"کیونکہ ہو سکتا ہے میرے ساتھ زندگی گزارنا تمہارے لیے مشکل ہو جائے۔" وہ دنگ رہ گئی۔ اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ نور الہدیٰ اس کے دل میں چھپے راز تک پہنچ گئے ہیں۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے۔" وہ اس سے نظر چرا کر اٹھے اور ٹہلتے ہوئے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑے ہوئے یوں لگ رہا تھا انہیں بولنے کے لیے مہلت کی ضرورت ہے۔ کھڑکی سے باہر لان میں بکھری دھوپ کو دیکھ کر وہ گویا ہوئے۔

"میں ملیحہ سے محبت کرتا تھا۔ کرتا ہوں۔ اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔" کچھ سیکنڈ پہلے مریم کے ذہن

میں اسپارک تو ہوا تھا مگر نور الہدیٰ کی زبان سے اعتراف شاکنگ تھا۔ وہ کرتے گئے۔

"موت بھی ملیحہ کے لیے میرے احساسات کو بدل نہیں سکی۔ تمہیں شاید عجیب لگے کہ کوئی کسی مرے ہوئے شخص سے کیسے محبت کر سکتا ہے مگر زندگی اور محبت میں یہی تو فرق ہے کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن محبت ختم نہیں ہوتی۔ ہمارا رشتہ بہت انوکھا تھا اور ہماری محبت بہت پاکیزہ اور خوبصورت۔ بالکل ملیحہ کی مسکراہٹ کی طرح۔ بے ریا اور خالص۔ ہمارے درمیان پانے کا نہیں۔ دینے کا رشتہ تھا۔ اور ملیحہ کو دینے کے لیے میرے پاس سب سے قیمتی چیز میری محبت تھی اور میں نے اپنی محبت کو اس پر بے دریغ لٹا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈال دوں۔ اگر میری زندگی اس کی ایک مسکان کی قیمت ہوتی تو میں کھڑے کھڑے جان دے دیتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ مجھے اس کی پروا تھی۔ میں بس اس کا خیال رکھنا چاہتا تھا۔ دل چاہتا کہ اسے یوں ہاتھوں میں سنبھالوں جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔" انہوں نے بولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلائے جیسے ان میں کوئی قیمتی مگر نازک سی شے چھپا رکھی ہو۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں کو الگ کر کے دیکھنے لگے۔

"مگر میں اسے سنبھال نہیں سکا مریم۔" شکست خوردگی سے کہہ کر انہوں نے اپنے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے پھر دور لان میں دیکھتے ہوئے آزردگی سے کہا۔

"دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس لفت کا بدلوا کر سکے۔" وہ اب خاموش ہو چکے تھے پھر بھی رخ موڑے کھڑے رہے۔ وہ اس نمی کو چھپانا چاہتے تھے جو ان کی آنکھوں میں تیرنے لگی تھی۔ مریم پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جن کا عکس اس کی آنکھوں کی تیرگی میں دھندلا گیا تھا۔ چاہے جانے والے شخص کی زبان سے کسی اور کے لیے چاہت کا اعتراف سننا ننگے پاؤں انگاروں پر چلنے سے زیادہ کٹھن ہے۔

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ تم نے اپنے دل کے گرد اونچی اونچی فصیلیں تان رکھی ہیں۔ میں چاروں طرف چکر کاٹتی رہتی پر اندر جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ اب سمجھ میں آیا ہے تمہارے دل کے دروازے بھلا مجھ پر کیسے کھل سکتے تھے، وہاں تو ملیحہ پہلے سے ہی موجود تھی۔"

"وہاں اب تم بھی آچکی ہو۔" نور الہدیٰ نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا، جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے جنہیں انہیں پونچھنے کا خیال تک نہیں آیا۔ نور الہدیٰ کے اس انکشاف پر خوش ہونے کے بجائے اس نے ایسے انہیں دیکھا جیسے تکلیف کئی گنا بڑھ گئی ہو۔ وہ چلتے ہوئے اس کے قریب قالین پر بیٹھے اور اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگے۔

"میرے دل کے سب در و دیوار تمہارے ہیں، بس ایک کونا ملیحہ کے نام پر مخصوص ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں نے ملیحہ سے کبھی کچھ پانا نہیں چاہا مگر تم سے دنیا کا ہر سکھ پانا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں دل کا سکون پانا چاہتا ہوں۔ بہت گہرا زخم لگا ہے دل پر، لیکن تم ساتھ رکھو گی تو شاید کبھی یہ زخم بھر جائے۔ محبت کر سکتا ہوں تم سے لیکن مجھے اس پر اختیار نہیں کہ ملیحہ سے محبت نہ کروں اور میں جانتا ہوں کہ شراکت داری تم سے جھیلی نہیں جائے گی۔" لگتی کہہ کر انہوں نے مریم کے ہاتھ چھوڑنا چاہے مگر مریم نے انہیں اپنے ہاتھ چھوڑنے نہیں دیے اور ان کے ہاتھوں پر اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کرتی وہ سسکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جھوٹے کی بات نہ کرنا۔ نور الہدیٰ میں شراکت داری برداشت کر لوں گی پر تمہارا دور جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو گا اور پھر ملیحہ زندہ تو نہیں ہے، مر چکی ہے، کیا فرق پڑے گا اگر تمہارے دل کے کونے میں پرانے سکوں کی مانند کچھ یادیں پڑی بھی رہیں تو۔ تمہارے دل کے باقی گلی کوچے تو میرے لیے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھی کہ لے فرق نہیں پڑے گا مگر ان کے



ہاتھوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہی تھی۔ نور الہدیٰ نے نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کے سارے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیے، پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟" اور اقرار میں سر ہلاتی مریم ان کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ایک بار پھر رو پڑی۔

"دیکھیے گا میرے جانے کے بعد آپ کی بیگم آکر مجھے ری پلیس کریں گی۔" ملیحہ کی آواز نور الہدیٰ کے ارد گرد گونج رہی تھی۔

ایک ماہ بعد مریم یزدانی نے مسز نور الہدیٰ فاروقی بن کر قصر فاروقی میں قدم رکھ دیے تھے۔ لان کے نیم تاریک گوشے میں تنہا کھڑے نور الہدیٰ روشنیوں سے سجے قصر فاروقی کو بڑی یاسیت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دو سال پہلے کی ایک ایسی ہی رات کا منظر کسی فلم کی طرح گھوم رہا تھا اور اس رات کی باتیں انہیں ایک ایک کر کے یاد آتی گئیں۔

"کوئی شخص تمہارا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔" دکھ جب ایک بار وجود میں گھر کر لے تو پھر کوئی خوشی خوشی نہیں دیتی۔ وہ اپنے دکھ کی دوا لینے مریم کے پاس چلے آئے۔ وہ غیر روایتی سی لڑکی ان کے انتظار میں روایتی انداز میں دلہن بنی چہرے پر گھونگھٹ ڈال کر بیٹھی تھی۔ نور الہدیٰ اس کے قریب بیٹھ گئے تو اپنی بولڈنیس کے باوجود وہ خود میں سمٹ گئی۔ نور الہدیٰ اس کی شرم کو دیکھ کر مسکرانے لگے، پھر انہوں نے دھیرے سے اس کے گھونگھٹ کو الٹ دیا۔

سرخ کامدانی دوپٹے کے ہالے میں اس کا سجا سنورا روپ دو آتشہ تھا۔ شرم سے نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔ چہرے پر گھبراہٹ لیے ہونٹوں میں مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھتے دیکھتے نور الہدیٰ کھو سے گئے۔

انہیں دلہن بنی ملیحہ کا چہرہ یاد آگیا، اس کی پلکیں نم تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ نیم وا ہونٹوں میں کپکپاہٹ تھی اور چہرے سے پسینہ جھلک رہا تھا۔ وہ ان کی بانہوں میں عالم نزع سے گزر رہی تھی۔ لب کاٹتے ہوئے نور الہدیٰ نے اپنے بائیں پہلو پر اس جگہ ہاتھ رکھا جہاں اپنے سینے پر انہوں نے ملیحہ کی آخری دھڑکنوں کو محسوس کیا تھا اور پھر سینے کے اندر ان کے اپنے دل کی دھڑکنیں ان بے ترتیب دھڑکنوں کی تال میں ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھیں۔

"رشتے جب بنائے جاتے ہیں نور الہدیٰ تو انہیں نبھایا کرتے ہیں۔" ایک آواز نے ان کے ذہن میں ابھر کر انہیں سرزنش کی تھی۔ وہ دفعتاً سنبھلے، پھر کوٹ کی جیب سے چھوٹی مخملیں ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکالنے کے بعد ڈبیا سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر مریم کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں اس رشتے کو آخری سانس تک نبھاؤں گا۔" مریم کی مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر انہوں نے اس کے ہاتھ کی پشت کو چوما، پھر پلکیں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں انہوں نے ملیحہ سے وعدہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عبداللہ گہری نیند میں تھا، جب اس کے احساسات اچانک بے دار ہو گئے۔ اسے یوں لگا کہ کوئی اس کے بستر پر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا ہے، پھر کسی نے جھک کر اس کی پیشانی پر آئے سیاہ بالوں کو پھونک مار کر ہٹا لیا تھا۔ عبداللہ نے سوتے جاگنے کی کیفیت میں اپنے چہرے پر کسی کی گرم مہکتی سانس کو محسوس کر کے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چہرہ اس کے اتنے پاس تھا کہ عبداللہ چاہتا تو اس کی سنہری پلکوں کی گھنی جھالروں کو گن سکتا تھا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ وہ سامنے کی طرف بیٹھی ایک ادا سے اسے دیکھ رہی تھی، پھر اس نے اپنا ہاتھ دھیرے دھیرے بستر پر کھسکانا شروع کیا اور عبداللہ کے ہاتھ کے بالکل پاس لے جا کر روک دیا، پھر پلکیں اٹھا کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے چاہ رہی ہو کہ درمیانی فاصلہ خود ختم کر دے۔

عبداللہ کا سانس سینے میں رکا جا رہا تھا اس نے اپنے ہاتھ کے پاس رکھے اس کے ہاتھ کو دیکھا پھر جیسے ہی عبداللہ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ عبداللہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

"جب قریب نہیں آنا تو پاس بھی کیوں آتی ہیں۔ جھلک دکھا کر چھپ جانا بس آپ کو یہی ہنر تو آتا ہے۔ سب کو چین قرار ملے بس کبھی میرے ہی دل پر ہاتھ نہیں رکھا مجھے تڑپا کر بہت سکون ملتا ہو گا۔" پاس سوئے ہوئے مولوی عبدالخالق کے شانے پر کسی نے ہاتھ مارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے پھر ملانی کو اپنے بستر پر بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ادھر دیکھیں مولوی صاحب عبداللہ کو پھر دورہ پڑا ہے۔" ان کے اشارے پر انہوں نے پیپل کے درخت کے نیچے الگ تھلگ بچھی عبداللہ کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر بیٹھا سرہانے کی طرف یوں دیکھ کر آہستہ آواز میں بات کر رہا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔

"آج تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا مولوی صاحب اب تو میری بات کا یقین کریں گے۔"

"تو سو جا آرام سے میں جا کر دیکھتا ہوں۔" انہوں نے کہا پھر بستر سے نکل کر چپل پہنتے ہوئے عبداللہ کی طرف آ گئے۔ ملانی جی بھی اٹھ کر اپنے بستر پر جا لیٹیں ابھی سردیاں پوری طرح سے نہیں آئی تھیں پر رات میں ہلکی خنکی کی وجہ سے صحن میں سوتے ہوئے گرم کھیس لینے پڑتے تھے۔ ملانی جی نے بستر پر لیٹ کر کھیس اچھی طرح بچے پر پھیلایا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔

"کیوں خود کو ہلکان کرتا ہے عبداللہ۔" مولوی عبدالخالق پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ عبداللہ نے یوں ان کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا جیسے ڈوبتے ہوئے شخص کو سہارا نظر آ گیا ہو۔ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مولوی عبدالخالق سے کہا۔

"ان سے کہیں مولوی صاحب یہ یہاں سے چلی جائیں۔ میں مان چکا یہ میرے نصیب میں نہیں پھر کیوں مجھے سراب دکھاتی ہیں۔" وہ دردمندی سے مولوی صاحب کا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ سرسراہٹ محسوس کر کے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اٹھ کر جانے کے لیے مڑ گئی تھی عبداللہ بے تابی سے اسے آواز دینے کو اٹھا اور اسے روکنے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا پھر جانے کیا ہوا کہ ہاتھ پہلو میں گرا کر اس نے آزردگی سے آنکھیں بند کر کے چہرہ موڑ لیا جیسے کسی تکلیف دہ منظر سے آنکھیں بچانا چاہتا ہو۔ مولوی عبدالخالق نے اسے مترحم نظروں سے دیکھا اور بولے۔

"جس کی آنکھوں میں حقیقت چبھتی ہو وہ سراب کا پردہ بصارت پر گرا لیتا ہے۔ جو سراب سے عاجز آ جائے وہ حقیقت کی طرف لوٹ جاتا ہے پر تو تو دونوں سے بھاگ رہا ہے۔ تیرا کیا بنے گا عبداللہ۔" ان کی بات پر اس کا احساس شکست اور بڑھ گیا تھا۔ وہ تھک کر چارپائی پر جا بیٹھا۔

"کوئی ایسا امرت لا دیں مولوی صاحب جس کے چھینٹوں سے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے سکون مل جائے مجھے۔" مولوی صاحب نے اسے دیکھا جو چارپائی کے کناروں کو پکڑ کر آگے کو جھکا زمین کو ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سکون ڈھونڈنے سے نہیں مانگنے سے ملتا ہے۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"اس سے سکون مانگ عبداللہ جس کے نام سے دلوں کو راحت ملتی ہے۔"

"وہ بندے سے بڑا ہے مرضی سے دیتا ہے ورنہ میرے مانگنے میں تو کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ پر اپنے دردوں سے زیادہ ان کی تکلیف ستاتی ہے۔ اس نے بے قصور انہیں آزمائشوں میں لپیٹا تھا اور وہ آخری سانس تک اس کی مدد کے آسرے پر رہیں پر اس نے مدد نہیں کی۔" اس نے طنز سے کہا تو مولوی صاحب کو جلال ہی آ گیا طیش میں آ کر بولے۔



"تو شکوے کر کر کے تھکا نہیں عبداللہ۔ ہاں نہیں دیا اس نے تجھے وہ جو تو نے مانگا تھا پر یہ بھی تو دیکھ تو نے مانگا کیا تھا۔" عبداللہ کی سوالیہ نظروں پر وہ کہنے لگے۔

"بندے تو سبھی ہوتے ہیں عبداللہ پر بندگی کا سلیقہ کسی کسی میں ہوتا ہے۔ سر تو بہت سے جھکتے ہیں جب آزمائش کی دودھاری تلوار گردن کو کاٹنے لگے تو کتنے ہی سر اپنے آپ اٹھ جاتے ہیں پر سجود کا حق تب ادا ہو کہ سر نہ اٹھے چاہے گردن کٹ کر جا گرے۔" انہوں نے توقف کیا پھر گمبھیر آواز میں بولے۔

"بندگی کا سلیقہ تھا اس میں جتنی آزمائش بڑھی اس نے اتنا صبر بڑھایا پھر گردن کٹ کر گری تو گری پر اس کا سر نہیں اٹھا اور تو... تو نے ایک چوٹ کیا کھائی معبود سے منہ موڑ لیا۔ او جھلیا دیکھ تو سہی تیرا سوال تیری حیثیت سے بڑا تھا پھر تیری طلب تیرے دامن میں کیسے سماتی پر یہ بات تیری عقل میں نہیں آئے گی کیونکہ عقل کے دروازے تو تو نے بند کر رکھے ہیں۔" وہ یک ٹک مولوی صاحب کو دیکھتا دم سادھے بیٹھا تھا چند پلوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئے۔

"بندے کی نظر کمزور ہوتی ہے وہ صرف ناک کی سیدھ میں دیکھ سکتا ہے۔ دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف نظر جاتی ہی نہیں اگر جا پاتی تو تجھے بھی نظر آ جاتا کہ جو تجھے آزمائش کی انتہا لگ رہی ہے وہ اس کے لیے نجات کا راستہ تھا یہی چاہا تھا اس نے کہ اس کا وعدہ وفا ہو جائے آنکھیں کھول کر دیکھ جھلیا اس کے سارے وعدے پورے ہو گئے سو تیرے رب نے اس طرح اسے آزمائش سے نکالا کہ اس کے ذمے کسی کا گلہ نہیں رہا پر بندہ ناپ تول کا شوقین ہے لیکن بندے کا تول خالص نہیں ہوتا غرض کے کھوٹے باٹوں سے کبھی سچا تول نہیں آتا۔ اللہ کا تول سب سے کھرا ہے دیکھ تو عبداللہ اللہ نے اس کے ہر باب میں برابر کے باٹ رکھے ہیں کیا تو اب بھی گلہ کرے گا۔" انہوں نے رک کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

"صحیح کہا تھا اس نے عشق کی آگ جلائے تو راکھ نہیں کرتی [illegible] شاید اسے بتانا یاد نہیں رہا کہ جو [illegible] نہیں ہوتا۔ تم دونوں ہی عشق کی بھٹی میں [illegible] گئے پر وہ تپ کر کندن بن گئی اور تو راکھ بھی نہ ہو سکا۔ عشق تم دونوں نے ہی کیا پر اس کے عشق نے اس کا نام صابروں میں لکھ دیا اور تیرے عشق نے تجھے راندہ درگاہ بنا دیا۔" احساس ندامت سے عبداللہ کی آنکھیں جھک گئیں اور آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر چہرے کو بھگونے لگا۔ مولوی صاحب تاسف سے بولے۔

"صرف تو ہی نہیں ہے عبداللہ اس عشق کے ہاتھوں بہت لوگ برباد ہو گئے۔ اس خرابے میں ہر کوئی بے زار ہے خلقت گمراہ ہو رہی ہے پر عشق کے ہنگامے سرد نہیں پڑتے کون ہے جو عشق نہیں کرتا کوئی ظاہر کا دیوانہ کوئی باطن کا کوئی حق پہ مرتا ہے کوئی ناحق مر جاتا کسی کو تن کی پیاس ہے تو کسی کو من کی کوئی زمین کے لیے روتا ہے کوئی آسمان کے لیے کوئی پایا چاہے کوئی چھپایا ملنے لگے ہر کوئی اپنے حصے کا جہنم دہکا کر بیٹھا ہے پور پور جل رہا ہے پر الاؤ سرد نہیں ہوتا اور ہو گا بھی نہیں بندہ جب تک اپنے اصل سے رجوع نہ کر لے جہنم سے رہائی ممکن نہیں۔" پھر وہ اٹھے اور وارث شاہ کی نظم گنگناتے چلے گئے۔

رات اجاگن اوکھا ہوندا اے
اک جاگدا چوکیدار راتیں
اک جاگدا عشق دی مرض والا
اک جاگدا یار دا یار راتیں
اک جاگدا راتیں چور راتے
اک جاگدا پہرے دار راتیں
وارث شاہ سبھے گلاں کوڑیاں نے
اک جاگدا پروردگار راتیں

یہ آج کیسا انکشاف ہوا تھا مولوی صاحب کی دور جاتی آواز عبداللہ کے وجود کو جھنجوڑ رہی تھی اسے لگا اس کے تنفس کا عمل رک گیا اور روح جسم میں پھڑپھڑا رہی ہے نہ جانے کس طرح وہ اپنی جگہ سے اٹھا پھر وہ چلتا ہوا دروازے کے کواڑ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس

سکے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے لیکن وہ رکا نہیں اور اپنے وجود کی ساری طاقت لگا کر خود کو گھسیٹتا ہوا ننگے پاؤں گلیوں میں چلتا وہ مسجد کے باہر پہنچ گیا۔ ہر سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اسے اپنا آپ پاتال میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے گیٹ کی جالیوں کو پکڑ لیا یوں جیسے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا ہو اور وہ جالیوں کو یوں ہاتھوں سے ٹٹول رہا تھا جیسے اندھا کسی چیز کو انگلیوں سے محسوس کرتا ہے پھر وہ گیٹ کو پکڑے پکڑے سیڑھی پر گر گیا۔ اس کی آنسوؤں کی روانی میں تیزی آ گئی تھی پھر اس کی پست سی آواز ابھری۔

"منکر حق پر حق سب سے زیادہ آشکار ہوتا ہے کیونکہ اس کا کفر ہی اسے حق کی شناخت کرا دیتا ہے۔ میں نے تیرے دائرہ اختیار سے نکل جانا چاہا تھا میں نے زمین کی گہرائیوں سے کائنات کی وسعتوں تک وہ راستہ تلاش کیا ہے جو مجھے تیری خدائی سے باہر نکال دے کہاں کہاں نہیں بھٹکا... بستی میں ویرانے میں جنگل میں صحراؤں میں... خود اپنی ہستی کی گہرائی تک کو کھوج آیا پر ایسا کوئی ذرہ نہیں ملا جو تیرے قادر مطلق ہونے پر گواہی نہ دے۔ ایسا کوئی راستہ نہیں جو تیرے حصار سے باہر لے جائے اور اب میرے پاؤں تھک چکے ہیں میرے بدن میں سکت نہیں... میں نے مان لیا کہ تیرا اختیار سب سے بڑا ہے میری تلاش لاحاصل تھی اور تجھ سے فرار کی کوئی راہ نہیں اور جو تیری بادشاہت سے نہ نکل سکے اسے تیرے فیصلوں پر سوال کرنے کا کوئی حق نہیں میں اپنی عاجزی کو تسلیم کرتے ہوئے تیری بڑائی کا اقرار کرتا ہوں میرے اعتراف کو قبول کر لے۔" گیٹ سے ماتھا ٹکائے وہ ندامت کی پستیوں میں گر رہا تھا۔

"اللہ..." اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے درد سے کراہ کر فریاد کی۔

"بہت درد ہے اللہ مجھے دوا دے دے... میری آتی جاتی سانسیں برچھی کی طرح میرے اندر کو چھید رہی ہیں... میرا سینہ الاؤ بنا ہوا ہے... مجھ پر رحم کر کہ میری ہستی میں بپا حشر تھم جائے... میری برداشت میرے دکھ سے ہار گئی ہے۔ میرے زخموں سے خون رسنا بند نہیں ہوتا۔ میرا روم روم اذیت میں جکڑا ہے۔" وہ کرب سے چلا اٹھا۔

"اللہ میرا گناہ بہت بڑا ہے پر مجھے میری سرکشی کی سزا نہ دے میری ذلت کے عذاب مجھ سے نہیں جاتے تیرے غیض و غضب کا سامنا کس طرح کر پاؤں گا... میری ناتوانی کو دیکھ... مجھے عذاب نہ دینا... رحم کرنا مجھ پر میری روح تک جھلس گئی ہے۔ مجھے اور کسی جہنم کے حوالے نہ کرنا اس آبلہ پائی کے سفر نے میری روح تک میں چھالے ڈال دیے ہیں... میں بکھر چکا ہوں درد کی آندھی سے کہہ کہ اب تھم جائے... اللہ میرے تنکا تنکا وجود کو سمیٹ دے۔" وہ روتے روتے سجدے میں گر پڑا اور بلکنے لگا۔

کبھی بادل وار برس سائیں
میرا سینہ گیا ترس سائیں
میں توبہ تائب ہوا
آباد کروں کیا ویران
مری بس سائیں مری بس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں
اس عشق نے عجب اسیر کیا
خود دل سینے میں تیر کیا
کیا چلے پیش و پس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں
ہم بھی کچھ کھل کر سانس لیں
اشکوں سے دھل کر سانس لیں
کبھی کھل فضائیں برس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں

اسے مسجد کی سیڑھیوں پر سجدے کی سی حالت میں دیکھ کر مولوی عبدالخالق رک گئے۔ وہ یوں بے حس و حرکت تھا کہ انہیں شبہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہے۔ تیزی سے اس کے قریب آ کر جھکتے ہوئے انہوں نے اسے سیدھا کرنے کے لیے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو قمیص کے اوپر سے ہی انہیں اس کا جسم آگ اگلتا محسوس ہوا پر وہ ان کے ہاتھ رکھتے ہی اٹھتا چلا گیا تو مولوی صاحب سے بے ساختہ شکر ادا کیا گیا کہ وہ بے ہوش نہیں ہے پھر اس کے چہرے کو دیکھ کر بولے۔

"جب یہاں تک آ ہی گیا تھا تو اندر بھی چلا جاتا۔"

وہ خوف اللہ سے بھرائی آواز میں بولا۔

"کیسے جاتا مولوی صاحب اس کے در سے کسی کو دھکے مار کے بھی نکالو تو نہیں نکلتا اور میں کتنی نخوت سے اس سے لاتعلقی کا اعلان کر کے آپ اٹھ آیا تھا۔"

"اپنے بد اعمال سے نظر ہٹا کر دیکھ اس کی رحمت بہت وسیع ہے۔"

"پر میں اس کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا۔" وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔

"تیرے منہ کو کوئی نیا چہرہ نہیں مل سکتا عبداللہ اپنے اسی منہ کو توبہ کی چادر سے ڈھک کر چلا آ۔"

"لیکن اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو..." وہ خوفزدہ ہو گیا تو مولوی صاحب اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

"تو چلا آیا واپسی کی توفیق قسمت والوں کو ہوتی ہے اپنی قسمت کھوٹی مت کر جس نے بھی اس خوف سے ڈر کر اس چوکھٹ پر قدم روکے ہیں پھر وہ اندر نہیں جا پایا... یہ بے نیاز کا در ہے یہاں کسی کے نام کی منادی نہیں کی جاتی... خبردار بلاوے کا انتظار مت کرنا۔" وہ کہہ کر اٹھے پھر اس کے آنے کا انتظار کیے بغیر کنڈی کھول کر گیٹ وا کرتے ہوئے مسجد میں چلے گئے اور کونے میں بنے اسٹور روم سے جھاڑو اٹھا کر معمول کے مطابق دریاں سمیٹ کر جھاڑو لگانے لگے۔ عبداللہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا پر مسجد کے اندر پہلا قدم رکھتے ہی لڑکھڑا گیا مگر فوراً ہی دیوار کا سہارا لے کر سنبھل بھی گیا پھر آہستہ آہستہ چلتا وضو خانے کی طرف آیا۔

وضو کرتے ہوئے اس نے جوں ہی چلو میں ٹھنڈا پانی لے کر چہرے پر مارا تھا اسے یوں راحت کا احساس ہوا جیسے تپتے لوہے کو کسی نے ٹھنڈے پانی کے برتن میں ڈال دیا ہو۔ وضو کے پانی نے اس کی ساری بے چینی کو دھو دیا وہ نماز پڑھنے کے لیے کمرے کی طرف آیا تو آنکھوں کے ساتھ سر بھی جھکا رکھا تھا۔ اس نے دو رکعت نفل کی نیت باندھ کر ہاتھ کانوں تک اٹھا کر "اللہ اکبر" کہا تو اس کے دل نے سچے ایمان کے ساتھ گواہی دی تھی۔ وہ جیسے جیسے نماز پڑھتا گیا اسے اپنی رگوں میں سکون اترتا محسوس ہوا۔ ایک مدت کی بے سکونی کے بعد اس نے اس لذت کا مزا چکھا تھا۔ سلام پھیر کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھیں اس کی رحمت کو محسوس کر کے بھر آئیں۔

"یاد نہیں کب سے پر ایک مدت ہوئی میں بے سکونی میں جیے چلا جا رہا تھا اب کہیں جا کر تیرا نام لیا تو دل کو قرار آیا ہے۔ اللہ اپنی رحمت کے سائے مجھ پر مستقل کر دے۔ میرے صبر کی چادر کو اتنا بڑھا کہ میرا غم ڈھک جائے... مجھے اتنی طاقت دے کہ ان کے بغیر جی جاؤں میرے زخم نہیں بھرتے پروردگار میں تیری مسیحائی کا سوال کرتا ہوں میرا گناہ بہت بڑا ہے پر تیری رحمت سے امید ہے کہ میری توبہ قبول کر لی گئی۔ اللہ مجھے اتنا حق تو دے کہ تیری مغفرت طلب کر سکوں۔"

وہ بڑے گداز دل کے ساتھ بند آنکھوں سے دعا کر رہا تھا کہ کہیں پاس ہی چوڑیاں کھنک گئیں اور بے اختیار اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دور بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی عبداللہ کی نظریں محسوس کر کے اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر کسی شرارت کے خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبا کر مسکراتے ہوئے اس نے کلائی کی سب چوڑیاں ہاتھ سے پھنسا کر اوپر کیں پھر اچانک چھوڑ دیں کئی سر تال ایک ساتھ بج اٹھے تھے۔ عبداللہ کی بصارتیں اس دلفریب شور سے جھنجھنا اٹھیں تو اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ سراب عذاب ہے یا رب! میرے سارے زخم ادھڑنے لگتے ہیں... یہ خواب بہت حسین سہی پر جب ٹوٹتا ہے تو روح فنا ہو جاتی ہے مجھے اس سے نجات دے دے۔" مولوی صاحب جھاڑو لگا کر دریاں بچھا چکے تھے پھر بھی فجر میں کچھ دیر باقی تھی تو فارغ ہو کر عبداللہ کے پاس آ بیٹھے۔

عبداللہ نے دعا ختم کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں کھولتے ہوئے اس طرف دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے خوشبو میں بسا ایک وجود جلوہ افروز تھا۔۔۔ لیکن اب جلوہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے سر گھما کر ادھر ادھر اسے تلاش کرنا چاہا پر لاحاصل ہے۔۔۔ مولوی صاحب بہت غور سے اس کی حرکات کو نوٹ کر رہے تھے ٹوک کر بولے۔

"جب تو اس کے جانے پر اتنا تڑپتا ہے تو جاوہ آتا کیوں چھوڑ۔" اس نے مولوی صاحب کو دیکھا پھر ہولے سے بولا۔

"مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں۔"

"یہ معاملہ ہی بے اختیاری کا ہے عبداللہ۔" وہ سانس بھر کر بولے تو عبداللہ نے کہا۔

"یہ بے اختیاری تکلیف دیتی ہے۔"

"تو اس تکلیف کو سہنے کی عادت ڈال لے عبداللہ کیونکہ عشق تیری ہی نہیں اس کی بھی مجبوری ہے۔" انہوں نے کہا پھر۔

"اذان کا وقت ہو گیا ہے۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

پیاس سے مریم کی آنکھ کھلی تھی۔ اوپر کو کھسک کر اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا تو اس کی نظر بیڈ کے دوسرے کونے پر پڑی جو خالی تھا۔

"شاید وہ واش روم میں ہو۔" اس نے نور الہدیٰ کی غیر موجودگی پر سوچا پھر سائیڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کر گلاس میں پانی ڈال کر پینے لگی۔ کچھ دیر گزر گئی اور نور الہدیٰ نہیں آئے تو کچھ پریشان ہو کر وہ بیڈ سے اٹھی اور اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ بجایا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔۔۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"نور الہدیٰ اتنی رات کو کہاں چلا گیا۔" اس نے پریشانی سے سوچا اور ان کو ڈھونڈنے کمرے سے نکل آئی۔ نیچے آئی تو لاؤنج خالی تھا اس نے اسٹڈی روم میں دیکھا پھر سٹنگ روم کے ساتھ ساتھ ڈائننگ روم اور کچن کو بھی چیک کر لیا مگر نور الہدیٰ کہیں نہیں تھے۔ کچھ سوچ کر وہ لان میں آ گئی۔ لان میں جلتی لائٹوں سے رات کے اس پہر بھی کافی روشنی تھی۔ مریم نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اشارے سے واچ مین کو پاس بلایا وہ دیکھ چکی تھی کہ تینوں گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں پھر رات کے اس پہر نور الہدیٰ کہاں جا سکتے تھے واچ مین پاس آیا تو پوچھنے لگی۔

"کیا نور الہدیٰ کہیں گیا ہے۔"

"نہیں میڈم۔" اس نے کہا پھر اس کی پریشان شکل دیکھ کر پوچھا۔

"کیا صاحب اندر نہیں ہیں۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"آف کورس اندر ہی ہیں۔۔۔ میں اٹھی تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ شاید بابا جان کے پاس ہوں۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"ہاں میڈم اندر ہی دیکھیں صاحب باہر نہیں گئے پھر رات کے تین بجے وہ جائیں گے بھی کہاں۔" اس نے تسلی دے کر وہ واپس ڈیوٹی دینے چلا گیا۔

مریم نے کہہ تو دیا تھا کہ شاید وہ بابا جان کے کمرے میں ہوں پر اسے معلوم تھا کہ اتنی رات کو نور الہدیٰ بھلا ان کے پاس کیوں جائیں گے پھر اندر جانے کے بجائے وہ چلتی ہوئی پچھلی طرف لان میں نکل آئی۔ نور الہدیٰ وہاں بھی نہیں تھے۔ اس نے پہلی بار اس خوف کو محسوس کیا کہ جب کہیں لوگ کھو سکتے ہیں۔۔۔ بابا جان کے کمرے تک جا کر پچھلی طرف کے کھلے دروازے سے اندر آ گئی وفعتاً اس کی نظر ملیحہ کے کمرے پر پڑی۔ یہ بھی کبھی اس طرف آنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور جب سے اسے پتا چلا تھا کہ سیڑھیوں کے اوپر والا کمرہ ملیحہ کا ہے وہ ادھر بھٹکتی بھی نہیں تھی اور اس کا خیال تھا کہ گھر کے باقی لوگ بھی اس طرف شاذ و نادر ہی آتے ہوں گے آج پہلی بار اس نے ملیحہ کے کمرے کے دروازے پر پڑا تالا کھلا دیکھا تھا اس کی تو شاید نظر بھی نہ پڑتی پر دروازے کے نیم وا پٹوں میں بھری سی بتی تھی اور اس نے مریم کو چونکایا تھا وہ ریلنگ تھام کر سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی۔ اس نے زینے سے دروازے تک کا فاصلہ دو قدموں میں ہی طے کر لیا پھر دروازہ کھول کر کمرے میں جانے کے بجائے اس نے دروازے کی درمیانی جھری سے جھانک کر دیکھا۔

کمرے کی دیواروں سے ہوتی اس کی نظر ملیحہ کے بیڈ پر جا رکی کمرے میں اندھیرا تھا پر باہر لان کی روشنی سے کمرے میں نیم تاریکی کا ماحول بن گیا تھا اسی نیم تاریکی میں مریم نے نور الہدیٰ کو ایک بازو آنکھوں پر رکھ کر بیڈ پر لیٹے دیکھا تھا۔ اس کے اندر آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آج صحیح معنوں میں اسے ملیحہ اپنی شراکت دار لگی تھی پر اسے خود کو سنبھالنا تھا وہ اس معاملے میں نور الہدیٰ سے سوال نہیں کر سکتی تھی وہ پہلے ہی مریم سے ملیحہ سے محبت کرتے رہنے کی اجازت لے چکے تھے۔ خود پر ضبط کرتی وہ لوٹ آئی۔ مگر اندھیرا کیے بستر پر لیٹی وہ پلکیں نہیں جھپک سکی اور نور الہدیٰ کے انتظار میں جاگتی رہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر مریم نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ نور الہدیٰ بنا کوئی آواز کیے دوسری طرف جا کر بیڈ پر مریم کی طرف سے کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ مریم نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں ان کی پشت کو دیکھا پھر وال کلاک کے چمکتے ہوئے ہندسوں پر نظر کی پانچ بج چکے تھے مریم نے کلاک پر سے نظر ہٹا کر نور الہدیٰ کی طرف سے کروٹ لے لی۔

"رات میں تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو تم کمرے میں نہیں تھے۔" تکیہ گود میں رکھ کر بیڈ پر بیٹھی مریم گہری نظروں سے آفس کے لیے تیار ہوتے نور الہدیٰ کا جائزہ لے رہی تھی ان کا ہر انداز اتنا نارمل تھا کہ اگر رات میں مریم خود انہیں ملیحہ کے کمرے میں نہ دیکھ چکی ہوتی تو اس وقت انہیں دیکھ کر قیاس بھی نہ کر پاتی کہ ان کی گزشتہ رات کس طرح گزری ہے۔ ان کا نارمل انداز اسے اکسا رہا تھا حالانکہ وہ خود بھی ملیحہ کے ذکر سے بچنا چاہ رہی تھی بلکہ اس کی تو ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ نور الہدیٰ کی زبان پر ملیحہ کا نام بھی آ جائے اور نور الہدیٰ نے بھی بس ایک بار کے بعد دوبارہ ملیحہ کا اس سے ذکر نہیں کیا تھا وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ مریم کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس سلسلے میں ان کی ساری کوششیں بے کار جا رہی ہیں۔

مریم نے ملیحہ کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا تھا کہیں جو وہ انہیں خاموش بیٹھا دیکھتی تو اسے یہ خیال ستانے لگتا کہ نور الہدیٰ ملیحہ کو یاد کر رہے ہیں وہ جھٹ سے ان کے پاس پہنچ جاتی پھر چاہے وہ کسی بزنس پرابلم کا حل سوچ رہے ہوتے یا یوں ہی ان کے سر میں درد ہو رہا ہوتا اور وہ سکون کی خاطر آنکھیں بند کیے نیم دراز ہوتے مریم زبردستی انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی کبھی تو بس باتیں کیے جاتی اور کبھی وقت کا خیال کیے بغیر آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیتی تو نور الہدیٰ کی وارڈ روب میں پہلے سے موجود کپڑے اس ڈیڑھ مہینے میں ڈھیرے ڈھیرے وارڈ روب سے باہر جا چکے تھے۔ اگر کسی دن نور الہدیٰ آفس سے آ کر بلیو شرٹ اتار کر بلیو ہی شرٹ پہن لیتے تو مریم کو وہم ہو جاتا کہ یقیناً "ملیحہ کو ان پر یہ رنگ اچھا لگتا ہو گا۔ اس نے وارڈ روب سے بلیو کلر کی ساری شرٹس ٹی شرٹس ٹراؤزرز یہاں تک کہ ٹائیاں بھی نکال کر نوکروں میں تقسیم کر دیں۔

نور الہدیٰ نے اگر کوئی سوٹ زیادہ استعمال کر لیا تو اس کی نظر میں وہ سوٹ ملیحہ کا فیورٹ ہو جاتا۔ پھر بھلا اس کی وارڈ روب میں کیا جگہ تھی۔ بے چارا بہادر تک اس کے عتاب کا نشانہ بن گیا اس نے ہفتے میں دوسری مرتبہ پلاؤ کیا پکا لیا مریم کو لگا ملیحہ کے حکم پر پلاؤ زیادہ پکتا ہو گا آخر باورچی تو وہی تھی تو مینو بھی وہی سیٹ کرتی رہی ہو گی اس نے غصے میں بہادر کو خوب جھاڑ دیا کہ وہ سر پر چڑھتا جا رہا ہے جو دل کرتا ہے پکا لیتا ہے پھر مریم نے اسے مینو کی لسٹ بنا کر دی۔ جس پر سختی سے عمل کرنا بہادر پر فرض تھا۔ مگر نور الہدیٰ کو واقعی مریم سے محبت تھی انہوں نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا مگر مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ بابا جان کو چپ نہیں کرا سکتی تھی جو کھلے عام ملیحہ کا ذکر کرتے تھے حالانکہ یہ ذکر نور الہدیٰ کے سامنے نہیں ہوتا تھا احساس ندامت

سے وہ ان کے سامنے ملیحہ کا نام نہیں لے پاتے تھے
پہلے تو وہ صرف ملک ناصر سے ملیحہ کی باتیں کیا کرتے پر
ان کے انتقال کے بعد بہادر ان کا سامع بن گیا تھا پھر
مریم رخصت ہو کر آئی تو اسے بھی ملیحہ کا ذکر گاہے
بگاہے سننا پڑا حالانکہ زیادہ تر وہ اٹھ کر ہی چلی جاتی تھی
پر بابا جان اس کی ناگواری کو سمجھ نہ سکے انہیں معلوم
نہیں تھا کہ نورالہدیٰ اسے ملیحہ کے بارے میں اپنے
جذبات سے آگاہ کر چکے ہیں۔

خود اپنے طور پر تو انہوں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ
کبھی ملیحہ کے ذکر میں نورالہدیٰ کا نام کچھ اس طرح نہ
آئے کہ مریم کی دل شکنی ہو۔ انہوں نے بہادر اور
دوسرے نوکروں کو بھی منع کر دیا تھا کہ ملیحہ اور
نورالہدیٰ کی منگنی یا شادی طے ہونے کا ذکر مریم سے
نہ کریں پھر کون سا ملیحہ کی شادی ان سے ہو گئی تھی جو
بتانا ضروری ہوتا مگر مریم بابا جان کو کس طرح کہہ سکتی
تھی کہ اپنی بیٹی کا نام نہ لیا کریں مجھے اس کے ذکر سے
نفرت ہے اور ایک ہی رات میں یہ نفرت کئی گنا بڑھ گئی
تھی پھر بھی اندر کی بے چینی نے اسے نورالہدیٰ سے
بات کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہاں کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی اس لیے میں باہر
چلا گیا۔" ان کا لہجہ سرسری سا تھا۔ مریم نے ڈریسنگ
کے آئینے میں ان کے عکس کو گھورا جو اب ٹائی پہن
رہے تھے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

"باہر کہاں لان میں۔" ٹائی کی ناٹ لگاتے
نورالہدیٰ کے ہاتھ تھم گئے۔

مریم آئینے میں ان کے ردعمل کو دیکھ رہی تھی۔
اسے توقع تھی کہ اب تھوڑا سا گھبراتے ہوئے
نورالہدیٰ اس سے جھوٹ بولیں گے مگر انہوں نے
توقف کے بعد کسی خاص تاثر کے بغیر کہا۔

"نہیں ملیحہ کے روم میں۔" مریم کے تن بدن میں
آگ لگی وہ کتنے آرام سے اعتراف کر رہے تھے کہ کل
وہ پوری رات ملیحہ کو یاد کرتے رہے تھے اس نے سختی
سے لب بھینچ لیے مگر نورالہدیٰ کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ
کچھ ہوا ہی نہیں۔ ٹائی کی ناٹ لگا کر انہوں نے کوٹ
پہنا بریف کیس اٹھا کر بشاشت سے بولے۔

"یہ بات ہے مسز آج گاڑی تک سی آف کرنے
کے موڈ میں نہیں لگ رہیں کیا بندے کو اکیلے ہی جانا
ہو گا۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ان کی فرمائش
کے جواب میں اس نے بے دلی سے کہا تو وہ پریشان
ہوتے اس کے پاس جا بیٹھے۔

"کیوں کیا ہوا۔ کہیں بخار تو نہیں ہے۔" فکرمندی
سے کہہ کر انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ٹمپریچر
چیک کرنا چاہا تو مریم نے بظاہر نرمی سے مگر حقیقتاً بے
زاری سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"بس یوں ہی سر میں ہلکا سا درد ہے۔"

"طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں آفس نہیں
جاتا۔"

"کیا گھر پر رہ کر میرا سر دباؤ گے۔" چڑ کر کہتی
نورالہدیٰ کو وہ اجنبی سی لگی وہ پھر بھی درگزر کرتے پیار
سے بولے۔

"کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"نورالہدیٰ یو آر ڈسگسٹنگ۔" اس کا لہجہ ناقابل
برداشت ہو گیا۔

نورالہدیٰ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس بدتمیزی پر
پتے سے اکھڑ جاتا پر وہ برا منائے بغیر ہاتھ اٹھا کر صلح جو
انداز میں بولے۔

"اوکے یار آئی ایم سوری تم آرام کرو اور میڈیسن
ضرور لے لینا۔" وہ اٹھتے اٹھتے بھی بولے بغیر نہ رہ
سکے۔ ان کی بات سن کر مریم نے جھٹکے سے تکیہ بیڈ پر
پٹخا اور کمبل سر تک تان کر لیٹ گئی۔ نورالہدیٰ کی
پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

"کہیں مریم کو میرا ملیحہ کے روم میں جانا تو برا نہیں
لگا۔" دروازہ کھولنے کے ساتھ انہیں خیال ہوا تھا۔
پرسوچ نظروں سے انہوں نے کمبل اوڑھ کر لیٹی مریم
کو دیکھا پھر آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے باہر
نکل گئے۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ کمبل پھینک
کر اٹھ بیٹھی اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا



پھر وہ تنفر سے غرائی۔

"ملیحہ فاروقی میں کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ
میرا شوہر رات کے آخری پہر میرے پہلو سے گھبرا کر
اٹھے اور سکون کے لیے تمہاری پناہ میں چلا جائے۔"

اس دن کے بعد اس نے نورالہدیٰ کی چوکیداری
شروع کر دی تھی۔ رات میں جب تک نورالہدیٰ نہ
سو جاتے وہ جاگتی رہتی اس پر بھی سوتے سے اٹھ اٹھ کر
دیکھتی کہ وہ اپنی جگہ پر ہیں یا نہیں لیکن نورالہدیٰ بھی
محتاط ہو چکے تھے اپنی ازدواجی زندگی کو تلخیوں سے
بچانے کے لیے انہوں نے راتوں کو اٹھ کر ملیحہ کے
کمرے میں جانا چھوڑ دیا تھا اب وہ دن میں ایسے وقت
ملیحہ کے کمرے میں جاتے جب مریم گھر پر نہ ہوتی۔

☼ ☼ ☼

ایک پریشان حال عورت حیدر لوہار کی دکان پر آئی
اور عجلت بھرے انداز میں بولی۔

"یا حیدر ماشٹر عبداللہ کتھے اے۔"

"کیا ہوا؟" اپنا نام سن کر عبداللہ دکان کے اندر سے
باہر آتے ہوئے بولا۔ وہ عورت بولی۔

"چھیتی چل عبداللہ کوٹھے توں ڈگ کے تیرے
منڈے دا سر پاٹ گیا اے۔"

تیرے منڈے پر ٹھٹک کر عبداللہ نے اسے دیکھا
پر کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا وہ فوراً دکان سے نکل
گیا گھر پہنچا تو صحن میں آس پاس کی عورتوں کا
جمگھٹا لگا تھا ان کے درمیان ملانی جی چارپائی پر دو
ڈھائی سال کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ بچے
کے سر پر رنگین کپڑے کی پٹی بندھی تھی اور وہ بری
طرح سے رو رہا تھا۔

"ہون کیوں رو رہیاں اے ویکھ تیرا ابا وی آ گیاں
اے۔" ایک عورت نے سہمے ہوئے بچے کو چپ
کراتے ہوئے دلاسا دیا تھا۔ بچہ غالباً "بہت دیر سے ابا
کے آنے کی نوید سن رہا تھا جبھی عبداللہ کو دیکھ کر مچلتے
ہوئے اس نے اپنے ننھے ننھے بازو اس کی طرف اٹھا کر
روتے ہوئے۔ "ابا۔" پکارا عبداللہ اس کے پاس آ
گیا اور چارپائی پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔
حیرت انگیز طور پر بچہ اس کے پاس آتے ہی چپ ہو گیا
تھا بچہ پرسکون ہو گیا تو عورتوں کا ہجوم بھی چھٹنے لگا۔ بچے
کو تحفظ کا احساس دلانے کے لیے عبداللہ اسے اپنے
ساتھ لگائے ہلکے ہاتھ سے تھپکتا رہا یہاں تک کہ بچہ
اس کی گود میں سو گیا۔

عشاء کی نماز کے بعد عبداللہ مولوی صاحب کے
ساتھ گھر واپس آیا تو وہ ایسے ہنس کھیل رہا تھا جیسے کچھ
ہوا ہی نہیں اور عبداللہ کو دیکھ کر روز کی طرح دوڑتا ہوا
آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ پھر دونوں بازو اٹھا کر
بولا۔

"ابا اٹھاؤ۔" اس معصوم فرمائش پر نہال ہو کر
عبداللہ نے جھک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا پھر اس
کے گال پر پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"درد ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔" بچے نے زور سے سر کو دائیں بائیں
جھلا کر کہا۔ عبداللہ اسے اٹھائے باورچی خانے میں آیا
تو مولوی صاحب ہنس رہے تھے۔

"ہم تو بیٹا سمجھے تھے یہ تو توتا نکلا کیسے لہک لہک کر
عبداللہ کو ابا کہہ رہا ہے۔"

"گاؤں کی عورتوں نے تو یوں ہی عبداللہ کو اس کا ابا
کہہ دیا تھا پر اسے یہ لفظ اتنا پسند آیا ہے کہ دوپہر سے
عبداللہ کو ابا ابا کہتا اس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔"
ملانی جی کو بھی اس کی معصومیت لطف دے رہی تھی۔

"ٹھیک تو ہے۔" مولوی صاحب اب کچھ سنجیدگی
سے بولے۔

"اس نے جو پہلی شفقت محسوس کی وہ عبداللہ کی
تھی، دودھ کا پہلا گھونٹ اس کے حلق میں عبداللہ نے
اتارا وہ پہلا گہوارہ جس میں اس پر نیند مہربان ہوئی
عبداللہ کی آغوش تھی یہ جب بھی بیمار پڑا عبداللہ
راتوں کو جاگا، اسے انگلی پکڑ کر عبداللہ نے چلنا سکھایا
اور یاد ہے اس نے ہم دونوں سے پہلے عبداللہ کو پہچاننا
شروع کیا تھا۔ ہاں تو کہہ نہیں سکتا باپ ہی کہے گا۔"
پھر وہ سر جھکا کر بیٹھے عبداللہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

"اسے پیدا کرنے والوں نے آپ ہی اس پر سے اپنا حق اٹھا لیا پر عبداللہ تو لے دو حق اپنے نام کرا لیا ہے۔"
عبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ملانی جی نے کھانا سامنے رکھ دیا تھا وہ چپ کر کے کھانے لگا ساتھ ہی لقمے بنا کر گود میں بیٹھے بچے کے منہ میں رکھ دیتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ملانی جی نے اپنے ہاتھ پھیلا کر عبداللہ سے کہا۔

"لا اسے مجھے دے دے سلا دیتی ہوں۔" پر وہ عبداللہ کے بازو سے چمٹ کر منہ بسور رہا بولا۔

"ابا کے ساتھ سوؤں گا۔" مولوی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

"ہاجرہ باپ بیٹے کا بستر ساتھ بچھا دے۔" وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ لیٹے بچے کے بالوں میں گردش کر رہا تھا اور آنکھیں دور آسمان پر جمی تھیں۔

"صحیح کہتے ہیں مولوی صاحب اللہ کو بندے کا سجدہ کافی نہیں وہ کھرے کھوٹے کی پہچان آزمائش سے کرتا ہے۔ سکے کی طرح اس کی آزمائش کے بھی دو رخ ہوتے ہیں وہ کبھی لے کر آزماتا ہے اور کبھی دے کر مجھے لے کر آزما چکا..... اب شاید دے کر آزمانا چاہتا ہے۔" بچہ کسمسایا تھا عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت کو دیکھ کر عبداللہ کو بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔ انگلی سے اس کے روئی کے گولے جیسے گال کو چھو کر وہ سوچنے لگا۔

"شاید اس کی ماں نے اسے اس خوف سے خود سے الگ کر دیا کہ دنیا اس سے بچے کے باپ کا نام پوچھے گی پر کیا اس نے کبھی سوچا بھی تھا کہ ایک دن دنیا خود اس کے ساتھ باپ کا نام منسوب کر دے گی۔ اس نے تو آزمائش سے جان چھڑا لی پر میں اس آزمائش کو مرتے دم تک خود سے الگ نہیں ہونے دوں گا۔" عبداللہ نے اس کے پٹی میں جکڑے ماتھے پر سے بال سمیٹ کر نرمی سے اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"تم میرے بیٹے ہو اور اللہ سے کہنا کہ قیامت کے دن تمہیں تمہاری ماں کے نام سے نہیں بلکہ میرے نام سے پکارے۔" وہ مسکراتا ہوا اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

مریم کو لگ رہا تھا آج اس کی فتح کا دن ہے آج اس نے ملیحہ کو شکست دے دی تھی نورالہدیٰ کے بچے کو جنم دینے کا اعزاز ملیحہ کے نہیں بلکہ مریم کے حصے میں آیا تھا اور وہ اس اعزاز کو پا کر بہت خوش تھی۔ صبح اس نے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا تھا وہ شام کو ہی ہاسپٹل سے گھر آ گئی تھی اور خوشی سے بے حال وہ دیر تک نورالہدیٰ سے اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرتی رہی نورالہدیٰ آنکھیں بند کیے بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے نیم دراز تھے اپنے خیالات کی رو سے چونکے تو احساس ہوا بہت دیر سے مریم کی آواز نہیں آ رہی انہوں نے سر گھما کر اپنے سینے پر سر رکھ کر لیٹی مریم کی طرف دیکھا پتا نہیں وہ کب سو گئی تھی۔ انہوں نے اسے بہت آرام سے تکیے پر لٹا دیا پھر گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف رکھے بے بی کاٹ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

وہ اپنی بچی کی طرف تکتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے انہیں ملیحہ کی تشنگی بھری زندگی پر افسوس ہوتا تھا تکلیف ہوتی تھی..... لیکن آج انہیں خوف آ رہا تھا۔ بابا جان کی طرح آج وہ بھی ایک بچی کے باپ بن گئے تھے اور انہیں اس خیال سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں انجانے میں ان سے بھی اپنی بچی کے ساتھ وہ زیادتیاں نہ سرزد ہو جائیں جو بابا جان سے ملیحہ کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ ان کا دل کانپ رہا تھا پر وہ کسے اپنے خوف کے بارے میں بتاتے۔ انہوں نے سنبھل کر بچی کو بازو میں لے کر یوں خود میں بھینچ لیا جیسے کوئی بھی طاقت ان کی بچی کو ان سے چھین لے گی پھر وہ اسے سینے میں چھپائے کمرے سے نکل گئے۔ مریم کی آنکھ کھلی تو نورالہدیٰ کمرے میں نہیں تھے اور لائٹ بھی جل رہی تھی پر وہ دھیان دیے بغیر ذرا سا اوپر ہو کر کاٹ میں دیکھنے لگی۔ خالی کاٹ کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا پھر خیال آیا نورالہدیٰ بچی کو ساتھ لے گئے ہوں گے اس خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور بچی کو دیکھنے نیچے آ گئی لاؤنج میں کوئی نہیں تھا مگر بابا جان کے



کمرے کے دروازے کے نیچے روشنی کی لکیر کو دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ بابا جان جاگ رہے ہیں تو نورالہدیٰ بھی وہیں ہوں گے کیونکہ ابھی دس ہی تو بجے تھے اس نے آگے بڑھ کر بابا جان کے دروازے پر دستک دے دی۔

"آجاؤ۔" کی آواز پر دروازہ کھول کر اندر آئی بابا جان بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہے تھے اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

"ارے یہ کیا بیٹا ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کے لیے کہا ہے نا پھر نیچے کیوں آئی ہو۔"

"میں نے سوچا آپ کو چیک کر لوں کہیں اس کی فیڈ کا ٹائم نہ ہو گیا ہو۔ نورالہدیٰ یہاں نہیں ہیں۔" کمرے میں نورالہدیٰ کو نہ پا کر اس نے پوچھا۔ بابا جان نے تھکے انداز میں سانس بھر کر کہا۔

"وہ یہاں کیوں آئے گا۔"

"تو نورالہدیٰ اور تانیہ دونوں کمرے میں نہیں ہیں تو میں نے سوچا....." پریشانی سے بولتی وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے یہ سوچنے میں بس ایک سیکنڈ لگا تھا کہ نورالہدیٰ کہاں ہوں گے اور اس متوقع جگہ کو سوچ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں وہ بندوق سے نکلی گولی کی طرح ملیحہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"کیا ہوا مریم۔" بابا جان اس کے بدلتے تیور دیکھ کر پریشانی سے بولے پر وہ ان سنی کرتی کمرے سے نکل گئی تو بابا جان بھی پریشان سے اس کے پیچھے آ گئے۔ کمزوری کے باوجود کس طرح اس نے تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر زینے پر قدم رکھے تو آگے بے قفل دروازہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ غصے میں کھولتے ہوئے اس نے دھماکے سے دروازہ کھول دیا۔ نورالہدیٰ کارپٹ پر ٹانگیں پھیلائے صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز تھے اور بچی ان کے بازوؤں میں تھی یہ بھی اچھا تھا کہ مریم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا ورنہ اگر وہ کھلے دروازے سے سننے کی کوشش کرتی تو اسے پتا چل جاتا کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے نورالہدیٰ بچی کے ساتھ ملیحہ کی باتیں کر رہے تھے۔

وہ خونخوار نظروں سے انہیں گھور رہی تھی پھر وہ آگے بڑھی اور بچی کو ان کی گود سے جھپٹ لیا وہ جس تیزی سے بچی لی نورالہدیٰ کو ڈر ہوا وہ سیڑھیوں پر گر نہ پڑے اور وہ فوراً اٹھ کر بھاگے۔ ان کا خدشہ صحیح نکلا وہ باہر آئے تو بچے کو ایک بازو میں سنبھالے وہ ریلنگ تھام کر جھکی جا رہی تھی اسے بہت زور سے چکر آ رہے تھے مگر بابا جان نے اسے سنبھال لیا تھا۔

"مریم کام ڈاؤن۔" نورالہدیٰ پاس آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے رسان سے بولے تھے.... مریم نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا ساتھ ہی بابا جان سے بازو چھڑاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھی مگر نورالہدیٰ نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

"فار گاڈ سیک، مریم اپنی کنڈیشن کا تو خیال کرو ابھی تمہاری ڈلیوری کو چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں ہوئے۔"

"تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے جھڑک کر کہا تو نورالہدیٰ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

"ٹھیک ہے مگر مجھے اپنی بیٹی کی فکر تو کرنی ہو گی اس سے پہلے کہ تم اسے بھی اپنے ساتھ سیڑھیوں پر گرا لو اسے مجھے دے دو۔" وہ جانتی تھی کہ نورالہدیٰ بچی لیے بغیر اس کا بازو نہیں چھوڑیں گے اس لیے اس نے بچی ان کی طرف بڑھا دی۔ نورالہدیٰ نے بچی کو پکڑتے ہی اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ ان کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں اترنے لگی تو اس کی حالت کے پیش نظر بابا جان نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ مریم ان کے سہارے ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتی لاؤنج میں آ گئی۔ بابا جان نے آرام سے اسے صوفے پر بٹھا کر نورالہدیٰ کو دیکھا جو بچی کو صوفے پر لٹا رہے تھے۔ بابا جان ابھی تک صورت حال کو سمجھ نہیں پائے تھے وہ حیران پریشان دونوں میاں بیوی کی شکلیں دیکھنے لگے بچی کو لٹا کر نورالہدیٰ مریم کی طرف آئے جو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔

"دیکھو مریم۔" نورالہدیٰ نے اس کی کلائیاں تھام

کر جو کہنا چاہا تھا پر وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر اپنی جگہ سے اٹھی اور جا کھڑی ہوئی۔
"اب اور کیا دکھاؤ گے نور الہدیٰ جو دیکھا گیا وہ کافی نہیں تھا۔"
"تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو۔" وہ انگلی اٹھا کر بولے۔ مریم غرائی۔
"میرا شوہر غیر لڑکی کے کمرے میں راتیں گزارتا ہے اور تمہیں لگتا ہے میں اوور ری ایکٹ کر رہی ہوں۔" اس کے انداز پر نور الہدیٰ دنگ رہ گئے پھر تیز لہجے میں بولے۔
"ہاں مگر اس کمرے میں کوئی لڑکی نہیں ہوتی۔" وہ پھٹ پڑی۔
"یہی تو مسئلہ ہے وہ لڑکی کمرے میں نہیں تمہارے دل و دماغ میں رہتی ہے اگر کمرے میں ہوتی تو ہاتھ پکڑ کر نکال دیتی مگر اسے تمہارے دل سے کس طرح نکالوں۔ صرف اس کی وجہ سے میرا ہر پل عذاب میں گزرتا ہے۔ وہ تمہاری محبت میں میری حصے دار ہے تمہاری سوچوں میں میری حصے دار ہے اور تو اور میری راتوں میں بھی اس کا حصہ بنتا ہے۔ نور الہدیٰ تم کبھی تو مجھے پورے ملے ہوتے۔" آخر میں اس کی آواز دکھ میں ڈوب گئی تھی جسے محسوس کر کے نور الہدیٰ نرم پڑ گئے۔
"میں نے تمہیں دھوکہ تو نہیں دیا ہے تم جانتی تھیں میں بٹا ہوا انسان ہوں اب چاہے عذاب ہی سہی پر اس عذاب کو تم نے اپنی مرضی سے قبول کیا تھا پھر اب شکایت کیوں؟" ان کی بات سن کر مریم کلٹ دار لہجے میں بولی۔
"اس وقت میں نے سوچا تھا کہ تم کب تک یادوں کی قبر کے مجاور بنے رہو گے مجھے پا کر آخر ایک دن اسے بھول ہی جاؤ گے مگر نہیں میرے ساتھ ہو کر بھی تمہیں اس کی کمی ستاتی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں محسوس نہیں کر سکتی۔ ان ڈیڑھ سالوں میں ایک پل کے لیے بھی تم مجھے میرے ہو کر نہیں ملے تمہارا جسم میرے ساتھ ہوتا ہے پر روح اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ تمہاری آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں پر نظر کو اس کی تلاش رہتی ہے۔ میری آواز صرف تمہارے کانوں تک پہنچتی ہے مگر سماعت میں اس کی آواز گونجتی ہے۔ سب بتایا تھا تم نے پر یہ کب کہا کہ مجھے سوکن برداشت کرنی ہو گی۔" بابا جان اتنا تو سمجھ چکے تھے کہ وہ دونوں ملیحہ کے نام پر جھگڑ رہے ہیں مگر جس طرح سے مریم بول رہی تھی انہیں بہت برا لگ رہا تھا لیکن انہیں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح میاں بیوی کے درمیان دخل اندازی کر کے مریم کو چپ ہو جانے کے لیے کہہ دیں۔
نور الہدیٰ کو بھی اس کا انداز ناگوار گزر رہا تھا انہیں شدید غصہ آیا۔
"شٹ اپ مریم کم از کم اتنا خیال تو کر لو یہ سب ایک مری ہوئی لڑکی کے بارے میں کہہ رہی ہو۔"
"مری ہوئی لڑکی۔" وہ کہہ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔
"تمہارے دل پر اس کا قبضہ ہے تمہارے دماغ پر تمہاری روح پر تمہارے احساس پر اس کی حکومت ہے اور تم اسے مری ہوئی لڑکی کہتے ہو کیا فائدہ ایسے مرنے کا اگر وہ تمہاری زندگی سے نہیں نکلی۔ اپنی دوست تم شوق سے اس کی یاد میں آنسو بہاؤ لیکن اگر تم نے دوبارہ میری بچی کو اس مقبرے میں لے جانے کی جرات کی تو یاد رکھنا میں بہت برا کروں گی۔" زہر بھرے لہجے میں بول کر اس نے بچی کو اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھتی اپنے روم میں چلی گئی۔ مریم کے الفاظ پر نور الہدیٰ کو بہت تکلیف ہوئی تھی مگر بابا جان کو دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گئے ان کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کسی نے انہیں بہت اذیت دی ہے وہ آہستہ سے گویا ہوئے۔
"آئی ایم سوری بابا جان۔" تین سال میں پہلی بار نور الہدیٰ کے لہجے میں بابا جان کے لیے اتنا گداز آیا تھا مگر بابا جان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کچھ محسوس کر پاتے انہوں نے نور الہدیٰ کے شرمندہ چہرے کو دیکھ کر دھیرے سے کہا۔



"تمہاری کیا غلطی ہے؟" پھر سست قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آ گئے اور نور الہدیٰ لاؤنج میں تنہا کھڑے رہ گئے مگر ان کا کمرے میں جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں صوفے پر لیٹ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔
صبح آفس کے لیے تیار ہوتے وہ کمرے میں گئے تو بھی مریم کی طرف دیکھا تک نہیں جو رات بھر ان کی منتظر رہی تھی اور منہ پھیر کر تیار ہوتے رہے پھر جاتے جاتے وہ بیڈ کے پاس آئے اور جھک کر اپنی بچی کو پیار کیا اور باہر نکل گئے۔ اپنا یوں نظر انداز ہونا مریم کو بری طرح سے کھلا تھا ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جاتے ہی وہ اٹھ کر نیچے آ گئی۔
"بہادر۔" اس کی بلند آواز پر بہادر سارے کام چھوڑ کر لاؤنج میں بھاگا چلا آیا۔
"جی بیگم صاحب۔"
"ملیحہ کے کمرے کی چابی دو۔" بہادر گڑبڑاہٹ میں پھر چپ سا رہ گیا۔ کل رات کا جھگڑا تو اس کے علم میں نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا کہ مریم ملیحہ کو ناپسند کرتی ہے پھر اس کے تیور بھی ایسے تھے کہ وہ مشکوک ہو گیا۔
"میرے پاس تو نہیں ہے صاحب کے پاس ہوتی ہے آپ ان سے مانگ لیں۔" وہ سوچ کر بول رہا تھا۔
"افوہ کوئی ڈپلیکیٹ چابی تو ہو گی۔"
"ضرور ہو گی بیگم صاحب پر ہمیں نہیں معلوم۔" اس بار وہ پر اعتماد تھا مریم کو یقین کرنا پڑا۔ اس نے سوچا تھا ملیحہ کے کمرے کو تہس نہس کر دے گی مگر چابیاں نہ پا کر اس پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔ سامنے دیوار پر لگی تصویروں پر نظر پڑی تو وہ جنونی انداز میں آگے بڑھی پھر اس فریم کو اتار کر پھینکنے لگی جس میں ملیحہ نظر آ رہی تھی۔
"یہ آپ کیا کر رہی ہیں بیگم صاحب۔" بہادر گھبرا کر بولا۔ پل بھر کو ہاتھ روک کر اس نے پلٹ کر دیکھا پھر غراہٹ بھری آواز میں بولی۔
"ملیحہ کا نام اس گھر کی دیواروں سے کھرچ کر مٹا رہی ہوں۔" اور ہاتھ میں پکڑا فریم سامنے دیوار پر دے مارا۔ گھر کے سب نوکر جمع ہو گئے تھے پر کسی میں ہمت نہیں تھی مریم کو روکنے کی وہ سب سٹپٹائے ہوئے تھے اور بہادر کی تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ توڑ پھوڑ کی آوازوں پر بابا جان کمرے سے نکل کر آئے تھے پھر مریم کو تصویریں اتار کر پھینکتے دیکھ کر وہ الجھن بھرے انداز میں بولے۔
"یہ تم کیا کر رہی ہو مریم۔" ان کا پیر کسی چیز پر پڑا تھا قدم پیچھے کر کے انہوں نے نیچے دیکھا۔ وہ ملیحہ کے بچپن کی تصویر تھی جس کا شیشہ اب ٹوٹ چکا تھا۔ جھک کر تصویر اٹھاتے انہوں نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا پھر باقی تصویروں پر نظر ڈالی۔ بابا جان کی رگیں تن گئیں انہوں نے سرد نظروں سے مریم کو دیکھا جو خوفزدہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر پتھریلے لہجے میں بولے۔
"اگر تم نے دوبارہ میری بیٹی کی تحقیر کی جرات کی تو وہ تمہارا قصر فاروقی میں آخری دن ہو گا۔" بہادر کو اس پل ان میں پرانے اظہر فاروقی کی جھلک نظر آئی تھی مریم کے ہاتھ پہلے ہی انہیں دیکھ کر رک چکے تھے اور اب ان کی وارننگ سن کر اس نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بہادر سے بولے۔
"ان تصویروں کو لے جا کر ان کی حالت ٹھیک کرواؤ پھر انہیں ملیحہ کے کمرے میں رکھ دینا بلکہ میرے روم کے علاوہ جہاں جہاں بھی ملیحہ کی تصویریں لگی ہیں انہیں اتار کر ملیحہ کے کمرے میں رکھ دو۔"
"جی کرنل صاحب۔" اس نے ان کے ہاتھ سے ٹوٹا ہوا فریم پکڑ کر کہا تھا۔
نور الہدیٰ ہر روز کے مقابلے میں آج جلدی آ گئے تھے حالانکہ آج تو ان کا آفس جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا سوچا تھا پورا دن مریم اور ثانیہ کے ساتھ گزاریں گے پر رات کے ہنگامے کے بعد ان کا مریم سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے انہیں یہ بہتر لگا کہ آفس چلے جائیں۔
لاؤنج میں قدم رکھتے ہی انہیں کسی تبدیلی کا احساس تو ہوا پر انہوں نے دھیان نہیں دیا اور کمرے

میں چلے آئے۔ مریم چادر لیے بیڈ پر لیٹی تھی انہیں دیکھ کر بھی بس اٹھی نورالہدیٰ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور نانیہ کو پیار کرنے کے بعد فریش ہونے اور لاؤنج میں آ بیٹھے۔ جہاں بابا جان پہلے سے موجود اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آواز دے کر بہادر کو پانی لانے کو کہا۔ پانی کا گلاس انہیں پکڑا کر جانے کے بجائے وہ وہیں کھڑا رہا اور بولا۔

"آج اس گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا جتنا کبھی نہیں ہوا۔"

"بہادر تم جاؤ۔" بابا جان اخبار چھوڑ کر بولے۔

"ایک منٹ۔" نورالہدیٰ کی چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ ہنگامے کا تعلق مریم سے ہے۔

"ہاں بولو کیا ہوا تھا۔" اور بہادر شروع ہو گیا۔

"آپ کے جانے کے بعد بیگم صاحب نے بی بی صاحب کی تصویریں لاؤنج کی دیوار سے اتار اتار کر پھینک دیں اور ان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بھی کیں پھر کرنل صاحب نے آ کر انہیں روکا پر تب تک وہ بہت ساری تصویریں پھینک چکی تھیں کئی کے تو فریم بھی ٹوٹ گئے۔" اب نورالہدیٰ نے نوٹ کیا کہ دیوار سے کئی تصویریں غائب تھیں اور ان کی یادداشت کے مطابق ان سب تصویروں میں ملیحہ تھی۔

"وہ تصویریں کہاں ہیں جن کے فریم ٹوٹ گئے؟"

"وہ تو صاحب نے لگوا لیے اور بی بی صاحب کے کمرے میں بھی رکھوا دیے۔"

"اس کے کمرے میں کیوں رکھے واپس دیوار پر کیوں نہیں لگائے۔" نورالہدیٰ ناگواری سے بولے۔

"کرنل صاحب نے کہا تھا بی بی صاحب کی تصویریں سارے گھر سے اتار کر ان کے کمرے میں رکھ دو۔"

"کیوں؟" وہ بہادر کی بات سن کر حیرت سے بابا جان سے بولے۔

"کیوں کہ میں مریم کو دوبارہ اس سب کا موقع نہیں دینا چاہتا اس جھگڑے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔" قطعیت سے بولتے ہوئے انہوں نے بہادر کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

"میں ملازموں سے بھی کہہ دوں گا اور خود بھی خیال رکھوں گا تم بھی ذرا احتیاط کرنا کہ ملیحہ کا نام نہ لو کیونکہ اگر مریم نے سنا تو مشتعل ہو سکتی ہے اور میں اپنے ہی گھر میں اپنے سامنے اپنی بیٹی کے لیے مغلظات نہیں سن سکتا۔" نورالہدیٰ ان کی آواز میں غصہ محسوس کر رہے تھے مگر انہیں یہ سب بالکل پسند نہیں آیا اور ناراضی سے بولے۔

"وہ مر تو چکی ہے اب اس کی یاد بھی مٹانا چاہتے ہیں بھلا یہ جھگڑا ختم کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔" ان کی بات پر بابا جان نے سر جھکا لیا پھر خود کو کمپوز کر کے بولے۔

"ملیحہ کا نام زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اسے یاد کرنے کی ضرورت نہیں تم جانتے ہو کہ ہم دونوں سو بار بھلا کر بھی اسے نہیں بھول سکتے...... یادیں دل میں ہوتی ہیں دیوار پر نہیں چاہے دیوار پر ملیحہ کی تصویر لگی رہے یا نہ رہے ہمیں یا تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر مریم کو فرق پڑے گا۔ ذرا سوچو کل جو کچھ ہوا اس وقت نانیہ بھی وہاں موجود تھی آج وہ نا سمجھ ہے کل سمجھ دار ہو جائے گی کیا تم اپنی بیٹی کے سامنے اس نوعیت کا جھگڑا افورڈ کر سکتے ہو۔ میں یہ سب مریم کے لیے نہیں نانیہ کے لیے کر رہا ہوں میں نہیں چاہتا کہ اس کا ذہن خراب ہو اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ میری ملیحہ لوٹ آئی ہے...... میں دوسری بار اپنی بچی کو تکلیف نہیں دے سکتا۔" انہوں نے جس لہجے میں کہا تھا نورالہدیٰ خاموش رہ گئے ان کی خاموشی میں متفق ہونے کا اشارہ تھا اور اس طرح اپنے انتقال کے صرف تین سال بعد ملیحہ کا ذکر قصر فاروقی میں شجر ممنوعہ بن کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

وقت اپنی دھیمی رفتار سے آگے بڑھتا رہا یہ دیکھے بغیر کہ پیچھے کیا کچھ رہ گیا ان گزرتے سالوں میں عبداللہ گاؤں والوں کے لیے ہر دلعزیز ہو گیا تھا حالانکہ گاؤں



والوں کو اب بھی اس کا مجذوب کی سی حالت میں گاؤں آنا یاد تھا مگر اس یاد میں بھی تعظیم تھی اب مولوی عبدالخالق تہجد کے لیے خود نہیں اٹھتے بلکہ عبداللہ انہیں جگاتا تھا پھر ان کے ساتھ ہی تہجد کی نماز ادا کرتا اس کے بعد مولوی صاحب جائے نماز پر بیٹھے ذکر کرتے رہتے اور جب فجر کی اذان دینے مسجد پہنچتے عبداللہ جھاڑو لگا کر دریاں بچھا چکا ہوتا نماز کے بعد تلاوت عبداللہ کا معمول تھی وہ خوش الحانی سے تلاوت کرتا مولوی صاحب پاس بیٹھے جذب کے عالم میں سنتے جاتے اس کی آواز میں بہت سوز تھا جس کے کانوں میں بھی اس کی آواز جاتی وہ رک جاتا پھر جب تک وہ تلاوت ختم نہ کرلیتا اپنی جگہ سے ہل نہیں پاتا پھر وہ دونوں اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کی طرف لوٹ جاتے مگر ان میں ابھر کر نماز سے غافل نہ ہوتے۔

عصر کی نماز کے بعد عبداللہ حیدر لوہار کی دکان پر جانے کے بجائے گھر آ جاتا کیونکہ گاؤں کے بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم دینا اب مکمل طور پر اس کی ذمہ داری تھی انہیں بچوں کے درمیان وہ بچہ بھی میٹھا فیض پایا کرتا جسے اب عبداللہ اپنا بیٹا کہتا تھا وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے لیے بہت فکر مند رہا کرتا بہت پیار اور بہت توجہ کے ساتھ ایک بہترین انسان کے ہاتھوں اس کی پرورش ہو رہی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد عبداللہ گاؤں والوں کی روزانہ بیٹھک میں بھی شامل ہوتا مگر وہ اتنا کم سخن ہو گیا تھا کہ اس کی آواز اس بیٹھک میں کم ہی سنی گئی تھی پانچوں وقت کی نماز میں اس کا بیٹا بہت شوق سے اس کے ساتھ جماعت میں شامل ہوتا مگر یہ بیٹھک اسے بور کر دیتی تھی اور وہ اکثر بیٹھک کے دوران عبداللہ کی گود میں لیٹ کر سو جاتا۔ زندگی ایک مخصوص ڈھب پر چل پڑی تھی خوشی کا احساس تو ہمیشہ کے لیے مٹ چکا تھا مگر زندگی میں اب سکون تھا اب دیوانگی کا سودا عبداللہ کو نڈھال نہیں کرتا تھا۔

درد تو اب بھی ساتھ ساتھ تھا پر اس درد کے ساتھ جینا آ گیا تھا مگر کبھی کبھی یہ درد ضبط کو توڑنے لگتا جب وہ اچانک ہی سامنے آ جاتی مگر اس کے بعد وہ پھر سے پرسکون ہو جاتا وقت کے سیدھے راستے پر زندگی کی ہموار رفتار کو دیکھ کر عبداللہ کو یقین ہونے لگا تھا کہ اب کوئی موڑ نہیں آئے گا لیکن جب ہمیں لگتا ہے کہ زندگی میں کوئی موڑ نہیں آئے گا تو اگلے قدم پر ہی ایک موڑ ہمارا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔

عبداللہ معمول کے مطابق دکان پر آیا تو وہاں آج کافی ہلچل تھی دو لڑکے مل کر لوہے کے بڑے سے گیٹ کو سوزوکی کے پچھلے حصے میں لاد رہے تھے۔ دکان کے اندر حیدر لوہار اس کا منتظر تھا جس کے بازوؤں کی طاقت عمر بڑھنے کے ساتھ گھٹ گئی تھی۔

"آجا پتر تیرا ہی انتظار ہے۔" وہ عبداللہ کو دیکھ کر بولے۔

"چودھری نواز نے گیٹ اٹھانے کے لیے بندے بھیجے ہیں تو ان کے ساتھ جا اور گیٹ اپنے ہاتھوں لگا کر آ۔ منور کے ہاتھ میں ہتھوڑی نہ دینا وہ دیوار ہی توڑ دے گا۔" عبداللہ مسکرا کر سر ہلاتا باہر آ گیا۔ گیٹ لادا جا چکا تھا۔ وہ سوزوکی کے پچھلے حصے میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سوزوکی چل پڑی تو منور خوشامدی لہجے میں بولا۔

"ماسٹر جی آج تو ابا ساتھ نہیں گیٹ میں لگا لوں۔"

"نہیں۔" عبداللہ کی بات پر وہ خفگی سے بولا۔

"یہ کیا ماسٹر جی! کام کروں گا نہیں تو سیکھوں گا کیسے۔" عبداللہ نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا جو نو عمر لڑکے سے جوان مرد بن چکا تھا مگر اس کا البیلا پن اب بھی وہی تھا۔

"تمہارے ابا نے کہا ہے کہ منور علی کے ہاتھ میں ہتھوڑی نہ جائے اب اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔" منور علی حسرت بھرا سانس کھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

گیٹ چودھری نواز کی حویلی کے ساتھ خالی پلاٹ کی چار دیواری میں لگنا تھا جس پر کافی عرصے سے تنازعہ چل رہا تھا۔ سوزوکی پلاٹ کی حدود کے باہر جا رکی تو چودھری نواز کی جیپ کے ساتھ گن مین بھی باہر موجود تھے اس کا مطلب چودھری نواز پلاٹ میں موجود تھا عبداللہ کے ساتھ منور نے گیٹ سوزوکی سے اتروایا پھر

دونوں اسے اٹھائے اس جگہ پر لے آئے جہاں گیٹ لگنا تھا اور کچھ دیر کے بعد اپنا کام شروع کر دیا۔

"میرا بیٹا شروع سے ہی شہر کے ہاسٹل میں رہا ہے میرے کہنے پر وہ گاؤں آنے کو راضی تو ہو گیا مگر حویلی میں رہنے کے لیے تیار نہیں کہتا ہے اسے یہاں کا ماحول پسند نہیں اپنے لیے شہری طرز کا بنگلہ بنوانا چاہتا ہے یہ زمین اسی کے لیے خریدی تھی پر وہ حرام خور نمبردار نقد رقم وہ بھی یکمشت لے کر مکر گیا کہ پیسہ تو دیکھا تک نہیں۔"

"چھوٹے چودھری صاحب اب تو عدالت نے آپ کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے اور یہ زمین بھی قانونی طور پر آپ کی ہوئی مگر اگلی بار لین دین کرتے وقت کاغذی کارروائی کا خیال رکھیے گا یہ آپ کے قانونی تحفظ کے لیے ضروری ہے۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں وکیل صاحب پکے کاغذ کے بغیر لین دین کرنا ہی نہیں چاہیے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ خیر ابھی تو میں نے پلاٹ کے گرد دیوار اٹھا کر پلاٹ بند کر دیا ہے شہریار پڑھائی پوری کر کے آئے گا تو اپنی مرضی کا بنگلہ بنوائے گا۔" عبداللہ ہتھوڑی کی مدد سے گیٹ دیوار میں فٹ کر رہا تھا اور وہ لوگ باتیں کرتے اس کے پاس سے گزر گئے مگر ایک شخص سر جھکائے آہنی فریم کو دیوار میں ٹھوکتے عبداللہ کے چہرے کی ذرا سی جھلک پا کر ہی ساکت ہو گیا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلائے عبداللہ کو گھور رہا تھا اس کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت تھی پھر اس نے سرسراتی آواز میں ایک نام پکارا۔

"وجدان۔" عبداللہ کا ہتھوڑی والا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا اسے یہ نام جانا پہچانا سا لگا تھا۔ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ نیچے کیا اور سر اٹھا کر پکارنے والے کی طرف دیکھا عبداللہ کا چہرہ اب اس کے سامنے تھا بے یقینی یقین میں بدلی تو آنکھوں میں نمی آ گئی۔ بڑے جذباتی انداز میں اس نے بڑھ کر عبداللہ کا بازو تھامتے ہوئے اپنے مقابل کھڑا کیا اور اس سے لپٹ گیا۔ عبداللہ بت کی طرح اس کے حلقے میں کھڑا تھا۔ اس نے اس شخص کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی نہ اس کے گرد اپنے بازو پھیلائے۔

"کہاں کہاں تمہیں نہیں ڈھونڈا اور تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔" وہ عبداللہ کے گلے لگا کہہ رہا تھا پھر الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"پتا ہے کتنا پریشان کیا تم نے اور تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو۔" عبداللہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا جو اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے شکایت کر رہا تھا۔ اب اسے بھی عبداللہ کی بے گانگی کا احساس ہوا۔ اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتے اس نے گہری نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ پاس کھڑا منور علی حیرت سے باری باری ان دو لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے پھر وہ شخص ایک دم سے حیران نظر آنے لگا۔

"وجدان تم نے مجھے نہیں پہچانا میں آفاق ہوں تمہارا دوست۔" منور علی کو دوست سے دوست کا اپنا تعارف کرانا عجیب لگا تھا۔

"آفاق۔" عبداللہ نے اس طرح یہ نام لیا جیسے کوئی بھولی بات یاد آئی ہو پھر اس طرح سے پوچھا۔

"کیسے ہو؟" جیسے کل کے بعد آج مل رہا ہو۔ ایک قدم پیچھے لے کر اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے آفاق کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس سوال کا جواب دینے کے لیے بہت کچھ کہنا ہے اور بہت کچھ سننا ہے اس لیے فی الحال اس سوال کو رہنے دو میں تمہیں پاپا سے ملاتا ہوں۔" پھر اس نے کچھ دور چودھری نواز کے ساتھ کھڑے باتیں کرتے منیر حسن کو آواز دی۔

"پاپا۔" انہوں نے آفاق کی طرف دیکھا۔ وہ عبداللہ کی پشت پر تھے اس لیے وہ اسے دیکھ نہ پائے مگر ان کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے دھیرے سے عبداللہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ان کی طرف گھما دیا۔ انہیں وجدان کو پہچاننے میں بس ایک پل لگا تھا اور اگلے ہی پل وہ ششدر رہ گئے وہ تیزی سے آگے آئے اور وجدان کو گلے لگایا مگر فوراً ہی الگ ہو کر اس طرح اسے دیکھنے لگے جیسے یقین نہ آیا ہو کہ انہوں نے وجدان کو گلے لگایا ہے۔

"آپ ماسٹر عبداللہ کو جانتے ہیں۔" چودھری نواز نے انہیں جذباتی انداز میں عبداللہ کے چہرے کو ہاتھ سے چھوتے دیکھ کر پوچھا۔ ان کی آواز میں استفسار کے بجائے حیرت تھی۔ منیر حسین بولے۔

"نہیں مگر میں وجدان مصطفیٰ کو جانتا ہوں اور یہ ہے وجدان۔" انہوں نے وجدان کے شانے پر بازو پھیلاتے ہوئے چودھری نواز سے کہا جو منور علی کی طرح اپنی حیرت کو چھپا نہ پائے تھے۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ ماسٹر عبداللہ ہے مولوی عبدالخالق کا۔ ہوں۔" یوں پرسوچ انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئے جیسے سوچ رہے ہوں مولوی عبدالخالق سے عبداللہ کا کیا رشتہ بتائیں۔ آفاق نے کہا۔

"ہمیں غلط فہمی نہیں ہوئی چودھری صاحب مگر لگتا ہے آپ طویل مدت سے کسی غلط فہمی کا شکار ہیں جسے آپ ماسٹر عبداللہ کہہ رہے ہیں وہ میرا دوست وجدان مصطفیٰ ہے ہم دونوں لاء کالج میں ساتھ پڑھتے تھے کافی سال پہلے یہ لاپتا ہو گیا تھا سب نے اسے بہت تلاش کیا مگر یہ ملا ہی نہیں یہاں تک کہ اس کی تلاش روک دی گئی۔" منیر مزید بولے۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں چودھری صاحب جو آپ نے خاص طور پر مجھے کراچی سے بلوا لیا ورنہ ہمیں کیسے پتا چلتا کہ جسے دس سال سے ڈھونڈ رہے ہیں وہ آپ کے گاؤں میں ہے۔" وہ لوگ وجدان کے بارے میں بات کر رہے تھے مگر وجدان ایسے کھڑا تھا جیسے اس معاملے سے تعلق ہی نہ ہو وہ تو کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا لیکن جب منیر حسن نے دس سال کا ذکر کیا تو چونک گیا۔

"دس سال۔" اس نے آہستہ سے دہرایا پھر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ابھی صرف دس سال گزرے ہیں۔" منیر حسن اسے دیکھ کر بولے۔

"صرف دس سال نہیں کہو وجدان دس سال کہو۔" وہ دس سال پر زور دے کر بولے۔ آفاق باتیں کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا فوراً منیر حسن سے بولا۔

"پاپا باقی باتیں وجدان کے گھر چل کر کریں گے۔ چلو وجدان۔" آخر میں وہ وجدان سے بولا۔

"میں پہلے گیٹ لگا لوں پھر چلتے ہیں۔" اپنا نام سن کر وجدان نے نارمل انداز میں کہا تھا اس کا "نارمل" ہونا ہی تو آفاق کو چونکا رہا تھا پھر بھی اس نے شکر ادا کیا کہ کم از کم وہ اپنے نام کو تو قبول کر رہا ہے۔ اب منیر حسن بھی اس کے نپے تلے انداز کو نوٹ کر رہے تھے۔

"معذرت چاہتا ہوں چودھری صاحب مگر اب وجدان کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے بہرالحال آپ کا بہت شکریہ آخر ہمیں بلایا تو آپ ہی نے تھا۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں وکیل صاحب ہم نے تو آپ کو اپنے کام سے بلایا تھا۔ آپ کا بندہ مل گیا اچھی بات ہے مگر اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔" وہ انکساری سے بولے پھر کہا۔

"ڈرائیور آپ کو مولوی صاحب کے گھر چھوڑ دے گا لیکن کوشش کیجیے گا جانے سے پہلے ملاقات ہو جائے۔"

"ضرور۔" ان سے کہہ کر وہ وجدان کی طرف مڑے۔

"چلو وجدان تمہارے گھر چلتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ پھر پہلے گیٹ لگانے کی بات کرتا منور علی جلدی سے بولا۔

"آپ جائیں ماسٹر جی کام ہو جائے گا۔"

"تم اکیلے کیسے کرو گے۔" عبداللہ بولا۔

"میں فاقٹ جا کر دکان سے کسی کو لے آتا ہوں آپ بے فکر ہو کر مہمانوں کے ساتھ جائیں۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا اور فوراً نکل گیا۔ آگے راستہ تنگ تھا وجدان نے جیپ گلی سے پہلے ہی رکوالی۔ چودھری

کی جیب سے ماسٹر عبداللہ کو اترتے دیکھ کر گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے مزید حیرت تب ہوئی جب اس کے ساتھ اپنی وضع قطع سے شہری نظر آنے والے مہمان مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہوئے۔

ملانی بی صحن میں چارپائی پر بیٹھیں دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں وجدان کو گھر میں آتے دیکھ کر حیرت سے بولیں۔

"بڑی جلدی آ گیاں عبداللہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"جی۔" اس نے مختصراً" جواب دیا مگر تب تک ملانی جی کی نظر اس کے پیچھے اندر داخل ہوتے سوٹڈ بوٹڈ مردوں پر پڑ چکی تھی انہیں فوراً" اندازہ ہو گیا کہ یہی دونوں عبداللہ کے جلدی گھر آنے کی وجہ ہیں۔ عبداللہ ان کا تعارف کرائے بغیر ہینڈ پمپ پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا ملانی جی نے اس سے پوچھنے کا قصد کیا مگر فوراً" ہی ارادہ بدل بھی لیا اس کے ———

"ہوں ہاں۔" میں بات کرنے کی عادت کی وجہ سے جتنی دیر میں اس کی زبان سے پوری بات نکلتی آگے والا سوال کر کے تنگ آ جاتا اس لیے وہ براہ راست ان دونوں سے بولیں۔

"آپ لوگ کون ہیں؟" منیر حسن نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"مولوی عبدالخالق صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا پھر چارپائی سے اٹھتی ان سے بولیں۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں مولوی صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔" پھر چلتی ہوئیں دروازہ کھول کر دوکان میں چلی گئیں۔

چارپائی پر بیٹھ کر آفاق نے وجدان کو دیکھا تو لیے سے ہاتھ خشک کرتا وہ بظاہر پرسکون لگ رہا تھا مگر آفاق اس کے اندر کے اضطراب کو محسوس کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" مولوی صاحب کے سلام کرنے کی آواز کو سن کر آفاق ان کی طرف متوجہ ہوا پھر منیر حسن کے ساتھ فوراً" ہی اس بزرگ شخص کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا مولوی صاحب نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

"آپ حضرات اپنا تعارف کروا دیجیے۔" وہ دونوں سوچ ہی رہے تھے کہ کہاں سے بات شروع کریں کہ مولوی صاحب نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ آفاق نے منیر حسن کی طرف دیکھا پھر مولوی عبدالخالق کو دیکھ کر بولا۔

"یہ میرے والد ہیں ایڈووکیٹ منیر حسن اور میرا نام آفاق ہے۔ میں وجدان کا پرانا دوست ہوں۔" پھر ان کو الجھن میں پڑتا دیکھ کر فوراً" بولا۔

"میرا مطلب ہے عبداللہ کا۔" وہ رکا پھر گویا ہوا۔

"اصل میں مولوی صاحب بات یہ ہے کہ جسے آپ عبداللہ کہتے ہیں وہ دراصل وجدان مصطفیٰ ہے۔" مولوی صاحب نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایک دن کوئی عبداللہ سے شناسائی کا دعوا کرتا ان کے گھر چلا آئے گا وہ پہلے تو حیران ہوئے پھر خوش اس کے بعد ان کا دل بیٹھنے لگا۔

انہوں نے دس سال تک عبداللہ کو اپنا بنا کر ساتھ رکھا تھا مگر ایک پل میں ہی وہ عبداللہ سے وجدان ہو کر پرایا ہو گیا تھا۔ وہ پرائے کو اپنا کیسے کہہ سکتے تھے۔

رات گہری ہو چکی تھی جنگل والی کی گلیوں میں اندھیرا اور خاموشی اپنا راج پاٹ سنبھالے ہوئے تھی ——— گہری نیند نے گاؤں کے سب لوگوں کو دبوچ رکھا تھا ہاں مگر مولوی عبدالخالق کے گھر کی چوکھٹ پر رتجگا پہرہ دے رہا تھا۔ مولوی صاحب، ملانی بی، منیر حسن اور آفاق اندر کمرے میں زمین پر دری بچھائے بیٹھے تھے درمیان میں لالٹین جل رہی تھی جس کی زرد روشنی میں ان کے سائے دیوار پر تھرکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چاروں خاموش تھے مگر اس خاموشی سے پہلے محفل میں قصہ گوئی چل رہی تھی۔

وجدان کی داستان سنائی گئی پھر عبداللہ کی کہانی بیان



ہوئی۔ کہانی ختم ہوئی تو الفاظ بھی ختم ہو گئے۔ وجدان کی زندگی کے دس سالوں کا زیاں آفاق کو تھکا رہا تھا۔ آفاق نے ہلکے سے گردن کو موڑ کر دروازے سے باہر صحن میں بچھے کھیس اندر چہرے کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"کہتے ہیں کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آتا ہے جو اسے بدل کر رکھ دیتا ہے مگر وجدان کی زندگی میں ایسا ایک نہیں بلکہ کئی موڑ آئے ہیں اور ہر بار کی تبدیلیوں نے اسے اتنا بدل دیا ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی مجھے اس میں وہ وجدان نہیں ملتا جو کالج میں میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ میرا وہ کھویا ہوا دوست مجھے بہت یاد آتا ہے۔" آفاق کی آواز بوجھل ہو گئی مولوی صاحب نے اسے دیکھا پھر یوں لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے خاموشی سے نظریں پھیر لیں۔

"مولوی صاحب آپ کا یہ احسان تعریف کے لائق ہے کہ آپ نے اتنے برسوں تک وجدان کو سہارا دیا لیکن پھر بھی آپ سے ایک شکایت ہے۔"

"کیسی شکایت منیر حسن؟" وہ ان کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آپ کو وجدان کے ماں باپ کی حالت کا اندازہ تو ہو گا ہی آپ کے پاس دس سال کا وقت تھا آپ نے کیوں وجدان سے اس کے گھر بار کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ اس کی ذہنی حالت تو اس قابل نہیں تھی کہ گھر لوٹ جاتا لیکن آپ تو اس کے گھر والوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔"

"یہ کوتاہی تو ہوئی ہے ہم سے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولے۔

"لیکن اس کی بھی وجہ تھی وجدان جب یہاں آیا تو اس کی ذہنی حالت آپ کے اندازے سے کئی گنا بدتر تھی وہ حقیقتاً" پاگل ہو چکا تھا۔ بھلا ایک پاگل شخص اپنے بارے میں کیا بتاتا۔ اکثر وہ زور زور سے چلانے لگتا اور نہ جانے کیا کیا بولتا چلا جاتا۔ ——— میں بہت غور سے سنتا کہ شاید کچھ اخذ کر سکوں مگر اس کی بے ربط باتوں میں ملیحہ کے سوا ماضی کی کوئی یاد نہیں تھی۔" کچھ دیر ٹھہر کر وہ گہرے اندوہ بھرے سے بولے۔

"آج سے پہلے مجھے ملیحہ کا نام نہیں معلوم تھا مگر بے خودی کے عالم میں وہ اکثر ملیحہ کا ذکر کرتا چلا جاتا۔ دھیرے دھیرے اس کی باتوں سے بہت کچھ سمجھ گیا یہ بھی کہ اسے ملیحہ کے سوا کچھ یاد نہیں یہاں تک کہ وہ خود کو بھی بھول چکا ہے اسی لیے دانستہ میں نے اس سے کبھی اس کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اپنے وجود کا بوجھ اٹھانے کے لیے اس کی طاقت کم پڑ گئی تھی' اس کے ذہن پر نیا بوجھ کیا ڈالتا۔ ——— ڈر لگتا تھا کہ ساز کے تار کی طرح اس کے اعصاب آخری حد تک تنے ہوئے ہیں کہیں ہاتھ لگانے سے ٹوٹ نہ جائیں۔ بکھرے گا اس کو ٹھیس پہنچانا عقلمندی نہیں پھر اب تو وہ خود میں سمٹ گیا ہے پہلے ملیحہ کے لیے بڑے جھگڑے کرتا تھا اب تو کئی سال ہو گئے کبھی دورے کی حالت میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔"

"وجدان کو دورے پڑتے ہیں۔" آفاق کے کان کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہے ہوں بتائیں یا نہ بتائیں پھر کچھ سوچ کر بتانے لگے۔

"وہ کہتا ہے اسے ملیحہ نظر آتی ہے۔" آفاق اور منیر حسن کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب تمہارا شک صحیح ہے۔ وہ اب تک تباہ حال ہے۔" آفاق کی زبان گنگ ہو گئی تھی وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

اندھیرے میں سفید شلوار قمیص کی جھلک دیکھ کر آفاق پیپل کے درخت کے پاس آیا فاصلہ کم ہوا تو چاند کی ہلکی سی روشنی میں وجدان کے چہرے کے نقوش بھی دیکھنے لگا لیکن آفاق کو بس اس کا چہرہ ہی وجدان کے جیسا لگا باقی تو وہ اجنبی تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے آفاق کو شدت سے پچیس سال کا وجدان یاد آنے لگا جو بے فکرا سا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ وہ سنجیدہ مگر خوش مزاج تھا۔ ہمہ وقت خود میں مگن رہنے والا۔ اس کی طبیعت کی سادگی سے لوگ بلاوجہ ہی اس کی طرف

اثر پلٹ ہو جاتے' مگر اس کی ذات میں بہت گہرائی تھی اس کے جذبات اندر ہی کہیں چھپے رہتے اور سطح پر کوئی ہلچل نہ ہوتی وہ ہر وقت مطمئن سے انداز میں مسکراتا رہتا لیکن اس وقت آفاق کے سامنے پینتیس سال کا ایسا مرد کھڑا تھا جو خود سے تعلق توڑ چکا تھا اس کے اندر اضطراب کی لہریں اٹھا کرتی تھیں لیکن اس نے چہرے پر سکون اوڑھ رکھا تھا۔ ایسا سکون جس میں جلد چپ تھی اسے دیکھ کر ہر بار لگتا کہ وہ گہری سوچ میں ہے لیکن آفاق کو پتا تھا' اب اس کے دماغ کو سوچنے کی عادت نہیں رہی۔ وہ دس سال سے زندگی کو اس طرح سے جی رہا تھا جیسے آخری پل بچے ہوں۔

آفاق اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا مگر اسے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وجدان کو اس کی موجودگی کا علم ہے بھی یا نہیں وہ پلکیں جھپکائے بغیر زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا تھا۔" وجدان کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی وہ یوں ہی خاموش رہا۔

"جس طرح تمہیں ڈھونڈا ہے اگر دریا میں سے سوئی تلاش کرتے تو شاید وہ بھی مل جاتی لیکن تم نہیں ملے... اک بار ایک مبہم سی خبر آئی تھی کہ تمہیں شہر سے باہر جانے والے راستے پر دیکھا گیا ہے مگر میں نے وہ خبر تمہارے گھر والوں سے چھپالی کیونکہ اس خبر میں تمہارے پاگل پن کی تصدیق تھی لیکن میں نے اور ساجد نے تمہیں سندھ میں ہر جگہ تلاش کر لیا پولیس کی مدد لی... اخباروں میں اشتہار چھپوائے یہاں تک کہ مزمل بھائی نے تو اپنی نوکری تک چھوڑ دی۔ تین سال وہ تمہاری تلاش میں دربدر بھٹکے ہیں وہ تو افغانستان کے بارڈر تک ہو آئے پھر جیسے جیسے تمہارے ملنے کی امید کم ہوتی گئی ان کی ہمت بھی جواب دے گئی انکل تو پہلے ہی ان کے آسرے پر تھے... بالکل ہی ڈھے گئے۔ آنٹی کو ہمیشہ یہ گلٹ پریشان کرتا رہا کہ تم ان سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ میں کبھی انہیں ملیحہ کے انتقال کے بارے میں بتانے کی ہمت نہیں کر سکا ڈر رہا تھا کہیں وہ بیچ نہ مر جائیں۔" پھر لمبی خاموشی کے بعد پوچھنے لگا۔

"کیا ہم تمہیں کبھی یاد نہیں آئے۔" وجدان نے آہستہ سے سر دائیں بائیں گھما کر انکار میں جواب دے دیا۔

"کمال ہے۔" آفاق کو غصہ آگیا۔

"ہم نے وہاں اپنی زندگیاں حرام کر لیں اور تم یہاں عبداللہ بنے آرام سے جی رہے ہو۔"

"میں آرام سے نہیں ہوں آفاق۔" آفاق کو اس کے چہرے کے تاثرات کا تو اندھیرے کی وجہ سے ٹھیک اندازہ نہیں ہوا مگر یہ کہتے ہوئے اس کی آواز کا ٹھہراؤ آفاق کو سوئی کی طرح چبھا تھا۔ بے اختیار اسے گلے لگا کر بھینچتے ہوئے آفاق کہنے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا وجدان تم فکر مت کرو۔" آفاق کی آنکھیں پرنم تھیں۔

☆ ☆ ☆

تہجد کا وقت ہو چلا تھا۔ چارپائی پر کھلی آنکھوں سے چت لیٹا وجدان اٹھ بیٹھا اس نے ایک نظر سوئے ہوئے منیر حسن اور آفاق پر ڈالی پھر اٹھ کر مولوی صاحب کی چارپائی کے پاس آگیا اور انہیں جگانے کے لیے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہلایا' وہ بھی جاگ رہے تھے اس کے ہاتھ رکھتے ہی آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اسے دیکھنے لگے انہیں جاگتا دیکھ کر وجدان پلٹنے لگا تو مولوی صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اسے روکا پھر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"بیٹھ جا عبداللہ تجھ سے دو باتیں کر لوں پھر تو نے چلے جانا ہے۔"

"میں کہاں جاؤں گا۔" اس نے حیرت سے پوچھا تو مولوی صاحب جھنجلا گئے۔

"تیرا دھیان بھی پتا نہیں کدھر رہتا ہے کھانے پر منیر حسن بتا تو رہا تھا کہ کل کراچی کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ ویسے یہاں اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا یہ کہہ رہا تھا بعد میں آکر نبٹاؤں گا ابھی تو اسے تجھے تیرے ماں باپ سے ملانے کی جلدی ہے۔"



"میں کیسے جا سکتا ہوں مولوی صاحب۔" اس کی آواز میں تذبذب تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیوں تیرا ماں باپ سے ملنے کو دل نہیں کر رہا۔"

"ہاں لیکن..." بات ادھوری چھوڑ کر وہ کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا جس کے پار ملانی جی بچے کو ساتھ لیے ہوئے کمرے میں تھیں۔ پتا نہیں وہ بھی سوئی تھیں یا ان دونوں کی طرح جاگ رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا پھر جیسے اس کی الجھن کو پا گئے۔

"تو ہاجرہ کی پروا مت کر تیری سگی ماں نے تیرے بغیر دس سال کاٹے ہیں یہ بھی گزارا کر لے گی۔"

"پر مولوی صاحب۔"

"چل رہنے دے عبداللہ مجھے پتا ہے تو نفلوں کا بھوکا ہے پر پہلے فرض تو پورے کر لے' نفلوں کی باری تو بعد میں آئے گی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولے تو وجدان نے دھیرے سے کہا۔

"میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے مولوی صاحب۔"

"اور میں عبدالخالق ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"خیر ہو وکیل صاحب دس سال بعد تعارف کا خیال آیا ہے۔" پھر یکدم سنجیدہ ہو گئے۔

"چلو آیا تو سہی کرم ہے مالک کا جس نے آج تک تیرے لیے راستہ بنایا ہے وہ آگے بھی راہیں کھولے گا تو بس دیکھتا جا۔" پھر آسمان پر نظر ڈالی۔

"چل اٹھ وجدان مصطفیٰ تہجد کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

فجر کی نماز کے بعد آج منیر حسن اور آفاق بھی مسجد میں بیٹھے وجدان کی تلاوت سن رہے تھے۔ تلاوت ختم ہوئی تو مولوی عبدالخالق مسجد میں موجود لوگوں سے منیر حسن اور آفاق کا تعارف کرانے لگے۔ اس کے بعد جب انہوں نے وجدان کا تعارف کرایا تو سب کے سب حیرت میں پڑ گئے۔ انہوں نے تو عبداللہ کو اپنا حصہ مان لیا تھا۔ آج اس کی اپنوں میں واپسی تھی۔ خوشی اور غم کی ملی جلی سی کیفیت تھی۔ ان کے مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہی یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ تصدیق کے لیے مسجد میں آنے لگے۔ وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر گھر آئے تو یہاں بھی عورتیں جمع تھیں۔ عبداللہ تو جانا پہچانا تھا پر وجدان اجنبی تھا سب عورتیں اس اجنبی کے بارے میں سوال کر رہی تھیں مولوی صاحب کی ہدایت پر ملیحہ کا نام لیے بغیر ملانی جی نپے تلے جواب دیتی جا رہی تھیں اور پاس کھڑا نو سال کا بچہ ان معلومات کو تیزی سے دماغ میں فیڈ کرتا جا رہا تھا ان معلومات میں سب سے جان لیوا خبر تھی۔

"آج عبداللہ اپنے گھر چلا جائے گا۔" اس خبر نے بچے کو سہما دیا وجدان کو اندر آتے دیکھ کر وہ بھاگتا ہوا اس سے لپٹ گیا پھر معصومیت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا وجدان کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی اس نے مسکراتے ہوئے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو بچہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابو' ملانی جی کہہ رہی ہیں آپ چلے جائیں گے۔" اس کے بالوں میں گردش کرتی وجدان کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔ اسے چپ دیکھ کر بچے نے پھر سوال کیا۔

"بتائیں نا ابو آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔" وجدان گھٹنا زمین پر ٹکا کر اس کے مقابل بیٹھا پھر اپنے ساتھ لگا کر اس کے گال چومتے ہوئے بولا۔

"میں کبھی تمہیں خود سے الگ نہیں کروں گا۔" اس ایک جملے نے بچے کو پرسکون کر دیا اور اس نے اپنی باہیں وجدان کے گلے میں ڈال دیں وجدان کو شرارت سوجھی اس نے ایک دم سے بچے کو گدگدایا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا مولوی صاحب ہنس کر بولے۔

"دیکھ رہے ہیں منیر حسن باپ کون سا کم ہے پر بیٹا تو باپ سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔" پھر ان دونوں کی طرف آئے اور بچے کو ہاتھ پکڑ کر وجدان کے حلقے سے نکال کر اپنے سامنے کیا اور بولے۔

"بھلا یہ کوئی پوچھنے کی بات تھی جو تم نے پوچھی ہے بچے تو ماں باپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں اب جہاں تمہارے ابو جائیں گے تم بھی وہیں جاؤ گے۔"

"بھلا کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب۔" ملانی جی تڑپ اٹھیں۔

"عبداللہ کے تو وارث آگئے ہیں ان کو کیسے انکار کریں حق بنتا ہے پر اسے کیوں مجھ سے دور کر رہے ہیں۔" مولوی صاحب نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر وجدان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بولے۔

"اس کا وارث یہ بیٹھا ہے حق بنتا ہے اس کا اگر انکار کر سکتی ہے تو کر دے۔" اور ملانی جی نے بے ساختہ روتے ہوئے چادر کا پلو منہ پر رکھ کر چہرہ چھپا لیا۔

آفاق نے اپنے بابا کی طرف دیکھا پھر دونوں وجدان کو دیکھنے لگے جو سر جھکا کر کھڑا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مولوی صاحب ایک نظر اس کے بے چین چہرے پر ڈال کر بولے۔

"تجھے پتا ہے عبداللہ تیرے گھر میں کیوں ہے۔" ملانی جی سے پوچھ کر وہ خود ہی کہنے لگے۔

"کیونکہ تیرے آنگن میں اس کے نام کا تعویذ گڑا ہے اور یہ ہے اس کا تعویذ۔" انہوں نے بچے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ نہیں گیا تو عبداللہ نہیں جائے گا۔ اس کا جانا ضروری ہے ہاجرہ اس کے جانے میں رکاوٹ نہ ڈال... ماں باپ کی آنکھیں ترس گئی ہوں گی دس سال کم نہیں ہوتے۔"

"میرا آنگن خالی ہو جائے گا مولوی صاحب۔" وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولیں۔

"تجھے پتا تو تھا جس نے دیئے ہیں وہ لینے پر بھی قادر ہے پھر دل کیوں لگایا ہاجرہ۔" ان کی آزردگی بتا رہی تھی کہ دل تو وہ بھی لگا چکے تھے وہ اٹھ کر وجدان کے پاس گئے۔

"پہلے لگتا تھا اسے اس کی ماں اپنے لیے پیدا کر کے چھوڑ گئی پر اب یقین ہو چلا ہے اس کی ماں نے تو اسے پیدا ہی تیرے لیے کیا تھا سو تیرے رب کا ہی کھیل ہے بندہ بندے سے جڑا ہے اس لیے تقدیریں جوڑ دیتا ہے اب اگر اس کی تقدیر [illegible] میں لکھی ہے تو کوئی کیا روکے۔ جا لے جا بھی اپنے ساتھ لے جا۔"

"شکریہ مولوی صاحب۔" کل سے جو بے چینی اس میں پھیلی تھی وہ ایک دم سے ختم ہو گئی اب وہ پرسکون نظر آ رہا تھا پھر اس نے جا کر پیچھے سے ملانی جی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں ملانی جی میں کوئی ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں میں آپ سے ملنے آیا کروں گا۔" ملانی جی نے اس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"جلدی جلدی آنا عبداللہ تیرے بغیر جی اداس رہے گا۔"

"اب یہ سب چھوڑ اور جلدی جا کر ہانڈی روٹی کا کر دوپہر کے کھانے کے بعد چودھری صاحب کی گاڑی آجائے گی انہیں لاہور لے جانے وہاں سے کل صبح انہیں کراچی کی فلائٹ پکڑنی ہے۔" وہ ان کا دھیان بٹانے کے لیے تیز تیز بولنے لگے۔

کمرے میں آ کر اس نے بیگ الماری پر سے اتار کر بستر پر رکھا پھر الماری میں سے اپنے اور اپنے بیٹے کے کپڑے نکال کر بیگ کرنے لگا۔ ضمیر حسن اور آفاق دوپہر کے کھانے پر چودھری نواز کی حویلی میں مدعو تھے کھانے کے بعد وہ دونوں رخصت لے کر چل پڑے۔

آفاق نے کل والی جگہ پر ہی جیپ رکوائی اور باقی کا راستہ پیدل طے کر کے باپ بیٹے مولوی صاحب کے گھر پہنچے تو وہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ سب گاؤں والے وجدان کو اللہ حافظ کہنے دروازے پر جمع تھے۔ سب سے فرداً فرداً ملتے وجدان نے ان دونوں کو آتے دیکھا تو سب کو چھوڑ کر مولوی صاحب کے گلے لگ گیا پھر الگ ہو کر کہنے لگا۔

"میں ان لوگوں میں سے تھا جن کا ایمان مشروط ہوتا ہے جب تک دعائیں قبول ہوتی رہتی ہیں اللہ کی حمد و ثناء کرتے رہتے ہیں پر جہاں اپنی مرضی میں انیس بیس کا فرق آیا اللہ پر سے یقین ہی اٹھ گیا مانتے ہیں وہ قادر مطلق ہے پر اس کی قدرت کو اپنی خواہشوں کے تابع



بھی کرنا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ وہ وہی کرے جو ہماری مرضی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو جھگڑنے لگتے ہیں جیسے نعوذ باللہ وہ ہماری مرضی کا پابند ہے اور ہماری منشا سے ہٹ کر اس نے کوتاہی کی ہے۔ اللہ پر اعتراض اٹھانا کفر کی نشانی ہے اور وہ بدنصیب لوگ کفر کی پستیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں مگر بے خبری ایسی کہ سر اٹھا کر فخر سے کہتے ہیں ہم صاحب ایمان ہیں۔ میں کفر کے گڑھے میں گردن تک دھنس چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ میرے دل پر کفر کی مہر لگا دے لیکن آپ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے ان پستیوں سے نکال لیا۔" مولوی صاحب یوں مسکرائے جیسے کسی بچے نے بڑائی کی بات کہہ دی ہو۔

"او جھلیا کسی دل میں ایمان کی روشنی کسی کے ڈالے سے نہیں ڈلتی یہ معجزہ تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے جب اس نے ہی تیری آخرت سنوارنے کا بیڑا اٹھا لیا تو پھر تو کون ہوتا ہے اپنی عاقبت خراب کرنے والا کبھی کبھی دل کرتا ہے تجھ سے حسد کروں... ایسا کیا ہے تجھ میں جو اس نے تیرے دل میں اپنی لو کو بجھنے نہیں دیا۔"

"میں بس اس کا بندہ ہوں مولوی صاحب اور اپنے بندوں پر احسان کرنا اس کی عام عادت ہے۔ اس کے احسان تو کوئی بھی نہیں چکا سکتا پر آپ کے احسان بھی مجھ پر کم نہیں میں آپ کے پاس خالی ہاتھ آیا تھا مگر جاتے ہوئے میرا دامن بھرا ہوا ہے... پختہ ایمان کامل یقین اور صبر سے استقامت... یہ سب میں نے آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کا احسان کیسے چکاؤں گا مولوی صاحب۔"

"جو کچھ بھی یہاں سیکھا ہے اسے عمر بھر یاد رکھنا اور عمل بھی کرنا' احسان اتر جائے گا۔" مولوی صاحب بڑی متانت سے احسان اتارنے کا طریقہ بتا رہے تھے پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر بولے۔

"اللہ حافظ۔" تو وہ اللہ حافظ کہتا دوبارہ ان کے گلے لگ گیا پھر ان سے مل کر ملانی جی کے پاس آیا جو بچے کو ساتھ لگائے کھڑی تھیں۔

"اللہ حافظ ملانی جی۔" ملانی جی کو بازو میں لے کر اس نے کہا پھر اپنا سر ان کے آگے جھکا دیا وہ وجدان کے سر پر ہاتھ پھیر کر بوسہ دے کر بولیں۔ "اللہ کے سپرد۔"

"چلو وجدان دیر ہو رہی ہے۔" آفاق اس کے پاس آ کر بولا۔

"میں بس بیگ لے کر آتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر کہتا دروازے سے اندر صحن میں آ گیا اس نے کندھے سے لگانے کے لیے بیگ کا اسٹرپ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ کسی نے بیگ پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے روک دیا اس نے پلٹ کر اس نازک ہاتھ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر سامنے دیکھتے ہی اس کے اندر ہلچل مچ گئی۔

ملیحہ دونوں پاؤں اوپر رکھے چارپائی پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر بیگ پر رکھا ہوا تھا اس کی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں طغیانی تھی اس کے چہرے پر ایک خوف سا تھا اور گداز ہونٹوں کی کپکپاہٹ خاموشی کی زباں سے وجدان کو رک جانے کے لیے کہہ رہی تھی وہ یقیناً" بے بسی کی انتہا ہوتی ہو گی جہاں ایک مرد کی آنکھیں ڈبڈبا جائیں۔ وجدان اسٹرپ والا ہاتھ پیچھے گراتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"میں کیا آپ کو بھول جاتا ہوں جو بار بار یاد دلانے چلی آتی ہیں کیسے یقین دلاؤں کہ آپ یہاں ہیں... چاہوں تو بھی مرتے دم تک آپ کو بھلا نہیں سکتا۔" کہتے کہتے اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا پھر سرگوشیوں میں کہا۔

"کون جانے زندگی کا موت سے کتنا فاصلہ ہے پر آپ کا یوں آنا جانا مجھے مرنے سے پہلے ہزار بار مار دے گا۔ اللہ کے لیے مجھ پر رحم کریں جب تک سانسیں ہیں تب تک تو جی لینے دیں۔" یہ التجا گراں گزری تھی ملیحہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے وجدان میں اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی دھیرے سے بولا۔

"مجھے اجازت دیجیے۔" ملیحہ نے سختی سے پلکوں کو بند کیا اور سارے آنسو ایک ساتھ گرا دیے پھر دھیرے

سے اپنا ہاتھ سمیٹ کر اٹھا لیا۔
آج شاید ملیحہ کو بھی وجدان پر رحم آ گیا تھا۔ وجدان نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو چہرے کو ذرا سا موڑے یوں دوسری طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کا جانا دیکھا نہ جائے گا۔ وجدان کا اس کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' جانتا تھا اس کا جانا ملیحہ سے سہا نہیں جائے گا۔۔۔ لمحہ لمحہ کسی کو خود سے دور ہوتے دیکھنا آسان نہیں اور یہ مشکل کام ہمیشہ وجدان نے کیا تھا ملیحہ کو بس ایک بار اسے خود سے دور جاتے دیکھنا پڑا تھا اور اس دن وجدان کے جانے سے ملیحہ کی جان چلی گئی تھی۔۔۔ مگر جانا مجبوری تھی۔ وجدان نے نظر چرا کے اسٹریپ کندھے پر رکھا اور آہستگی سے اٹھ گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا وہ جا چکی تھی۔ وجدان کو شکایت سی ہونے لگی۔
"خود سے میرا جانا دیکھا نہیں جاتا اور مجھے بار بار اس امتحان میں ڈالتی ہیں۔" پھر وہ مڑا اور دروازے سے نکل گیا۔ آفاق کو مولوی صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا پر جو اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے کیسے جھٹلاتا وہ دم بخود سا وجدان کی تقلید میں گھر سے باہر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کا یہ نیا موڑ یوٹرن ثابت ہوا تھا۔ وجدان عجیب نظروں سے اپنے گھر کے گیٹ کو دیکھ رہا تھا جہاں سے دس سال پہلے ایک قیامت کی رات کو اس نے ایک دل دہلا دینے والے سفر کا آغاز کیا تھا۔۔۔ آج وہ سفر ختم ہوا۔ آفاق نے ٹیکسی کی ڈگی میں سے بیگ نکال کر پیسے دے کر ڈرائیور کو فارغ کیا پھر گیٹ کے پاس آ کر گھنٹی بجا دی۔ گیارہ بارہ سال کے بچے نے چھوٹا گیٹ کھول کر باہر گردن نکالی پھر پورا باہر آ گیا۔
"آفاق انکل آپ آ گئے اور لاہور سے میرے لیے چاکلیٹس لے کر آئے ہیں نا۔"
"او نو۔" آفاق نے اپنا ماتھا پیٹا۔
"سوری زوار بیٹا تمہیں چاکلیٹس ابھی نہیں مل سکتیں۔۔۔ وہ میرے سامان میں ہیں اور سامان میں نے ایئرپورٹ سے ہی پاپا کے ساتھ گھر بھیج دیا چلو خیر شام میں لے آؤں گا۔" بچے کو اداس ہوتے دیکھ کر آفاق جلدی سے بولا۔
"پرامس۔" اسے انگلی دکھا کر مشکوک انداز میں کہا۔
"پکا پرامس۔"
"تو ٹھیک ہے مگر منال کو پتا نہیں چلنا چاہیے نہیں تو وہ موٹی ساری چاکلیٹس کھا جائے گی۔" اس نے فوراً "رازداری" کا وعدہ لیا۔
"ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گا۔"
"یہ کون ہیں؟" اب اس کی نظر سر اٹھا کر اپنے گھر کو دیکھتے وجدان پر پڑی تھی۔ آفاق کے ہونٹ مسکرانے لگے پھر وہ بچے کے پاس آ کر سرگوشی میں بولا۔
"جا کر دادی سے کہو وجدان چاچو آئے ہیں۔"
"یہ وجدان چاچو ہیں۔" وہ اتنی زور سے بولا کہ آفاق کانوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہٹ گیا۔ وجدان بھی اس طرف دیکھنے لگا تھا۔
"یہ سرپرائز میرے لیے نہیں ہے اندر جا کر دادی کو بتاؤ اور ہاں آواز اس سے دوگنی ہونی چاہیے۔" وہ کان مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ارے جا نا یار۔" آفاق نے آنکھیں پھاڑ کر وجدان کو دیکھتے بچے کو زبردستی اندر کی طرف دھکیلا وہ بھی جیسے ہوش میں آیا اور چلاتا ہوا اندر بھاگا۔
"دادی' دادی وجدان چاچو آ گئے۔" اسے بھیج کر آفاق نے بیگ اٹھا کر کندھے پر رکھا پھر جیسے بچے کی انگلی پکڑ کر وجدان سے کہا۔
"جناب آپ کو آپ کے گھر میں آنے کا دعوت نامہ میں تو دوں گا نہیں اس لیے خود ہی اندر آ جائیں۔" اور بچے کو لے کر اندر چلا گیا۔ زوار کے لاؤڈ اسپیکر نے کام دکھا دیا تھا۔ عائشہ مصطفیٰ اور انیقہ آگے پیچھے تمتمائے چہروں کے ساتھ برآمد ہوئی تھیں مگر آفاق کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی تبھی وجدان سر جھکائے چھوٹے گیٹ سے اندر آیا تھا۔ وہ سیدھا ہوا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عائشہ



مصطفیٰ دیوانی ہو گئیں وہ تیزی سے اس کی طرف آئیں اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ساون بھادوں کی طرح ان کی آنکھیں برس رہی تھیں پھر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیے پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگیں۔
"کیسے ہو بیٹا۔"
"ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور عائشہ مصطفیٰ کی ممتا امڈ آئی۔
"ماں واری۔" کہہ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا وہ بے تحاشا اس کے سر اور شانوں کو چوم رہی تھیں۔ پتا نہیں اسے ماں کا چہرہ یاد آیا تھا یا نہیں مگر ممتا نے اپنی پہچان کرا دی تھی۔
بچپن میں جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک جاتا تو ماں کی گود میں آ کر سو جاتا آج تو اس کے ساتھ برسوں کی تھکن تھی اس نے اپنے بازو ان کے گرد پھیلا لیے اور آنکھیں سکون سے بند کر لیں۔
"عائشہ یہ زوار کیا کہہ رہا ہے۔" مصطفیٰ عظیم کی کانپتی آواز پر وہ ان کی طرف مڑیں اور وجدان ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔
"وجدان۔" انہوں نے سرگوشی میں اس کا نام لیا پھر وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف چلے آئے ان کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور ان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے رہے پھر کھینچ کر اسے گلے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر وہ اسے سینے سے لگائے کھڑے رہے آخر آفاق آگے آیا۔
"آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی انکل آئیں اندر چل کر بیٹھتے ہیں چلیں بھابھی سب کو اندر لے جائیں۔" اس نے گم سم کھڑی انیقہ سے کہا۔ جو رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔
"ہوں۔" وہ چونکی پھر جلدی جلدی کہنے لگی۔
"ہاں ہاں اندر چلو آئیں امی۔۔۔ ابو آپ بھی چلیں۔" پھر وجدان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"بہت انتظار کیا ہے تمہارا اب آئے ہو تو دروازے پر نہ کھڑے رہو۔" سب کو بٹھا کر لاؤنج کے پنکھے چلاتی وہ خود بھی بیٹھ گئی مگر فوراً ہی اٹھ گئی۔
"ارے مزمل کو بتانے کا خیال ہی نہیں میں انہیں فون کر کے آتی ہوں۔" وہ فون کر کے لوٹی تو ہر کوئی خاموش تھا۔
بڑے صوفے پر مصطفیٰ عظیم' وجدان کو پہلو میں لیے بیٹھے تھے جو ساکت نظروں سے ٹیبل کو گھور رہا تھا دوسری طرف اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھی عائشہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے آنسو بھی پونچھتی جا رہی تھیں آفاق الگ وجدان کے بیٹے کو ساتھ لیے گم سم بیٹھا تھا اور خود انیقہ کے دونوں بچے کونے میں چھپے آنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ انیقہ اس خاموشی پر حیران ہوئی۔
"یہ کیا بھئی اتنے سالوں بعد وجدان لوٹا ہے پھر بھی گم سم بیٹھے ہیں کچھ بولیں امی اور ابو آپ بھی۔۔۔ ذرا صاحبزادے کے کان تو کھینچیں آخر اس نے ہمیں اتنا پریشان کیوں کیا۔"
"سوال تو بہت سے کرنا چاہتا ہوں پر سمجھ نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں مجھے تو آج بھی یقین نہیں آ رہا کہ وجدان مجھے چھوڑ کے جا سکتا ہے یہ میرے بغیر دس دن نہیں رہ سکتا تھا آج دس سال گزار کر آیا ہے۔"
"میں نے دس سال نہیں گزارے ابو دس سالوں نے مجھے گزار دیا۔" ان کی بات پر وجدان عجیب سے لہجے میں بولا۔
"کیسی باتیں کر رہے ہو۔" عائشہ مصطفیٰ کو اس کا ٹھہرا ہوا لہجہ خوفزدہ کر رہا تھا۔
"کچھ تو ماں باپ کا خیال کرو وجدان تم نے پہلے ہی بہت دکھ دیے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگیں تو انیقہ اٹھ کر انہیں چپ کرانے لگی۔ گیٹ پر کسی نے بیل بجائی تھی۔
"کیا بات ہے مزمل تو بھائی کے آنے کا سن کر۔۔۔ اڑ کے آ گئے۔" مزمل کی آمد کا اندازہ لگا کر انیقہ ہنستی ہوئی اٹھ گئی۔ کچھ سیکنڈ بعد مزمل دوڑتا ہوا لاؤنج میں آیا تھا۔
"مزمل' دیکھو ذرا کون آیا ہے؟" مصطفیٰ عظیم اب

سنبھل چکے تھے مسکرا کر بولے۔

"آپ نے اس سے پوچھا یہ اب یہاں کیوں آیا ہے۔" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا وجدان کو دیکھ کر خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں مگر لہجہ اجنبیت لیے ہوا تھا پھر چٹکی بجا کر وجدان کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ سخت آواز میں بولا۔

"اٹھو اور ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ یہاں کسی کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو مزمل اتنے سالوں بعد تو وہ آیا ہے اور تم اسے جانے کو کہہ رہے ہو۔" عائشہ بے چاری بولیں باقی بھی ہر کوئی اس صورت حال پر گھبرا گیا تھا۔ مزمل دھاڑا۔

"یہ یہاں نہیں رہ سکتا۔" مصطفیٰ عظیم بھڑک گئے۔

"بس کرو مزمل تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔"

"اس نے جانے کا فیصلہ کیا آپ سے پوچھ کر کیا تھا۔" سکون سے بیٹھے وجدان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ غصے سے بولا تو لطیفہ پریشان ہو اٹھی۔

"چھوڑیے مزمل اب تو وہ لوٹ آیا ہے۔" مزمل نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ارے اس کا کیا بھروسہ کل پھر اٹھ کر نکل پڑے مجھے کیا اسے ڈھونڈنے کا سوا اور کوئی کام نہیں۔ جب دل چاہا چلے گئے جب دل چاہا آ گئے۔ کوئی مذاق ہے۔ دل اس کا محبت اس کی جذبات اس کے باقی ہم سب تو بے حس ہیں۔" بولتے بولتے وہ ایک دم آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر پلٹ گیا پھر ایک دم مڑا اور وجدان کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا آفاق نے دیکھا اس کی پلکیں نم ہو رہی تھیں پھر وہ وارننگ دینے کے انداز میں بولا۔

"اب اگر تم بتائے بغیر کہیں گئے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" وہ اسے گلے لگائے کہہ رہا تھا۔

"آئندہ پر کیوں چھوڑتے ہیں مزمل بھائی ابھی توڑ دیں نہ ٹانگیں اس کی نہ کہیں جا سکے گا اس کا بھروسہ تو واقعی نہیں کرنا چاہیے اب تو یہ اسٹری شیٹر ہو گیا ہے۔" آفاق ہنس کر بولا۔

"وجدان تمہیں ملا کہاں۔" کچھ دیر بعد جب سب نارمل ہو کر بیٹھ چکے اور لطیفہ سب کو اسکواش سرو کرنے لگی تو مزمل نے باتوں کے دوران آفاق سے پوچھا۔ آفاق گلاس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر آگے ہوتے ہوئے بتانے لگا۔

"آپ کو پتا تو ہے میں لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں لاہور ہائی کورٹ میں پاپا کسی چودھری نواز کے حق میں کیس لڑ رہے تھے جن کا بارڈر کے پاس واقع گاؤں چنگ والی میں اپنے ہی گاؤں کے بارسوخ شخص کے ساتھ زمین کے مسئلے پر تنازعہ چل رہا تھا۔ پاپا کی طبیعت پچھلے دنوں کافی خراب رہی تھی اس لیے جب فیصلے کی تاریخ آئی تو میں پاپا کے ساتھ چلا گیا فیصلہ چودھری نواز کے حق میں ہوا اور انہوں نے خوش ہو کر پاپا کو گاؤں آنے کی دعوت دے دی۔ میں نے سوچا اچھا ہے گاؤں کی کھلی فضا میں ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا اور دو تین دن کے لیے پاپا کو لے کر گاؤں چلا گیا وہیں مجھے وجدان ملا۔ پچھلے دس سال سے یہ گاؤں کے مولوی صاحب کے ساتھ رہ رہا تھا۔" مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آفاق کو وجدان کے متعلق ان کی باتیں یاد آئیں اور وہ ایک ہاتھ سے پیشانی مسلتے سوچ میں ڈوب گیا۔

وجدان کا بیٹا اب تک چپ کر کے بیٹھا آنکھیں گھما گھما کر ایک ایک کو دیکھ رہا تھا مگر مولوی صاحب کا نام سن کر وہ مچل گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتا ہوا وجدان کے بازو سے آ لگا۔

"ابو گھر چلیں۔"

"بیٹا اب ہم یہیں رہیں گے۔" وجدان نے پیار سے سمجھایا پر وہ مانا ہی نہیں اور کہتا رہا۔

"نہیں ابو یہ گھر اچھا نہیں ہے مولوی صاحب کے پاس چلیں۔" ابھی تک کسی نے بچے کی موجودگی کو اہمیت نہیں دی تھی اور اب وہ منہ بسورتا بچہ وجدان کو "ابو" کہہ رہا تھا آفاق کو چھوڑ کر ہر کوئی اس طرف متوجہ ہو گیا جو ابھی تک اپنی سوچ کے تانے بانے بن



رہا تھا۔

"یہ تمہارا بیٹا ہے۔" مصطفیٰ عظیم حیرت کے ساتھ وجدان سے گویا ہوئے۔ وجدان نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔" اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ادھر میرے پاس آؤ۔" مصطفیٰ عظیم نے ہاتھ پکڑ کر بچے کو خود سے قریب کر لیا۔

"ہم تمہارے دادا ہیں ہمیں بتاؤ ابو سے کیا کہہ رہے تھے۔"

"مولوی صاحب کے گھر جانا ہے۔" اس کی فرمائش پر وہ بولے۔

"تمہیں یہ گھر پسند نہیں۔" بچے نے منہ بناتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ مصطفیٰ عظیم مسکرا کر بولے۔

"لیکن آپ کو یہ گھر تو اچھا لگنا چاہیے یہ آپ کے دادا کا گھر ہے آپ کے ابو کا گھر ہے۔"

"مولوی صاحب کہتے ہیں۔" بچہ کافی ہوشیار تھا لسٹ میں اپنا نام سن کر ان کی ناک پر ٹو ٹپتے لگا معصومیت سے پوچھنے لگے اس سوال کی چالاکی پر سب ہنس پڑے تو وہ پزل سا ہو گیا مصطفیٰ عظیم اسے پیار کرتے ہوئے بولے۔

"سب سے زیادہ تو یہ گھر آپ کا ہی ہے بلکہ صرف آپ کا ہے اگر میں اور ابو تمہارا ٹھیک سے خیال نہ رکھیں تو ہمیں گھر سے باہر نکال دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس کے سعادت مندی سے کہنے پر ایک بار پھر سب ہنس پڑے۔

"مجھے تو اپنے پوتے سے مل لینے دیں۔" عائشہ بے تاب ہوئی جا رہی تھیں جلدی سے بولیں بچے کو اپنے پاس بلا کر گود میں بٹھا لیا مزمل بھی اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور بچے کو پیار کرنے لگا۔

"میں تمہاری دادی ہوں اور یہ تمہارے تایا ابو ہیں۔" انہوں نے اپنا اور مزمل کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"اگر تم ہمارے پاس رہو گے تو تایا ابو روز تمہیں سیر پہ لے کر جائیں گے۔"

"روز۔" وہ روز کو لمبا کھینچ کر بولا۔

"ہاں روز نوار اور مسعل کو بھی میں روز سیر پہ لے کر جاتا ہوں تمہیں بھی لے کر جاؤں گا۔" پھر وہ اپنے بچوں سے بولا۔

"نوار مسعل ادھر آؤ بیٹا دیکھو وجدان چاچو کا بیٹا آیا ہے۔" بچے کونے سے نکل کر باپ کے پاس آ گئے مزمل اور لطیفہ ان کا آپس میں تعارف کرانے لگے تو عائشہ وجدان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بیٹے کو تو لے آئے وجدان پر بیٹے کی ماں کہاں ہے؟" ان کی شوخی کے جواب میں وجدان پل بھر کو چپ سا ہو گیا پھر آہستہ سے کہا۔

"وہ تو اسے پیدا کر کے چھوڑ گئی۔" وجدان کی جھکی ہوئی آنکھیں رکا ہوا لہجہ..... ان سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہنستے مسکراتے چہرے پل بھر میں بجھ گئے تھے۔ ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے مصطفیٰ عظیم مصنوعی بشاشت کا سہارا لے کر بولے۔

"لطیفہ بیٹے بچہ لمبے سفر سے آیا ہے ذرا اسے نہلا دھلا کر کپڑے بدلوا دو تاکہ ہمارا پوتا شہزادہ لگنے لگے۔" فوراً۔۔۔ اٹھ گئی۔

"چلو بیٹا تائی امی نہلا کر پیارا سا بچہ بنا دیں گی۔"

"آپ رہنے دیں میں نہلا دیتا ہوں۔" وجدان فوراً بولتا ہوا اٹھ گیا لطیفہ ہنس دی۔

"یہ کام عورتوں کے کرنے کے ہیں۔" وجدان نے متانت سے جواب دیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر اس کے پاس ماں ہی نہیں جو اس کے کام کرتی اس لیے یہ سب مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا چلو مجھے اس کے کپڑے تو نکال دو میں پریس کر دیتی ہوں۔" وجدان نے آفاق کے پیروں کے پاس رکھا بیگ اٹھایا اور لطیفہ کی تقلید میں چل پڑا۔ ان کے جانے کے بعد مزمل نے سوچ میں ڈوبے آفاق کو دیکھا پھر اٹھ کر اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے زور سے چٹکی بجائی

آفاق ہنس پڑا۔
"کیوں بھائی یہ تم دونوں دوستوں کو گم ہونے کی بیماری ہے وہ چلتے چلتے گم ہو جاتا ہے تم بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتے ہو۔"
"مزمل بھائی مجھے آپ سے وجدان کے بارے میں ایک اہم بات کرنی ہے۔" اس کے مذاق کے جواب میں آفاق سنجیدگی سے بولا۔
"کیا بات ہے۔" مزمل بھی سنجیدہ ہو گیا۔
"دیکھیں بات کچھ اس قسم کی ہے کہ آپ کو حوصلے سے سننی ہو گی۔"
"ایسا کیا ہو گیا آفاق۔" عائشہ نے تو بات سننے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے آفاق جلدی سے بولا۔
"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آنٹی اس میں کوئی شک نہیں بات پریشانی کی ہے مگر ایسا نہیں کہ اس پریشانی کو حل نہ کیا جا سکے۔"
"تم بات بتاؤ آفاق۔" مصطفیٰ عظیم کو اس کے پہیلیاں بجھوانے سے الجھن ہو رہی تھی وہ ٹوک انداز میں کہہ کر وہ خود کو کسی بری خبر کے لیے تیار کرنے لگے۔ آفاق نے کہنا شروع کیا۔
"دراصل بات یہ ہے کہ ملیحہ کا انتقال ہو چکا ہے۔" اتنا بول کر وہ کسی رد عمل کے انتظار میں رکا مگر وہاں تاثرات بے جان ہی رہے بلکہ اسے رکتا دیکھ کر مزمل سپاٹ لہجے میں بولا۔
"ہاں پھر۔" آفاق نے افسوس سے اسے دیکھا اتنے سال بعد بھی ان کے دلوں میں ملیحہ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی سو وہ اپنے افسوس کو جھٹک کر کہنے لگا۔
"پھر یہ کہ وجدان اس صدمے کو سہہ نہیں سکا اور اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا یا عام لفظوں میں آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ پاگل ہو گیا تھا۔" اب آفاق نے ان کے چہروں پر جان کنی کے تاثرات دیکھے تھے آفاق کا دل خراب ہونے لگا۔
"اپنے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر بھی اس کے گزرے ہوئے حال کو سن کر اتنی پریشانی ہے اور میری بہن کی موت سے بھی فرق نہیں پڑا۔" معاملہ اگر اس کے عزیز دوست کا نہ ہوتا تو شاید وہ اٹھ ہی جاتا مگر کڑوا گھونٹ بھر کر کہتا گیا۔
"وجدان مولوی صاحب کے پاس اسی پاگل پن کی حالت میں پہنچا تھا مگر پھر کچھ ان کی کوششوں اور کچھ بچے کی خاطر آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھال لیا اور نارمل انسان کی لائف گزارنے لگا مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بظاہر نارمل نظر آتا ہے مگر ابھی تک اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہوئی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے دس سال پہلے کی اپنی زندگی یاد نہیں رہی۔"
مصطفیٰ عظیم جلدی سے بولے۔
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ تم نے خود دیکھا۔ وہ ہم سے نارمل انداز میں بات کر رہا ہے۔"
"آپ کو اگر اس کا انداز نارمل لگ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اس کے رویے کو محسوس نہیں کیا انکل آپ محسوس کرنے کی کوشش کریں تو پتا چلے گا کہ اس کے رویے اور آنکھوں میں کتنی غیریت ہے۔" عائشہ بولیں۔
"وہ غیریت نہیں ناراضی ہے۔ ناراض تو وہ پہلے سے تھا ملیحہ کے بعد ناراضی اور بڑھ گئی ہو گی اسی لیے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر رہا۔"
"آپ سمجھ نہیں رہے۔ جب میں گاؤں میں وجدان سے ملا تو وہ مجھے پہچان نہیں پایا مجھے اسے اپنا تعارف کروانا پڑا تھا۔"
"لیکن اگر وہ تمہیں نہیں پہچانتا تو تمہارے ساتھ یہاں کیوں چلا آیا۔" مزمل نے نکتہ اٹھایا۔
"میں اس بارے میں زیادہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ روز مرہ زندگی کے واقعات ہمارے شعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں جب ہم کوئی بات بھول جاتے ہیں تو دراصل وہ ہمارے شعور سے نکل کر لاشعور میں چلی جاتی ہے ہو سکتا ہے وجدان کے لاشعور میں میری پہچان ہو لیکن اس کا شعور مجھے پہچان نہیں پا رہا اور اسی کنفیوژن میں نہ تو وہ مجھے ریجیکٹ کر پا رہا ہے اور نہ ایکسیپٹ کر رہا ہے اس کے محتاط رویے سے تو ایسا ہی لگتا ہے بہرحال یہ بات تو کوئی ذہنی امراض کا ماہر ہی



صحیح طور پر بتا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔"
"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم ایک مفروضے کی بنیاد پر وجدان کو پاگل قرار دے کر سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جائیں۔" مصطفیٰ عظیم کے لہجے میں ناگواری تھی آفاق برا منائے بغیر رسان سے بولا۔
"بات صرف ایک مفروضے کی نہیں انکل وجدان کو الوژن بھی ہوتے ہیں۔"
"کیسے الوژن۔" مزمل نے پوچھا۔
"اسے ملیحہ نظر آتی ہے۔" آفاق نے جواب دیا۔ وہ تینوں کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے مگر آفاق کہتا گیا۔
"پہلے مجھے بھی مولوی صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا تھا مگر میں نے اپنی آنکھوں سے وجدان کو اکیلے بیٹھ کر باتیں کرتے دیکھا ہے وہ بولتے ہوئے اس طرح سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہاں پر کوئی موجود ہو۔" پھر وہ توقف کے بعد ہمدردی سے بولا۔
"میں آپ لوگوں کی فیلنگز کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے بھی اس طرح سوچ کر بہت تکلیف ہو رہی ہے لیکن اگر واقعی وجدان کو کوئی ذہنی مرض لاحق ہے تو فوراً علاج ضروری ہے پہلے ہی دس سال کی تاخیر ہو چکی ہے۔" پھر تسلی دینے کے لیے کہنے لگا۔
"لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ذہنی مریض کبھی ٹھیک نہیں ہوتے مگر یہ سوچ غلط ہے ذہنی امراض بھی نزلہ زکام کی طرح ہوتے ہیں علاج کرانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن علاج نہ کرانے سے مرض کوئی بھی ہو بگڑ سکتا ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ اگر ایک بار وجدان کو سائیکاٹرسٹ سے ملوا لیا جائے تو بہتر ہو گا۔" وہ آہستگی سے کہہ کر چپ ہو گیا پھر کچھ دیر کے بعد جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔
"میں چلتا ہوں۔" وہ جانے کے لیے مڑا پھر پلٹ کر بولا۔
"آپ چاہے میری باتوں پر یقین نہ کریں لیکن اتنی احتیاط ضرور کیجیے گا کہ وجدان سے اس کے ماضی کے بارے میں ایسی کوئی بات نہ پوچھیں جو اسے ڈسٹرب کر سکتی ہو خاص طور پر ملیحہ کے بارے میں۔" پھر وہ اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا اور وہ تینوں اس کی باتوں سے اتنا الجھ گئے تھے کہ اسے کھانے پر روکنے کا خیال ہی نہیں آیا۔
"کیا بات ہے میں کتنی بار آئی ہوں آپ لوگ کھوئے ہوئے لگتے ہیں۔" انیقہ لاؤنج میں آئی تو ان کے چہروں پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر بولی۔
"وجدان کہاں ہے؟" مزمل نے پوچھا۔
"بچوں کے ساتھ روم میں اپنے بیٹے کو سلا رہا ہے صاحبزادے نے ادھم مچا رکھا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بول کر مسکرانے لگی تو مزمل نے اسے دیکھ کر کہا۔
"ادھر آ کر بیٹھو۔" اپنے شوہر کے لہجے کی سنگینی کو محسوس کر کے اس نے غور سے ساس سسر کا جائزہ لیا ان کے چہرے بھی ستے ہوئے تھے۔
"کیا بات ہے۔" اس نے بیٹھ کر پوچھا پھر مزمل نے آفاق کی کہی ساری باتیں اس کے سامنے رکھ دیں وہ سن کر خاموش ہو گئی پھر کہا۔
"اگر وجدان ملیحہ کے لیے گھر چھوڑ سکتا ہے تو مجھے حیرت نہیں ہو گی اگر وہ ملیحہ کی موت کے صدمے سے پاگل ہو جائے۔"
"تم یقین کرتی ہو۔" مزمل بولا۔
"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ملیحہ کے لیے اس کی فیلنگز کس سے چھپی ہیں۔"
"اور یادداشت والی بات۔" مزمل نے اب کے ذرا ٹیڑھا سوال کیا۔ وہ سوچتے ہوئے بولی۔
"کہنا مشکل ہے لیکن میں نے وجدان میں غائب دماغی کی کیفیت محسوس کی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یادداشت کھو چکا ہے۔" وہ چپ ہوئی تو مزمل بولا۔
"تم سے یہ ساری باتیں کہنے کا مقصد ہے کہ تم اس بات کا خیال رکھو کہ گھر میں ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے جو اسے ڈسٹرب کر دے پتا نہیں آفاق کا اندازہ صحیح ہے یا غلط لیکن احتیاط کرنا بہتر ہے۔"
"میں خیال رکھوں گی۔" پھر مزید کہا۔
"آپ امی ابو کو لے کر آ جائیں میں کھانا لگواتی ہوں۔" وجدان اپنے بیٹے کے ساتھ کھانے کے میل

...دوسری پر بٹھایا پھر اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اس کے بعد وہ بیٹے کی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگا تو انیقہ نے اس کے ہاتھ سے سالن کا چمچہ لے کر کہا۔

"تم آرام سے اپنا کھانا کھاؤ اسے میں کھلا دوں گی۔" اور بچے کے لیے کھانا نکالنے لگی وجدان نے اس بار کوئی تعرض نہیں کیا اور اپنی پلیٹ میں کھانا نکال کر کھانے لگا۔ انیقہ نے بس کھانا نکال کر دیا اس کے بعد وہ خود ہی نوالے بنا بنا کر صفائی سے کھانے لگا۔ انیقہ اس کے برابر والی چیئر پر بیٹھ گئی اور سالن کا ڈونگا اپنی طرف کرتے ہوئے اس سے بولی۔

"باتھ روم میں تم نے تل بچار کھا تھا پر اب کیسے شرافت سے کھانا کھا رہے ہو۔"

"ابو کہتے ہیں کھانے کے وقت شرارتیں نہیں کرتے۔" چھوٹے بچے کی سنجیدگی بڑی پر لطف لگی تھی وہ مسکرا کر بولی۔

"باتیں بڑی بڑی کرتے ہو پر تم ابھی تک اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"آپ نے پوچھا کب؟" مصطفیٰ عظیم کو پانی پیتے ہوئے اچھو لگ گیا۔

"سنبھل کر انیقہ آخر وکیل کا بیٹا ہے۔" پھر اس سے بولے۔

"چلو اب پوچھ رہا ہوں کیا نام ہے تمہارا۔"

"کاکا۔" انہوں نے اس کا معصومیت بھرا چہرہ غور سے دیکھا انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بچہ بہت ہوشیار ہے انہیں شک ہوا وہ مذاق کر رہا ہوگا۔

"کاکا تو ابو کہتے ہوں گے اصل نام کیا ہے۔"

"نام تو یہی ہے۔" ہچکچا کر بولتے وہ وجدان کو دیکھنے لگا تو مصطفیٰ عظیم اس سے بولے۔

"وجدان اپنے بچے کا نام تو بتا دو۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"نام تو کوئی نہیں ہے۔"

"کیا۔" عائشہ حیران رہ گئیں۔

"حد ہو گئی وجدان بچہ اتنا بڑا ہو گیا اور تم نے ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔"

"کبھی خیال ہی نہیں آیا۔" وہ جز بز ہونے لگا تو مزمل جلدی سے بولا۔

"اس او کے یار نہیں رکھا تو اب رکھ لیتے ہیں بلکہ ابو میرے بچوں کے نام بھی آپ نے رکھے ہیں تو وجدان کے بیٹے کا نام بھی آپ ہی رکھ دیں۔" مصطفیٰ عظیم کھانا چھوڑ کر نام سوچنے لگے۔

"شایان مصطفیٰ کیسا رہے گا۔" عائشہ بولیں۔

"ایک دم میرے پوتے کے شایان شان کیوں وجدان بیٹے کا نام پسند آیا۔"

"ہاں شایان اچھا نام ہے۔" اسے بھی دلچسپی ہوئی۔

"اس کا مطلب شایان مصطفیٰ فائنل ہے۔" مزمل نے پوچھا۔

"بالکل۔" انیقہ نے کہا تو مزمل بچے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب بتاؤ بھتیجے تمہارا نام کیا ہے۔" اس نے ایک پل سوچا پھر مسکرا کر بولا۔

"میرا نام شایان مصطفیٰ ہے۔" وجدان کو کھانے میں ذرا بھی رغبت نہیں تھی بس شایان کے انتظار میں بڑی دیر کے بعد نوالہ منہ میں رکھتا اور آرام آرام سے چبانے لگتا۔ شایان کھا چکا تو اس نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے یہ کیا وجدان تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔" عائشہ ٹوک کر بولیں۔

"بس امی اور دل نہیں چاہ رہا ہے ابھی کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے کمرے میں جا کر سو جاؤ پھر شام میں باتیں کریں گے۔" انہوں نے خوشدلی سے اجازت دیتے ہوئے کہا مگر وجدان کرسی سے اٹھا ہی تھا مزمل کو سر جھکا کر سوچ میں ڈوبے دیکھ کر مصطفیٰ بولے۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" اسے لگا جیسے وہ جھجک رہا ہے پھر دھیرے سے کہا۔

"میرا کمرہ کہاں ہے؟" سب نے دم سادھ لیے دس کیوں بیس سال بھی گزر جائیں تب بھی کوئی اپنے



کمرے کا راستہ نہیں بھولے گا۔

"تم چلو میں بتاتی ہوں۔" انیقہ نے چویشن کو سنبھال لیا تھا۔ وجدان نے شایان کا ہاتھ پکڑا اور انیقہ کے پیچھے پیچھے ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ مزمل ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو مزمل پہلے کھانا تو ختم کر لو۔" متفکر سے مصطفیٰ عظیم اسے کھانے کے بیچ میں اٹھتا دیکھ کر بولے۔ مزمل نے پلٹ کر دھیرے سے کہا۔

"ایک دوست کو فون کرنے جا رہا ہوں اس کے بابا بہت اچھے سائیکاٹرسٹ ہیں۔" اس کا مطلب سمجھ کر مصطفیٰ اور عائشہ چپ سے رہ گئے پھر مصطفیٰ عظیم پست آواز میں بولے۔

"کوشش کرنا کل کی ہی اپائنٹمنٹ مل جائے۔" مزمل نے ان کی طرف دیکھا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ مل گیا تھا۔ مزمل نے اس کی خبر آفاق کو بھی دے دی ایک وہی تو تھا وجدان کے روز و شب کا ساتھی۔ اسے وجدان کے بارے میں سب علم تھا۔

"آفاق تم آٹھ بجے تک کلینک پہنچ جانا۔" مزمل نے یاد دہانی کروائی۔

"ضرور مزمل بھائی۔ وجدان کے لیے میں بھی بہت پریشان ہوں۔" مزمل نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ اور نظریں ایک نقطے پر مرکوز کر لیں جیسے گہری سوچ میں ہو۔

☼ ☼ ☼

آفاق آٹھ بجے کلینک پہنچا تو اسے انتظار نہیں کرنا پڑا وہ اور ڈاکٹر رحمت ساتھ ساتھ ہی کلینک میں داخل ہوئے تھے۔ آفاق نے جب اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت تپاک سے ملے۔

"اوہ تو آپ ہیں وجدان کے دوست مزمل سے فون پر آپ کے بارے میں بات ہوئی تھی۔" وہ بھاری ڈیل ڈول کے درمیانی قامت والے شخص تھے جن کی عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی بچوں جیسے معصوم چہرے پر سفید داڑھی تھی سر کے بال بھی سفید تھے جو اتنے ہلکے ہو چکے تھے کہ "گنج" نظر آتے تھے۔ موٹے عدسوں کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں وہ آفاق کو ساتھ لیے اپنے روم میں آ گئے اپنی چیئر پر بیٹھ کر انہوں نے سامنے کرسی پر بیٹھے آفاق کو مسکرا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی بچہ شرارت پر آمادہ ہو پھر دلچسپی سے بولے۔

"تو بتائیں آفاق مجھے سنانے کے لیے آپ کے پاس کیا ہے۔"

"سنانے کے لیے اتنا کچھ ہے ڈاکٹر صاحب کہ مجھے لگا کہ اس داستان کی طوالت میں الجھ کر کہیں کوئی اہم بات بتانے سے نہ رہ جائے اس لیے میں اپنی ان یادداشتوں کو لکھ لایا ہوں جو وجدان سے متعلق ہیں۔" آفاق نے فائل ٹیبل پر رکھ کر ان کی طرف کھسکا دی۔

"ارے یہ تو آپ نے کمال کا کام کیا ہے واقعی طویل گفتگو کے دوران بہت سی باتیں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔" بچوں کی طرح خوش ہو کر اچھلتے ہوئے انہوں نے فائل پکڑی پھر اس کے اندر صفحوں کو ہاتھ میں لے کر تیزی سے گراتے ہوئے دیکھا۔ پھر فائل بند کر کے کہا۔

"بس پھر آپ جائیں تاکہ میں ان صفحوں کو پڑھ سکوں۔"

"جی بالکل۔" ان کے جملے کے ساتھ ہی آفاق کھڑا ہو گیا۔

"جاتے جاتے اپنا نمبر ضرور دیتے جائیے گا تاکہ اگر میرے ذہن میں کوئی سوال آ جائے تو براہ راست آپ سے کونٹیکٹ کر سکوں۔"

"شیور۔" آفاق نے اپنا کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

☼ ☼ ☼

سب رات کا کھانا کھا رہے تھے جب فون بجنے لگا مزمل "میں دیکھتا ہوں" کہہ کر نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھا اور فون کا ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا دوسری

طرف ڈاکٹر رحمت اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں بولے۔

"تم خود ادھر اُدھر سے کام نہیں چلے گا بھائی کو لے کر کلینک آجاؤ اب اس سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔"

"آپ وقت بتادیں میں اسے لے کر آجاؤں گا۔"

"دیکھو میاں ویسے تو ہمارے پاس دو ہفتے تک ٹائم نہیں تھا مگر وجدان کا کیس پڑھنے کے بعد مجھے لگتا ہے دیر نہیں کرنی چاہیے اب اگر تم کل صبح نو بجے آسکتے ہو اور تو میں اپنی کل صبح کی اپائنٹمنٹس کینسل کر دیتا ہوں۔" ان کی بات سن کر مزمل جلدی سے بولا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں میں اسے لے کر صبح نو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"تو پھر ایسا ہے کہ وجدان کو کلینک لانے سے پہلے ایک خاص چیز تمہیں مجھ تک پہنچانی ہوگی۔" مزمل نے دھیان سے ان کی بات سنی اور چونکہ کھانے کے ٹیبل پر وجدان موجود تھا اور فون ڈائننگ ٹیبل سے بہت دور نہیں تھا اس لیے محتاط انداز میں کہا۔

"آپ فکر مت کریں انکل آپ کی مطلوبہ چیز ابو کے پاس ہے اور میں ان سے وہ لے کر آدھے گھنٹے میں آپ کے گھر پہنچ رہا ہوں۔" فون رکھ کر وہ مصطفیٰ عظیم سے بولا۔

"ابو آپ ذرا اپنے کمرے میں آئیں گے۔" انہیں مزمل کے لہجے میں غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا وہ فوراً اٹھ گئے۔

"چلو۔" ان کے ساتھ بیٹھا شایان جو ان تھوڑے سے دنوں میں ہی ان سے مل گیا تھا انہیں جاتے دیکھ کر وہ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"شایان کھانا کھا کر جاؤ۔" انیقہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر ٹوکا بھی مگر وہ۔

"کھا لیا تائی امی۔" کہہ کر مصطفیٰ عظیم کے کمرے کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ اچھلتا کودتا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسٹڈی ٹیبل کا دراز کھول کر کھڑے تھے پھر انہوں نے دراز میں سے ایک لفافہ نکال کر مزمل کو دیا۔ مزمل نے لفافہ لے کر اس میں سے تصویریں نکالیں اور دیکھنے لگا پھر ایک تصویر الگ کرکے بولا۔

"ہاں یہی تصویر چاہیے۔" پھر باقی تصویریں اور لفافہ اپنے ابو کو تھما کر چلا گیا۔ مصطفیٰ عظیم ان تصویروں کو دوبارہ لفافے میں ڈال رہے تھے کہ شایان اپنی پر تجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیزی سے ان کے پاس آگیا اور اچک کر تصویروں کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

"یہ کیا ہے۔" پھر ان تصویروں کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کون ہیں۔"

"تمہیں نہیں پتا کون ہیں۔" وہ اس کی لاعلمی کو شرارت سمجھ کر مسکراتے ہوئے بولے تو شایان اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو جھپک کر سر دائیں بائیں ہلانے لگا۔

"نہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ ہنس کر بولے اور تصویریں لفافے میں ڈالنے لگے تو شایان ان کا بازو دبوچ کر بولا۔

"بتائیں نا دادا ابو یہ کون ہیں۔" اب وہ اس کی بے کلی سی الجھن کو محسوس کرکے چونکے۔

"کیا تمہیں ابو نے کبھی ان کے بارے میں نہیں بتایا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم نے کبھی ان کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی۔" شایان نے ایک نظر غور سے تصویر میں نظر آتے چہرے کو دیکھا اور پھر دوبارہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ مصطفیٰ عظیم کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔

"وجدان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ بڑبڑائے پھر ہاتھ مار کر دراز بند کرتے ہوئے شایان سے بولے۔

"ابو نے نہیں بتایا تو کیا ہوا میں تمہیں بتاتا ہوں یہ کون ہیں آؤ میرے ساتھ۔" پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لیے صوفے پر جا بیٹھے پھر وہ ساری تصویریں اسے ایک ایک کرکے دکھاتے ہوئے دھیرے دھیرے اسے کچھ بتانے لگے۔

"میں یہ تصویریں اپنے پاس رکھ لوں۔" ان کی بات ختم ہوئی تو شایان بولا۔

"ہاں لیکن ابو سے ذکر مت کرنا انہیں ان کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا ٹھیک ہے۔" انہوں نے رسان سے سمجھایا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن نو بجے سے کچھ منٹ پہلے ہی مزمل اپنے ساتھ وجدان اور مصطفیٰ عظیم کو لیے ڈاکٹر رحمت کے کلینک پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر رحمت نے کل رات ہی کہہ دیا تھا کہ آج وہ وجدان کے ساتھ سٹنگ رکھیں گے۔

وہ لوگ روم میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر رحمت ان کے استقبال کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھ گئے یہ گرمجوشی غالباً ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ ان تینوں کو کرسیاں پیش کرکے وہ خود بھی جا کر اپنی چیئر پر بیٹھ گئے۔

"ہاں تو بتائیے کیا لیں گے چائے یا ٹھنڈا۔" مصطفیٰ عظیم کو لگا وہ کلینک نہیں آئے بلکہ کسی عزیز سے ملنے اس کے گھر چلے آئے ہیں ان کی بے تکلفی پر عجیب سا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے جلدی سے کہا۔

"اس کیا ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب۔" مگر انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں سر ہلا کر اپنے آپ سے بولے۔

"چائے ہی منگوا لیتا ہوں۔" اور انٹر کام اٹھا کر چائے لانے کو کہا۔ جب چائے آگئی تو انہوں نے ایک اور عجیب حرکت کی انہوں نے چائے لانے والے لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے بنانے لگے۔

"کتنی چینی لیتے ہیں مصطفیٰ صاحب۔" وہ چہرے پر عجیب سے تاثرات کے ساتھ بولے۔

"ڈیڑھ چمچ۔" پھر انہوں نے مزمل سے بھی یہی سوال کیا۔ مصطفیٰ عظیم کے برعکس اس کے چہرے پر اچنبھے کا کوئی تاثر نہیں تھا اسے معلوم تھا ڈاکٹر رحمت اپنے مریضوں سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔

"دو چمچ۔" اس نے کہا ڈاکٹر رحمت نے چینی ملا کر ان کے کپ ان کے سامنے رکھے پھر تیسرے کپ میں چائے ڈال کر شوگر پاٹ ہاتھ میں لیا اور وجدان سے پوچھا۔

"کتنے چمچ۔" پھر فوراً ہی بولے۔

"لیکن میں تم سے کیوں پوچھ رہا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہے تم چینی والی چائے پیتے ہو۔ تین چمچے کافی ہوں گے۔" ان کی خود کلامی سن کر بے ساختہ وجدان کی زبان سے نکلا۔

"میں چائے بنا شکر کے پیتا ہوں۔" ڈاکٹر رحمت نے ہاتھ میں پکڑا چینی کا چمچہ شوگر پاٹ میں الٹ کر وجدان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بغیر چینی کے چائے کا کپ اسے پکڑا دیا۔

مصطفیٰ عظیم کو اچانک ہی ان کے اب تک کے رویے کی وجہ سمجھ آگئی وجدان کی یہ عادت خود انہیں بھول چکی تھی بلکہ شاید کسی کو بھی اس کی یہ عادت یاد نہیں رہی تھی کیونکہ جب سے وہ واپس آیا تھا اسے چینی ملی چائے ہی مل رہی تھی اور وجدان بھی آرام سے پی لیتا ورنہ وہ پہلے وہ چینی والی چائے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا ڈاکٹر رحمت کو یقیناً یہ بات آفاق نے بتائی ہوگی اور اب انہوں نے غیر محسوس انداز میں وجدان کو اس کی ایک بھولی ہوئی عادت یاد کرا دی تھی۔ مصطفیٰ عظیم اچانک ان سے بہت متاثر نظر آنے لگے تھے انہوں نے مزمل کو دیکھا جو ان کے تاثرات کی تبدیلی کو محسوس کرکے مسکرا رہا تھا۔ پھر جتنی دیر میں چائے پی گئی انہوں نے وجدان سے کوئی بات نہیں کی چائے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر رحمت اس کے دائیں بائیں بیٹھے اس کے والد اور بھائی سے بولے۔

"آپ دونوں کے ساتھ کافی باتیں کرلیں اب میرا جی چاہ رہا ہے کہ وجدان سے بھی کچھ گپ شپ ہو جائے۔ مزمل والد صاحب کو لاؤنج میں لے جاؤ۔" اور مزمل فوراً اٹھ کر مصطفیٰ عظیم کی طرف آگیا۔

"چلیں ابو باہر چل کر بیٹھتے۔" پھر انہیں ساتھ لیے کمرے سے باہر آگیا۔

"وجدان ٹھیک تو ہو جائے گا مزمل۔" وہ آس بھرے لہجے میں بولے۔

"ان شاء اللہ آپ اچھی امید رکھیں۔ اللہ سب

بہتر کرے گا مجھ ڈاکٹر صاحب ابھی تو وجدان کو بے سٹل اٹینشن دے رہے ہیں مجھے پورا یقین ہے کہ وجدان ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھیں اور بالکل پریشان نہ ہوں۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے مزمل نے انہیں اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھالیا۔

ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر رحمت وجدان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ہاں تو برخوردار اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ جیسے کہ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے کون سا موسم اچھا لگتا ہے یا اسپورٹس کے بارے میں ہی کوئی بات کرلو۔ آفاق نے مجھے بتایا تھا تم کالج میں فٹ بال ٹیم کے کپتان تھے تمہارا فیورٹ فٹ بال پلیئر کون ہے؟" وہ سوال پہ سوال کیے جا رہے تھے اور انہیں بھی جواب لینے کے لیے رکے نہیں۔ چوکور پیپر ویٹ کو ہاتھ میں لے کر گھماتے وجدان کو دیکھتے ہوئے انہیں جواب ملنے کی امید بھی نہیں تھی حالانکہ وہ اس وقت سوچ میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی الجھن بتا رہی تھی کہ وہ اپنی سوچ کو مرتکز نہیں کر پا رہا۔ ڈاکٹر رحمت نے چپ ہو کر اسے دیکھا پھر بولے۔

"بلیو کلر تمہارا فیورٹ ہے۔" وجدان نے ان کی طرف دیکھا تو وہ اپنے اندازے کی وضاحت میں بولے۔

"دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ٹیبل پر وائٹ اور براؤن کلر کے پیپر ویٹ بھی رکھے ہیں مگر تم اپنے سامنے رکھے ان پیپر ویٹس کو چھوڑ کر دور رکھے بلیو پیپر ویٹ کو اٹھا کر اس سے کھیل رہے ہو۔"

"یہ پیپر ویٹ بلیک کلر کا ہے۔" وجدان نے پیپر ویٹ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ارے ہاں یہ تو بلیک ہی ہے۔" وہ یوں چونک کر بولے جیسے پہلے کبھی اس کے کلر پر دھیان نہ دیا ہو۔ وجدان کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ اس نے پیپر ویٹ نیچے رکھا اور دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کرسی پر پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر رحمت پھر سے شروع ہوئے۔

"اچھا تمہاری ہابی کیا ہے۔ بک ریڈنگ۔" انہوں نے ٹیبل کی طرف دیکھتے وجدان کو دیکھ کر قیاس کیا پھر خود ہی کہنے لگے۔

"آف کورس بک ریڈنگ ہی ہوگی تمہاری عمر تک پہنچتے پہنچتے عام طور پر لوگ اتنے مصروف ہو چکے ہوتے ہیں کہ فارغ وقت کو بھی گنوانا پسند نہیں کرتے اور ایسی ہی کوئی ہیلدی ایکٹیویٹی ڈھونڈ لیتے ہیں ویسے مجھے بھی بک ریڈنگ کا شوق ہے۔ کبھی کبھار کچھ وقت نکال کر لائبریری بھی چلا جاتا ہوں اس معاملے میں میری عادت بالکل ملیحہ جیسی ہے۔" انہوں نے اتنے اچانک ملیحہ کا نام لیا تھا کہ وجدان نے کرنٹ کھا کر انہیں دیکھا وہ اس کی کیفیت کو نوٹ کرنے کے باوجود بولتے رہے۔

"مشتاق یوسفی میرے فیورٹ رائٹر ہیں اور ان کی یہ کتاب تو مجھے خاص طور پر پسند ہے۔ چلو میں تمہیں ان کی کچھ لائنز سناتا ہوں۔" بولتے بولتے وہ اٹھے اور وجدان کے سامنے رکھی کتاب اٹھالی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت اتنی نمایاں رکھی کہ وجدان ضرور متوجہ ہوتا پھر جیسے ہی وہ کتاب اٹھاتے اس کی نظر کتاب کے نیچے رکھی ملیحہ کی تصویر پر بھی پڑتی جو انہوں نے مزمل سے خاص طور پر منگوائی تھی اور ہدایت کی تھی کہ تصویر ایسی ہو جس میں ملیحہ کا چہرہ واضح نظر آرہا ہو۔ ان کے ہاتھ کی حرکت پر وجدان ان کے سامنے متوجہ ہوا تھا اور پھر اس کی نظر [illegible]۔ ڈاکٹر رحمت سرسری سی نظر اس پر ڈال کر کتاب کھولتے ہوئے اس میں سے کچھ لائنیں پڑھ کر سنانے لگے۔ گاہے بگاہے وہ اسے بھی دیکھ لیتے جس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت نظر آرہی تھی اور ذرا سی دیر میں ہی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں جب انہیں یقین ہو گیا کہ وجدان ان کی آواز نہیں سن رہا تو کتاب بند کر کے ٹیبل پر رکھتے اس کے ساتھ والی چیئر پر آبیٹھے اس کے بعد انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ملیحہ کی تصویر اس کے سامنے سے اٹھالی۔ وجدان ہڑبڑا کر چونکا پھر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ ڈاکٹر رحمت نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تصویر اس کے سامنے لہرائی۔



"دل چاہ رہا ہے تو کچھ دیر اور دیکھ لو۔" وجدان نے گردن موڑے بغیر ہی انکار میں سر ہلا دیا تو وہ قصداً مسکراتے ہوئے بولے۔

"ہاں بھئی تمہیں تصویر کی کیا ضرورت جب بالمشافہ ملاقات ہو جاتی ہے ویسے باتیں تو خوب ہوتی ہوں گی۔ کیا باتیں ہوتی ہیں۔" ان کے پوچھنے کے انداز میں اتنی شوخی تھی جیسے کالج بوائے اپنے دوست سے "ڈیٹ" کا احوال معلوم کر رہا ہو۔ وجدان نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میں ان کی آواز سننے کو ترس گیا ہوں۔" اب وہ ایک دم سے سنجیدہ نظر آنے لگے۔

"تم اس سے کیا سننا چاہتے ہو۔" وجدان نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں بس اتنا چاہتا تھا کہ ایک دن وہ خود میرے پاس چلی آئیں اور کہیں کہ میں تمہاری ہوئی۔" اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ایک بار انہوں نے بھی چاہا تھا کہ میں ان کے پاس آجاؤں اور وہ مجھ سے وہ سب کہہ دیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہا۔۔۔ پھر میں ان کے پاس گیا بھی مگر انہوں نے منہ پھیر لیا۔۔۔ خود بلا کر منہ پھیر لیا۔" وجدان ہونٹ کاٹنے لگا۔

"بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اب بھی ہوتی ہے لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ جس سے محبت کی اسے رحم کی عادت نہیں۔ جیتے جی بھی سراب دکھائے اور مر کر بھی سراب دکھاتی ہیں۔" اب ڈاکٹر رحمت کو کچھ پوچھنے یا کہنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بنا رکے بولتا ہی چلا گیا۔

دو گھنٹے بعد جب وہ ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ جذباتی معرکوں سے گزر کر آرہا ہے۔ مصطفیٰ عظیم اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے پھر تیزی سے اس کے پاس چلے آئے۔

"تم ٹھیک ہو بیٹا۔"

"جی ابو۔" اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا۔"

"آپ دونوں کو اندر بلایا ہے۔" اس نے مزمل کی بات کا جواب دیے بغیر کہا تو مزمل بولا۔

"ٹھیک ہے تم بیٹھو ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔" پھر وجدان کو چھوڑ کر وہ دونوں ڈاکٹر کے کمرے میں چلے گئے۔

"مجھے ان کی بیماری کا پتا چل گیا ہے۔ یہ شیزوفرینیا میں مبتلا ہیں۔" وہ دونوں بیٹھ چکے تو ڈاکٹر رحمت نے کسی سوال سے پہلے ہی کہہ دیا۔ اپنے پچھلے رویے کے برخلاف وہ اس وقت پروفیشنل انداز میں بات کر رہے تھے۔ مصطفیٰ عظیم نے ان کی بات سنی پھر قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ کیا ہوتا ہے۔" وہ سمجھانے لگے۔

"شیزوفرینیا ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں مریض اپنی سوچوں اور خواہشات کی الجھی دنیا میں بھٹکتا ہے اور حقیقی دنیا اور اس کے لوگ یہاں تک کہ مریض کی اپنی شخصیت تک پس منظر میں چلی جاتی ہے اگر آپ کسی ایسے مریض سے بات کریں گے کہ اس کے جواب آپ کے سوالوں سے میل نہیں کھاتے، اس کی حرکات و سکنات بھی عجیب ہیں ساتھ ہی اس میں جذباتی بے حسی بھی محسوس ہوتی ہے یعنی وہ چیزیں جن پر دوسرے لوگ خوش یا اداس ہوتے ہیں یہ اس پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کرتا۔ آپ کی رائے میں یقیناً وہ شخص پاگل ہو گیا لیکن ٹیکنیکلی شیزوفرینیا کے مریض پاگل نہیں ہوتے کیونکہ پاگل اسے کہا جاتا ہے جو سوجھ بوجھ نہ رکھتا ہو لیکن شیزوفرینیا کے مریض سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ باتوں کو سنتے بھی ہیں اور ٹھیک سے سمجھتے بھی ہیں بس اس پر رد عمل کا اظہار نہیں کرتے۔

دراصل وہ بیرونی دنیا کے مقابلے میں اپنے اندر کی دنیا کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور اگر آپ ان کی اس پرائیویٹ ورلڈ تک رسائی پا سکیں تو پتا چلے گا کہ ان کی باتیں اور حرکات سو فیصد معنوی ہیں۔ اس حالت کو عام الفاظ میں Self absorpution کہہ سکتے ہیں ——— اس حد تک بڑھ سکتی

ہے کہ مریض کے لیے وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کس جگہ موجود ہے اور بعض اوقات تو مریضوں کی بھوک پیاس تک ختم ہو جاتی ہے وہ لگاتار کئی دنوں تک بنا کھائے پیے زندہ رہ سکتے ہیں بلکہ اگر آپ کھلانا بھی چاہیں تو وہ نہیں کھائیں گے بعض ـــــ Acute cases میں تو مریض پرسنل ہائی جین اور حاجت تک سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اکثر ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جو گرد آلود چہروں اور خستہ لباس میں سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں کبھی یوں ہی خلا میں گھورنے لگتے ہیں کبھی سر جھکا کر کچھ بڑبڑانے لگتے ہیں اور کبھی اچانک ہی ان پر جنون طاری ہو جاتا ہے تو وہ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ان میں اکثر لوگوں کو شیزوفینیا کا مرض لاحق ہوتا ہے۔

ہم میں سے زیادہ تر انہیں پاگل سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بعض تو پتھر پھینکنے سے بھی نہیں چوکتے۔ شیزوفینیا کی ابتدائی اسٹیج سے گزرتے ہوئے وجدان کو بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا جب لوگوں نے اس پر آوازیں کسیں اور اس پر پتھر پھینکے۔" اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے ان الفاظ پر مصطفیٰ عظیم کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ مزمل نے فوراً ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے انہیں ریلیکس کرنا چاہا مگر اپنے بیٹے کے اس گزرے ہوئے دور کو بھی برداشت کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ ڈاکٹر رحمت اسی سنجیدگی سے کہتے رہے۔

"ویسے آپ کے بیٹے کی پرسنل ٹریجڈی سے ہٹ کر بھی یہ کیس بہت انوکھا ہے۔ عام طور پر شیزوفینیا کا کسی جذباتی صدمے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر وجدان کے مرض کا براہ راست تعلق ملیحہ کی موت سے ہے۔ ملیحہ کی اچانک موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا وہ آج تک اس صدمے سے ابھر نہیں سکا۔ بہر حال میرے تجربے کے مطابق تو وجدان میں شیزوفینیا کی تمام علامات پائی جاتی ہیں۔ اس کی کیس ہسٹری بتاتی ہے کہ ملیحہ کی موت کے فوراً بعد وجدان Self absorpution کے فیز سے گزر رہا تھا لاانکہ وہ جلد ہی کسی بہتر علاج کے بغیر اس فیز سے باہر بھی آ گیا تھا جس کے لیے آپ کو شایان کا شکر گزار ہونا چاہیے اس بچے کے ساتھ جذباتی وابستگی نے ہی اسے حقیقی دنیا کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا ورنہ شیزوفینیا کے مریضوں میں ول پاور کے استعمال کی مثالیں بہت کم ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے اس میں کسی دوسرے مریض کی طرح ہی ذہنی انتشار اور ارتکاز کی کمی پائی جاتی ہے گو کہ یہ علامات شدید نہیں اور وہ کئی سالوں سے ان علامات کے ساتھ بڑی حد تک نارمل لائف گزار رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں خیالات کی رو ہر وقت بہتی رہتی ہے اور Affect Flat کی علامت تو آپ نے بھی نوٹ کی ہو گی دس سال بعد لوٹنے پر بھی اس کے انداز میں نہ تو گرمجوشی ہے اور نہ وہ کسی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔"

"لیکن وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ اسے ملیحہ نظر آتی ہے۔" وہ چپ ہوئے تو مزمل جلدی سے بولا۔

"That's hallucination" اور یہ شیزوفینیا میں بہت کامن ہے حالانکہ زیادہ تر تو experience کی رپورٹ کرتے ہیں لیکن بہت سے Auditory مریض ایسی چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ وجدان کو ملیحہ نظر آتی ہے جسے وہ دیکھنا چاہتا ہے اور اسی شدید خواہش نے ہی شاید اس کے ذہن نے ملیحہ کی شبیہہ تراش لی ہے۔"

"اور اس کی یادداشت ـــــ کیا وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔" ایک اور سوال ہوا ڈاکٹر رحمت نے ترحم آمیز نظروں سے مصطفیٰ عظیم کو دیکھا۔

"شیزوفینیا کے اکثر مریضوں کو یادداشت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ کبھی جزوی اور کبھی مکمل اور اصل ان مریضوں کے دماغ میں کسی شعوری کوشش کے بغیر خیالات کا ریلا بہتا چلا جاتا ہے یہ کسی مچھلی بازار کی طرح ہی ہے جہاں ہر آواز آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے نتیجتاً آپ کسی کو بھی توجہ نہیں دے پاتے اس کو ذہنی ارتکاز کی کمی کہتے ہیں یہ کمی صرف سوچوں پر ارتکاز کی نہیں ہوتی بلکہ یادوں پر بھی ارتکاز نہیں کر پاتے اور اکثر بھی جاتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کو یاد نہیں رکھ پاتے تو اسے بھول جاتے ہیں۔" وہ پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"لیکن ہماری یادداشت اور ہمارے جذبات کے بیچ گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے وجدان کی یادداشت شیزوفینیا سے نہیں بلکہ جذباتی صدمے سے متاثر ہوئی ہو اس سچویشن کو fugue state کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے amnesia کی اس قسم میں خاص طور پر جذباتی دھچکا یادداشت کھونے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی پھر یادیں لوٹ آتی رہ جاتی ہیں حالانکہ ضروری نہیں کہ ان یادوں میں کوئی ربط ہو لیکن وجدان کے ذہن میں جو یادیں تازہ رہیں جو ملیحہ سے متعلق تھیں اور fugue state میں کبھی کبھار مریض اپنی اصلی شخصیت کو کھو کر نئی شخصیت بنا لیتے ہیں جیسے وجدان نے خود کو عبداللہ کی شخصیت میں ڈھال لیا تھا۔"

"وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔" مصطفیٰ عظیم کی آواز میں اب ساتھ ساتھ اندیشے بھی بول رہے تھے۔ ڈاکٹر رحمت سنجیدگی کو ترک کر کے مسکرائے۔

"کیوں نہیں میں نے آپ کو بتایا نا کہ ـــــ ایسے مریضوں کا علاج مشکل نہیں ہوتا اصل مسئلہ ان کا اعتماد حاصل کرنا ہے کیونکہ اکثر مریض کبھی نہیں مانتے کہ جو وہ دیکھ رہے ہیں وہ موجود ہی نہیں لیکن وجدان کے ساتھ ایسی کوئی دقت نہیں وہ قبول کرتا ہے کہ ملیحہ کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور وہ ان hallucinations کو بھی سراب کہتا ہے اس صورت میں علاج کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔"

"اور اس کی یادداشت ـــــ" ان کے تسلی دینے پر مزمل کی فکر مندی کم تو ہوئی تھی ختم نہیں ہوئی۔ ان کی فکر اب اور بھی گہری ہو گئی۔

"وہ تو ری اسٹور ہونا شروع بھی ہو چکی بلکہ حقیقتاً تو وجدان کی یادداشت گئی ہی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ دس سال تک وہ ہر پل ملیحہ کو سوچتا رہا ہے کسی دوسری یاد کو اس کے ذہن میں جگہ نہیں ملی تو وہ فرنٹ سے ہٹ گئیں ایک سائیڈ پر چلی گئی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ہم کسی چیز کو کہیں رکھ کر بھول جائیں مگر یاد کرنے پر یاد آ جاتا ہے کہ فلاں چیز کہاں رکھی تھی وجدان کچھ بھی بھولا نہیں ہے بس اسے یاد نہیں رہا جبکہ یادداشت کا کھو جانا تو اسے کہتے ہیں جب کوشش کے باوجود کسی کو کچھ یاد نہ آئے لیکن وجدان جیسے جیسے اپنی پچھلی زندگی کی طرف لوٹے گا اسے دھیرے دھیرے سب یاد آ جائے گا۔ لیکن اس دوران آپ لوگوں کو وجدان کا بہت خیال رکھنا ہے کیونکہ یادداشت کی بحالی کے عمل کے دوران اکثر لوگ ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔" کچھ دیر تک وہ انہیں وجدان کے متعلق ہدایات دیتے رہے پھر مزمل ان سے دواؤں کا پرچہ لے کر اگلی میٹنگ کی اپائنٹمنٹ سیٹ کرتے ہوئے ابو کے ساتھ جانے کے لیے کھڑا ہوا اور ان سے ہاتھ ملا کر دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

"ایک اور بے خواب رات۔" بیڈ پر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹے وجدان نے سوچا۔ وہ بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا ذہن یادوں کی آماجگاہ بنا تھا اس کے ذہن کی سطح پر تیرتی بھولی بسری یادوں کا کوئی نقش اچانک ہی واضح ہو جاتا پھر لمحے ہی لمحے یادوں کے نقوش دھندلانے جاتے اور اس کا ذہن انہیں کریدنے لگتا۔ کبھی یہ جدوجہد لا حاصل جاتی اور کبھی کوئی سرا اس کے ہاتھ لگ جاتا تو کئی منظر ایک ساتھ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتے اس کے بعد پھر یادوں کی اسکرین سیاہ ہو جاتی اور اس کا ذہن پھر سے کسی گوہر نایاب کی تلاش میں یادوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگتا۔ اس مشقت نے اسے تھکا دیا تھا سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں جلنے لگیں ـــــ پھر بھی پلکیں جھپکنے کو تیار نہیں تھیں اس نے ایک نظر ساتھ سوئے بیٹے پر ڈالی پھر اٹھ بیٹھا اپنے کمرے سے نکل کر چلتا ہوا وہ کوریڈور کے اینڈ والے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کمرے کے مکین بھی رت جگا منا رہے

تجھے بھی ہلکی دستک پر دروازہ کھل گیا۔

"ہم سوئے نہیں ابھی۔" عائشہ اسے دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں پھر اسے چپ دیکھ کر اندر آنے کے لیے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"اندر آجاؤ۔" وہ اندر آیا تو کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور مصطفیٰ عظیم سر تک چادر اوڑھے کمرے کے پیچھے تکیہ لگائے بیڈ پر بیٹھے تھے وجدان کو کمرے میں آتا دیکھ کر انہوں نے فوراً" سنبھل کر سائیڈ ٹیبل پر سے عینک اٹھائی اور اسے لگا کر وجدان کو دیکھنے لگے جو کمرے کے وسط میں کھڑا چپ چاپ انہیں دیکھ رہا تھا۔ عائشہ دروازہ بند کرتی خود بھی بیڈ کے کونے پر جا ٹکیں۔ مصطفیٰ عظیم کو اس کی خاموشی سے بے چینی ہونے لگی تھی نہ جانے کیا خوف تھا جو انہیں ہر وقت وجدان کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا چادر ہٹا کر دونوں پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہوئے تو وہ خود کو سنبھال کر بولے۔

"کیا بات ہے بیٹا۔"

"میں آپ سے اور امی سے معافی مانگنے آیا ہوں ابو۔" وہ دھیمے لہجے میں نظر جھکا کر بولا۔

"کیسی معافی۔" وجدان نے ان کی طرف دیکھا پھر ندامت سے بولا۔

"آپ مجھے معاف کردیں کہ میں آپ سے اجازت لیے بغیر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ آپ کو بتایا تک نہیں ایک بار آپ لوگوں کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی..... آپ مجھے معاف کردیں کہ میں نے ایک طویل عرصے تک آپ کو اذیت میں رکھا۔ آپ مجھے اس کے لیے بھی معاف کردیں کہ میں نے دس سال میں ایک بار بھی آپ دونوں کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی..... کبھی لوٹ آنے کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا۔" عائشہ مصطفیٰ کے لیے اپنے بیٹے کا ٹوٹا بکھرا لہجہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا وہ تڑپ کر اٹھیں اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگیں۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے بھول جاؤ۔ ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں اور کریں بھی کیسے تمہاری دی ہوئی چوٹ گہری ہی سہی پھر اس زخم کے ساتھ ہم یہاں عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے کبھی دل میں خیال تک نہ گزرا کہ میرے جگر کا ٹکڑا لوگوں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔" وہ رونے لگیں..... وجدان ان کے آنسو پونچھنے لگا۔

"آپ روتی کیوں ہیں امی دیکھیں تو آپ کو سراب کی خواہش میں دکھ دینے والا سراب کے پیچھے بھاگتے اپنی روح تک زخمی کرچکا ہے۔"

"ایسی بات مت کرو وجدان۔" وہ دہل گئیں پھر پلٹ کر شوہر سے بولیں۔

"سن رہے ہیں آپ کا بیٹا کیا کہہ رہا ہے..... اسے ٹوکتے کیوں نہیں۔" وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیے بیٹھے تھے آہستگی سے اٹھ کر اس کے پاس آگئے۔

"خود کو سنبھالو وجدان جوان اولاد کی شکستگی بوڑھے ماں باپ کو اور بھی بوڑھا کردیتی ہے اور اب ہمارے گھاؤ کا ذکر نہ کرو ہمارا بیٹا لوٹ آیا تو ہمارے زخم بھی بھر گئے۔"

"لوٹ آیا ہے تو اسے میرا کیوں نہیں دیتے وہ دیکھے مدت بیت گئی اب تو یاد کرنے پر بھی اپنے چہرے کے نقش ٹھیک سے یاد نہیں آتے۔" وجدان رو کے بولا۔ وہ اس کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولے۔

"تم اپنے باپ کے چہرے کو تو پہچانتے ہو نا۔" وہ بولا۔

"آپ کو دیکھتے ہی آپ کو پہچان گیا تھا۔"

"مجھے تو بس اتنا ہی کافی ہے۔" وہ مضبوط آواز میں بولے۔

"تمہارے دکھ درد سمیٹنے کے لیے ماں باپ ہیں تمہارا بڑا بھائی ہے جو ہر مقام پر تمہارا ساتھ دے گا پھر بھلا تمہیں پریشان ہونے یا الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض چیزیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سدھرتی جاتی ہیں اور بیٹے اب تم بلیجہ پر بھی صبر کرلو..... جس خوشی کی عمر تھوڑی ہو اس پہ بڑا دکھ نہیں کرتے۔"

"صبر آچکا ہے ابو..... چین نہیں آتا۔" اس نے ہلکے سے کہا پھر امی سے بولا۔

"میں مدت سے سو نہیں پایا امی آج سونے کو دل کر رہا ہے۔ آپ کے پاس سو جاؤں۔" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے فرمائش کی تو عائشہ کی آنکھوں سے مسکراتے آنسو بھر آئیں وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وجدان بھی چپل اتار کر آرام سے بیڈ پر لیٹ گیا اور ان کی گود میں سر رکھے اس نے آنکھیں بند کرلیں..... عائشہ مصطفیٰ بھی اس کے بالوں میں انگلیاں سہلاتیں کبھی جھک کر اس کے چہرے پر پیار کرنے لگتیں کچھ ہی دیر بعد وہ سب کچھ بھول کر ماں کی آغوش میں گہری نیند سو گیا تھا۔ ایک مدت کے بعد وجدان کو اتنے سکون کی نیند آئی تھی پھر تہجد کے وقت اپنے آپ اس کی آنکھ کھل گئی۔

عائشہ ابھی تک اس کا سر گود میں لیے جاگ رہی تھیں سامنے صوفے پر بیٹھے مصطفیٰ عظیم بھی رات بھر نہ سوئے تھے۔ وجدان بالوں میں ہاتھ پھیرتا اٹھ بیٹھا تو وہ بولیں۔

"کہاں جارہے ہو۔"

"تہجد کی نماز کا وقت ہوگیا ہے۔" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھ کر خمار آلود آواز میں کہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا کمرے کے ہی اٹیچڈ باتھ روم میں وضو کر کے اس نے قبلہ رو جائے نماز بچھائی اور اس پر کھڑے ہو کر نیت باندھتے ہوئے تکبیر کے لیے ہاتھ کانوں تک اٹھائے۔

فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں جب مصطفیٰ عظیم [illegible] ہاتھ میں پکڑے اس کے کمرے میں آئے۔ وہ جائے نماز پر بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ مصطفیٰ عظیم مبہوت ہو گئے ان کا دل چاہا کہ وہ وجدان کو تلاوت کرتا ہوا سنتے رہیں لیکن اذان کی آواز پر وجدان نے قرآن پاک بند کیا اور جزدان میں لپیٹ کر الماری کے اوپر رکھ کر پلٹتے ہوئے ان سے بولا۔

"خیریت۔"

"ہاں بھئی خیریت ہی ہے بس آج دل چاہ رہا ہے فجر کی جماعت میں شامل ہوں کافی عرصے سے فجر اور عشاء کی باجماعت نماز چھوڑ رکھی ہے اس عمر میں نظر اس قابل نہیں رہی کہ اندھیرے میں مسجد تک جا سکوں اب تو تم آگئے ہو ہاتھ پکڑ کر لے جایا کرو گے۔ مزمل تو فجر نماز کے لیے اٹھتا ہی نہیں نالائق۔"

وجدان نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں چلتے ہیں۔" اور شایان کو جگانے لگا وہ نیند میں تھا لیکن زبردستی اٹھائے جانے پر اس نے منہ بسورا اور بند آنکھوں کے ساتھ ہی وضو کرنے باتھ روم میں گھس گیا۔ نماز کے بعد تینوں قریبی پارک میں چہل قدمی کے بعد لوٹے تو زوار اور منال اسکول یونیفارم پہنے ناشتا کر رہے تھے پاس ہی مزمل ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے انہیں اسکول چھوڑنے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وجدان کو ایک خیال آیا تو اس سے کہنے لگا۔

"مزمل بھائی شایان کی پڑھائی کا کافی حرج ہو رہا ہے اسے اسکول میں داخل کروا دینا چاہیے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے اسے یہاں آئے کافی دن ہو گئے اب تک تو اس کا ایڈمیشن ہو جانا چاہیے تھا۔ تم ایسا کرو میں بچوں کو چھوڑ کر آتا ہوں تب تک تم دونوں تیار ہو جاؤ پھر زوار کے اسکول چلیں گے اور اس کی پرنسپل سے شایان کے ایڈمیشن کی بات کریں گے۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر ناشتے کے لیے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ لو تمہاری بنا شکر کی چائے۔" انیقہ بچوں کو چھوڑ کر واپس آئی تو چائے کا کپ وجدان کے سامنے رکھتے ہوئے بولی وجدان نے مسکرا کر کہا۔

"میں ڈال کر دیں گی تو بھی پی لوں گا۔" وہ ہنس پڑی۔

"ہاں ہاں پتا ہے سدھر گئے ہو ورنہ یاد ہے امی غلطی سے بھی اگر چائے میں چینی ڈل جاتی تو یہ کتنا ہنگامہ کرتا تھا۔" اس نے اپنی ساس سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

"یاد ہے۔ لیکن دیکھو ذرا بڑا ہو کر بھی مجھے اس کی عادت بھول گئی مجھے بھی ڈاکٹر رحمت سے علاج کرا لینا چاہیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں امی آپ کے بیٹے کی عادت ہی اتنی عجیب ہے کہ کسی کے بھی ذہن سے محو ہو سکتی ہے اب دیکھیں تو ویسے یہ میٹھے کا شوقین ہے بس چائے میٹھی نہیں ہونی چاہیے۔" سر جھٹک کر وہ شایان کی طرف مڑی۔

"تم ناشتے میں کیا لو گے۔"

"آلو کا پراٹھا۔" اس نے زور و شور کے ساتھ جواب دیا۔ انفعاس کے لیے آلو کا پراٹھا بنانے لگی۔

ناشتا ختم کر کے دونوں مزمل کے ساتھ زوار کے اسکول پہنچے۔

"آپ کا بچہ بہت ذہین ہے۔" دبلی پتلی سی ادھیڑ عمر خاتون نے شایان سے سوال جواب پوچھنے کے بعد مسکراتے ہوئے وجدان سے کہا تھا اس کے چہرے پر کسی باپ کی طرح ہی تفاخر کی چمک آئی تھی لیکن پھر پرنسپل صاحبہ معذرت کرتے لہجے میں بولیں۔

"لیکن ہم اسے ایڈمیشن نہیں دے سکتے۔"

"کیوں؟" مزمل نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیونکہ چند مہینوں میں اینول ایگزام شروع ہو جائیں گے اور ایگزامز کے اتنے نزدیک ہم ایڈمیشن نہیں لیتے یہ ہمارا رول ہے۔" مزمل بولا۔

"آپ خود دیکھ چکی ہیں کہ شایان کتنا ذہین بچہ ہے دو تین مہینے میں تو وہ بہت آرام سے کورس کور کر لے گا۔"

"مجھے اس پر کوئی شک نہیں۔" انہوں نے مزمل کی طرف دیکھا اور کہا۔

"لیکن اس کے باوجود میں مجبور ہوں۔" وجدان پریشانی سے گویا ہوا۔

"اس طرح تو اس کا سال ضائع ہو جائے گا اور اگلے سال بھی اسے فورتھ کلاس دوبارہ ریپیٹ کرنی پڑے گی آپ کو نہیں لگتا یہ ایک ذہین بچے کے ساتھ زیادتی ہے۔"

"سوری وجدان صاحب لیکن اصول تو اصول ہوتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ شایان ہمارا اسٹوڈنٹ بنے اور آپ اپنے بیٹے کو ایڈمیشن اوپن ہونے کے بعد دوبارہ ہمارے پاس لے کر آئیں اس کے لیے میں آپ کو ایک گولڈن آفر دینا چاہتی ہوں۔"

وہ دونوں ہمہ تن گوش ہوئے۔

"آپ شایان کو فورتھ کلاس کے لیے نہیں بلکہ ففتھ اسٹینڈرڈ کے کورس کے لیے تیار کریں پھر میں اسی کورس میں سے اس کا ٹیسٹ لوں گی اور اگر یہ کلیئر ہو گیا تو ہم اسے سکس اسٹینڈرڈ میں ایڈمیشن دیں گے اس طرح شایان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی بلکہ اسے ایک سال کا بونس ملے گا جو کہ وہ اپنی ذہانت کے مطابق Desirve کرتا ہے۔ کیسے آپ کو یہ آفر قبول ہے۔" وہ دونوں سوچنے لگے پھر مزمل نے شایان کی طرف دیکھا جو ان دونوں کے درمیان صوفے پر دبکا بیٹھا تھا اور سر اٹھا کر کبھی ایک تو کبھی دوسرے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"کیا کہتے ہو بھتیجے ففتھ اسٹینڈرڈ کا ٹیسٹ پاس کر لو گے۔"

"ہنڈرڈ آؤٹ آف ہنڈرڈ مارکس لوں گا تایا ابو۔" وہ جوش سے بولا تو مزمل مسکرا کر اس کے بال سہلاتے ہوئے وجدان کو دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمارے بیٹے کو آپ کی آفر پسند ہے اس لیے انکار نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر آپ آج سے اسے ففتھ کلاس کے کورس کی تیاری شروع کروائیں اور ایگزامز ختم ہونے کے بعد اسے لے آیئے گا۔"

"شکریہ۔" وجدان اور مزمل شایان کو ساتھ لے

کمرشٹ ہوسکتے ہیں۔ قسیل ہیکے موسم سے نکل کر وہ لوگ اسکول کی بک شاپ میں آگئے شایان اپنے لیے اتنی ڈھیر ساری نئی رنگ برنگی کتابیں کاپیاں دیکھ کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ واپسی میں وہ پچھلی سیٹ پر سارا وقت اپنے اسکول بیگ کو بازوؤں میں دبوچے بیٹھا رہا۔ جیسے ہی وہ لوگ گھر پہنچے شایان فوراً" گاڑی کا دروازہ کھول کر اترا ساتھ ہی اپنا بیگ بھی گھسیٹ کر نکال لیا اور اسے لیے اندر بھاگ گیا۔

مصطفیٰ عظیم لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے وہ سیدھا ان کے پاس آیا اور بیگ ان کے گھٹنوں پر رکھ کر ساتھ ہی صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

"دیکھیں دادا ابو میری نئی کتابیں کتنی اچھی ہیں اور بابو میرے لیے کلر پنسل بھی لے کر آئے ہیں۔" وہ بیگ کھول کر انہیں اپنی کتابیں اور کلر پنسل دکھانے لگا وجدان اور مزمل ساتھ ساتھ چلتے اندر آئے تھے۔

"پاپا کیا شایان میرے ساتھ اسکول جائے گا۔"

"ہاں۔" مزمل کی بات پر وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔

"کتنا مزا آئے گا شایان ہم دونوں ساتھ اسکول جائیں لوو اسکول میں کرکٹ بھی کھیلیں گے پتا ہے وہاں سب بڑے بڑے لڑکے بیٹنگ نہیں دیتے بس باؤلنگ کرواتے رہتے ہیں تم آجاؤ گے تو ہم دونوں مل کر کھیلیں گے۔"

"ٹھیک ہے پہلے تم بیٹنگ کرنا میں باؤلنگ کراؤں گا پھر تم باؤلنگ کرنا میں بیٹنگ کروں گا۔" وہاں تو بیٹنگ آرڈر تک سیٹ ہوگیا تھا۔ زوار نے منظوری دی۔

☼ ☼ ☼
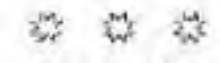
منیر حسن اپنے آفس میں بیٹھے تھے کہ ان کے آفس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کم ان کی آواز کے ساتھ ہی بلیک پینٹ کوٹ کے ساتھ وائٹ شرٹ پر بلیک ٹائی پہنے وجدان دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ منیر حسن بے اختیار اسے دیکھنے لگے اسے دیکھتے ہوئے ہر بار ان کا دل پگھلنے لگتا تھا وہ اپنے اس احساس کو کوئی نام نہ دے پاتے۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔" وہ ان کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"بیٹھو۔" انہوں نے کہا اور وہ ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرا نام وجدان مصطفیٰ ہے۔ بات بہت پرانی ہے لیکن شاید آپ کو یاد ہو کہ دس سال پہلے میں آپ کی لیگل فارم میں وکیل کی حیثیت سے جاب کرتا تھا۔ ثبوت کے طور پر یہ اپائنٹمنٹ لیٹر ہے جو آپ کے آفس کی طرف سے مجھے دیا گیا تھا۔" اس نے فائل میں سے ایک لیٹر نکال کر ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا مگر منیر حسن نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اسے دیکھتے رہے جو کہہ رہا تھا۔

"دس سال تک کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے میں آفس میں حاضری نہیں دے سکا لیکن اب میں اپنی جاب کو ری جوائن کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میں اپنی جاب پر واپس آنے کا قانوناً" حق رکھتا ہوں کیونکہ دس سال میں نہ تو میں نے جاب سے ریزائن کیا اور نہ آپ نے مجھے نوکری سے برطرف کرنے کے لیے لیٹر جاری کیا لیکن پھر بھی میں اپنی سیٹ پر واپس آنے کے لیے آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔" وہ چپ ہو کر ان کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا تو وہ بولے۔

"تمہیں اپنا تعارف دینے کی ضرورت نہیں تم جیسا لاپروا اور غیر ذمہ دار وکیل میری لیگل فارم میں اور کوئی لایانٹ نہیں پایا اور اپنی اس اکلوتی غلطی کو میں کیسے بھول سکتا ہوں تم انتہا درجے کے نون پروفیشنل ہو ایک لڑکی کی خاطر تم مہینوں آفس کو نظر انداز کرتے رہے اور پھر کوئی اطلاع دیے بغیر دس سال کی چھٹی پر چلے گئے تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس وقت تمہارے دو کیسز عدالت میں چل رہے تھے جنہیں تم بیچ میں ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے تم نے اپنے کیریئر کے ساتھ جو کیا سو کیا مگر میری اور میری فارم کی ریپوٹیشن کو جو نقصان پہنچا وہ کیا۔ لوگ کہتے تھے ہار جو جائے ایڈووکیٹ منیر حسن کے پاس کیس لے کر مت جانا اس کے وکیل تو کلائنٹ کو عدالت کے کمرے میں



چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ تم کس منہ سے اپنی جاب واپس لینے کی بات کرتے ہو جبکہ تمہاری لاپروائی اب بھی ویسی کی ویسی ہے۔ تمہیں واپس آئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے ہیں اور تم اب دری جوائننگ کی اپلیکیشن دینے آئے ہو۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جاب واپس ملنے پر تم پہلے جیسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں نہیں کرو گے۔" "وہ کسی باس کی طرح ہی ڈیل کر رہے تھے" وجدان نے آہستہ سے کہا۔

"اب آپ کو کبھی مجھ سے غیر ذمہ داری کی شکایت نہیں ہوگی سر کیونکہ اب آپ کی بھانجی بھی اور کوئی نہیں جس کے لیے میں اس حد تک چلا جاؤں۔" منیر حسن نے افسردگی سے اپنی نظر چرائی پھر درازوں میں سے ایک فائل نکال کر اس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کر کے اس کے پوائنٹس بناؤ پھر اس کے بعد اس پر بات کریں گے۔"

"اوکے سر۔" وہ فائل لے کر اٹھ گیا تو منیر حسن دھیرے سے بولے۔

"کیا ہو جاتا وجدان جو تم بتا دیتے۔" وجدان اپنا پاؤں نہیں اٹھا سکا گردن موڑ کر ان سے بولا۔

"کیا ہو جاتا جو میں بتا دیتا۔" منیر حسن بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔

"شام کو گھر آجانا افتخار بھائی تمہیں یاد کر رہے تھے اور ہاں شایان کو بھی ساتھ لے کر آنا بہت پیارا بچہ ہے۔"

"جی انکل۔" وہ کہہ کر آفس سے نکل گیا۔

شام کو وہ تغلق کے گھر پہنچا تو گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بیرونی گیٹ جو اکثر کھلا رہتا تھا اس وقت بھی کھلا تھا شایان گاڑی رکتے ہی دروازہ کھول کر اتر کر اندر بھاگ گیا تھا وجدان نے کار لاک کی اور اطلاعی گھنٹی بجاتا کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی نظر دالان میں بچھے تخت پر اٹھ گئی تھی..... ایک یاد نے چپکے سے آکر وجدان کا دامن تھام لیا۔ وجدان کو ایک شام یاد آگئی اور شام کا سحر مگر اصل سحر تو ان آنکھوں کا تھا جن پر جھکی سنہری پلکیں بے خودی میں اٹھ گئی تھیں پھر ان آنکھوں میں پہلے حیرت کا ہونا — اس پل کو یاد کرکے ہی وجدان کا دل تھم گیا تھا۔

دل میں اسی خواہش کا ورود کر آ وجدان بے اختیار اسی کے پاس چلا آیا تھا اور دالان میں بچھے تخت پر بیٹھی پلکیں اسے اپنے سامنے زمین پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھتے دیکھ کر پلکیں جھکاتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔ اسے سمٹتے دیکھ کر وجدان پر بے خودی سی طاری ہو گئی تھی اور اسی بے خودی میں اس کے لبوں نے سرگوشی کی

مجھے یقین تو نہیں ہے مگر یہی سچ ہے<br>
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتا ہوں<br>
یہی نہیں کہ تجھے جیتنے کی خواہش ہے<br>
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتا ہوں

"میں عمریں گزار آیا ہوں پلیز۔ میں خود کو ہار آیا ہوں۔" وجدان نے خالی تخت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

فوزیہ یاسمین

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی۔ جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے ——— اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

روحیل، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ ادھر اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم ولی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۳

تیرہویں قسط

نکلی تھی۔

خرم کا چہرہ بالکل ساکت تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عزم ہلکورے لے رہا تھا جسے ان دونوں نے ہی شدت سے محسوس کیا تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

جتنی دیر خرم وہاں کھڑا رہا وہ دونوں بھی ایسے ہی جمی رہیں، پھر اچانک خرم پلٹا اور ان دونوں پر نظر ڈالے بغیر اپنی گاڑی کی طرف پلٹ گیا۔

وہ بھی بالکل تحمل کے انداز میں آندھی طوفان کی طرح گاڑی نکال لے گیا۔

سنبل اور رومیلہ جیسے ایک دم ہوش میں آگئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ تحمل نے کیا کیا۔" سنبل خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"اب۔۔۔ اب کیا ہوگا خرم اس تھپڑ کا بدلہ تو ضرور لے گا ہے نا۔" سنبل رومیلہ کو خاموش دیکھ کر پریشانی سے بولی تو رومیلہ صرف ایک تفکر بھری نظر اس پر ڈال کر رہ گئی جیسے اس کی بات سے سو فیصد متفق ہو مگر سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بولے کیا۔

"چلو، ہم بھی گھر چلتے ہیں اب میں کوئی کلاس اٹینڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" سنبل نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنپٹی کو دباتے ہوئے کہا تو رومیلہ صرف سرہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

الیان جب واپس اپنے گھر آیا تو اس کا ارادہ نہیں تھا شگفتہ غفار سے اس موضوع پر بات کرنے کا آخر کو وہ حامد سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ ممی پر ظاہر نہیں کرے گا کہ حامد نے اسے سب بتادیا، مگر ممی پر نظر پڑتے ہی اس کا دل چاہا وہ ان سے پوچھے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

اس کی ماں ہوتے ہوئے انہوں نے اسے ہی حامد کے سامنے چھوٹا کر دیا۔

بے شک انہیں حامد کو اپنا داماد بنانے کا ارمان تھا۔ مگر الیان بھی کچھ غلط تو نہیں کرنے جا رہا تھا، صرف اسے دیکھنا اور پرکھنا ہی تو چاہتا تھا، اگر الیان کو وہ بریرہ کے لیے مناسب لگتا تو وہ کوئی انکار تھوڑی کرتا اور اگر وہ بریرہ کے لیے مناسب نہیں تھا تو بریرہ کو اسے سونپ دینا بریرہ کے ساتھ زیادتی تھی، وہ بھی محض اس لیے کہ شگفتہ غفار کی یہ دلی خواہش تھی۔

مگر ان سے سامنا ہونے پر الیان نے بمشکل اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا، جبکہ وہ اس پر نظر پڑتے ہی خوشی خوشی اس کے قریب آکر استفسار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اور کیسا رہا تمہارا ٹرپ حامد سے ملاقات ہوئی۔"

جب یہ معلوم ہو کہ سامنے والا آپ سے جھوٹ بول رہا ہے وہ بھی ایسا شخص جس کا رتبہ اور مرتبہ آپ کے دل میں بہت اونچا ہو تو کسی کو جیسا لگ سکتا ہے الیان کو بھی اس لمحے ویسا ہی محسوس ہوا تھا۔

وہ صرف شگفتہ غفار کو دیکھ کر رہ گیا، ایک بار پھر اس کی زبان تک آتے آتے رہ گیا۔

"آپ نے ہی تو حامد کو فون کر کے فوراً حویلی پہنچنے کا کہا تھا، پھر ملاقات کیوں نہ ہوتی۔" مگر جب وہ بولا تو الفاظ خود بخود کچھ سے کچھ ہو گئے۔

"اچھا رہا حامد سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا، تو پھر کیسا لگا حامد۔" اب کی بار ان کے چہرے پر تجسس صاف پڑھا جا سکتا تھا، کیونکہ اس سوال کا جواب وہ ابھی نہیں جانتی تھیں۔



"ممی میں کوئی اس سے پہلی بار تھوڑی ملا تھا۔ ہزار بار مل چکا ہوں۔" الیان فوری طور پر کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے ٹالتے ہوئے بولا مگر وہ تو جیسے ایک ایک منٹ گن کر الیان کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بھلا جواب سنے بغیر کیسے ٹل جاتیں تب ہی قدرے چمک کر بولیں۔

"تو اتنی مصروفیت میں سے ٹائم نکال کر تم خاص اسے دیکھنے تو ایسے ہی گئے تھے جیسے اس کا چہرہ تک بھول گئے ہو اور اب کہہ رہے ہو میں اس سے ہزار بار مل چکا ہوں۔" الیان کو اب کوفت ہونے لگی تھی۔

وہ اس کا مقصد جانتی تھیں، پھر بھی انہوں نے حامد کو مطلع کر دیا اور اب اس کی رائے ایسے پوچھ رہی تھیں جیسے انکار کر ہی نہیں سکے گا۔

"وہ ملنا اور ابھی کا ملنا تھوڑا الگ تھا۔" الیان نے بیزاری سے کہا۔

"تو میں بھی تو وہی پوچھ رہی ہوں کیسا لگا تم نے حامد کو۔" وہ عجیب آس و نراش کی کیفیت میں گھری اسے دیکھنے لگیں تو الیان انہیں دیکھتا چلا گیا۔

وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے ان سے معمولی سی بھی بدتمیزی نہیں کی تھی، بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا ان کی بیماری وغیرہ کے موقع پر الیان نے لڑکا ہونے کے باوجود ہمیشہ بریرہ سے زیادہ ان کی خدمت کی تھی۔

بریرہ تو اپنے لاابالی پن کی وجہ سے ان کی تیمارداری بھی توجہ سے نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ الیان ہی ان کی دیکھ بھال میں لگ جاتا اور انہیں ایسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتا جیسے کسی موذی مرض میں مبتلا ہوں۔

اب اس وقت بھی ان کے رویے سے خائف ہونے کے باوجود وہ ان سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکا اور اپنے لہجے کو شگفتہ بناتے ہوئے پوری سچائی سے بولا۔

"بہت اچھا، ہر لحاظ سے بہتر، بریرہ کے لیے ایک دم پرفیکٹ۔"

شگفتہ غفار کا چہرہ ایسے کھل اٹھا جیسے انہیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو انہوں نے بے اختیار اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

الیان ان کی وارفتگی پر بے اختیار مسکرا دیا، وہ اتنی خوش تھیں کہ ان سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ الیان نے انہیں کندھوں سے تھام کر پاس رکھے صوفے پر بٹھا دیا اور خود ان کے سامنے فرش پر دو زانو بیٹھتے ہوئے اپنی دونوں کہنیاں ان کے گھٹنوں پر رکھ دیں۔

"لیکن میرے پسند کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا، آخری فیصلہ بہرحال بریرہ کو ہی کرنا ہے، اس کی مرضی پوچھے بغیر ہم۔۔۔"

"اس کی مرضی میں پوچھ چکی ہوں اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شگفتہ غفار چہک کر بولیں۔

وہ اتنی خوش تھیں کہ ان کی خوشی دیکھ کر الیان کا موڈ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا۔ تب ہی وہ ان کی اتنی جلد بازی پر بے ساختہ ہنس رہا۔

"کمال ہے رشتہ آیا نہیں اور آپ نے لڑکی کی مرضی پہلے سے پوچھ لی۔"

"رشتہ تو آنا یقینی ہے، تمہارے ماموں مجھ سے بات کر چکے ہیں، بس رسم دنیا نبھانے کے لیے بات پکی کرنے آئیں گے۔"

"یعنی ہماری رائے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔۔۔ میں ہاں بھرتا یا نہیں، آپ ماموں کو ہاں کر چکی تھیں۔" الیان نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تو وہ انگلیوں سے اس کے بال سنوارتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

"تمہاری رائے کی اہمیت کیوں نہیں۔۔۔ بریرہ سے بھی میں نے تمہارے جانے کے بعد ہی پوچھا ہے، اگر وہ انکار

کرتی تو پہلے ہی تم واپس آ کر اس رشتے کے لیے تیار ہو جاتے مگر میں انکار کر دیتی۔" الیان ان کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔
وہ جانتا تھا شگفتہ غفار ایسے ہی کہہ رہی ہیں اگر بریرہ نے انکار کیا ہوتا تو وہ مستقل اس کا برین واش کر کے اسے راضی ضرور کرتیں اور اگر تب بھی وہ نہ مانتی تو یہ کہہ کر حامد کے ساتھ اس کا رشتہ پکا کر دیتیں کہ
"وہ ابھی بچی ہے' اپنے اچھے برے کی اسے تمیز نہیں۔"
شگفتہ غفار شروع سے اپنی چلانے کی عادی تھیں' ان کا ماننا تھا جو انہیں ٹھیک لگ رہا ہے بس وہ ہی ٹھیک ہے اور باقی سب غلط۔
اسی لیے اس کا خود ایک بار بریرہ سے دو ٹوک بات کرنے کا ارادہ تھا۔ حالانکہ اسے یقین تھا اس کی ماں جھوٹ نہیں بول رہی' بریرہ کو واقعی کوئی اعتراض نہیں ہوگا' وہ اس معاملے میں پوری طرح غیر جانبدار ہوگی جو سب کو مناسب لگ رہا ہوگا' وہی اسے بھی ٹھیک لگے گا۔
لیکن پھر بھی الیان اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کیا ممی کو دی اس کی رضامندی میں ممی کی اپنی چلانے کی عادت تو بنیاد نہیں بن گئی۔
الیان کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں؟ کیا یقین نہیں آرہا میری بات پر۔"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں سوچ رہا تھا ماموں جان جب رشتہ لے کر آئیں گے تو وہ فوراً" تاریخ بھی مانگ لیں گے' ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا۔" الیان نے بات بدلتے ہوئے کہا۔
"ظاہری بات ہے اور جلدی تو مجھے بھی ہے' میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ سب کچھ جلد سے جلد ہو جائے۔" وہ سرشار سے انداز میں بولیں جیسے ابھی سے انہوں نے بریرہ کو رخصت کرنے کے بعد کی کیفیت کو محسوس کر لیا ہو۔
الیان ان کے انداز پر ایک بار پھر مسکرا دیا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھنے لگا تو وہ اسے شوخی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔
"بریرہ کو رخصت کر کے میری ایک اور مہم شروع ہوگی۔"
"وہ کیا؟" الیان نے حیرانی سے پوچھا۔
"چاند سی بہو کی تلاش۔" انہوں نے چٹخارہ لینے والے انداز میں کہا تو الیان کی ہنسی نکل گئی اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔
"کیوں میرے لیے کوئی لڑکی بچپن سے پسند کر کے نہیں رکھی۔" الیان نے چھیڑنے والے انداز میں کہا مگر وہ برا مانے بغیر بولیں۔
"پسند کوئی کرنے کی چیز نہیں ہے یہ تو خود بخود ہونے والا عمل ہے اور تمہارے لیے ابھی تک ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی جسے دیکھ کر دل یہ گواہی دے کہ ہاں بس یہی ہے وہ۔"
"ممی میرا اگلے پانچ سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور یہ بات میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں۔" الیان نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا تو وہ بھی مست انداز میں بولیں۔
"ایسی باتیں کتنی بار بھی بتا لو یا دہرا لو جس وقت نکاح کا وقت لکھا ہوتا ہے نا اس وقت وہ سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے اور انسان کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"
"تو پھر آپ کیوں چاند سی بہو ڈھونڈنا چاہتی ہیں' جس وقت جس سے نکاح لکھا ہوگا اسی سے ہوگا۔ چاہے وہ چاند کا ٹکڑا ہونے کی بجائے بھینس کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔" اپنی بات پر الیان خود ہی ہنس پڑا۔



مگر اب کی بار نا صرف شگفتہ غفار سنجیدہ ہو گئیں بلکہ برا مانتے ہوئے بولیں۔
"اللہ نہ کرے' کیسی باتیں کرتے ہو۔"
"ممی میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ ان کا موڈ بدلتا دیکھ کر رسانیت سے بولا تو وہ بھی مسکرا دیں۔
"میری بہو تو ایسی آئے گی کہ دنیا دیکھے گی۔" وہ فخریہ انداز میں بولیں تو الیان صرف مسکرا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

خرم آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ ایک آگ سی تھی جو اس کے اندر جل رہی تھی اور اس کے پورے وجود کو بھسم کر رہی تھی۔
ہر پل' ہر لمحہ اس آگ کی تپش میں اضافہ ہو رہا تھا' کیونکہ ہر پل' ہر لمحہ وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر آتا اور اس کا دل و دماغ مزید دہکنے لگتا۔
نمل کا تھپڑ۔
اس کی کہی باتیں۔
اس کا زہر خند لہجہ۔
اس کی آنکھوں سے چھلکتی حقارت۔
اور خود اس کا خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہ جانا اس سے کسی طور بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کیوں نہ اس نے بھی ایک طمانچہ نمل کے منہ پر مار دیا۔
وہ چپ چاپ سب کچھ سن کر کیوں آگیا۔
وہ اس لیے اس قدر ششدر رہ گیا تھا کہ کچھ کر ہی نہ سکا۔
اور اب اسے اس قدر شدید غصہ آرہا تھا کہ اسے لگ رہا تھا وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔
حالانکہ صبح وہ بڑے خوشگوار موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔
دو دن پہلے جو گھر وہ لوگ دیکھنے گئے تھے وہ فرقان حسن نے اسی وقت فائنل کر دیا تھا اور اس کی ساری تفصیلات اگلے دن ہی معلوم کر لی تھیں' تب ہی صبح جب وہ گھر سے یونیورسٹی جانے کے لیے نکلنے لگا تو فرقان حسن نے لیونگ روم میں ہی اسے روک لیا۔
مسز فرقان اس وقت لان میں بیٹھی کسی سے فون پر خوش گپیوں میں مصروف تھیں' فرقان حسن نے دور سے ہی ایک مطمئن نظر ان پر ڈال کر خرم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
"زیادہ جلدی میں تو نہیں ہو تم؟"
"No dad What s the matter" خرم نے گاڑی کی چابی کو جھلاتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔
"ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔ وہ جو گھر ہم دیکھ کر آئے تھے' جو تمہیں بہت پسند آیا تھا میں نے اس مکان کے بارے میں اپنے دوستوں سے معلوم کیا تو ایک بڑی عجیب بات سامنے آئی ہے۔"
"ایسی کیا بات ہے ڈیڈ۔" فرقان حسن کا پراسرار سا انداز خرم کو حیران ہونے پر مجبور کر گیا۔
"میرے ایک دوست پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ڈی ایس پی ہیں' میں نے انہیں فون کیا تھا' یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس پراپرٹی پر کوئی کیس وغیرہ چل رہا ہو تو مجھے پتا کر کے بتا دیں۔
تو انہوں نے کہا بلال اختر کو تو وہ خود ذاتی طور پر جانتے ہیں' اس گھر کے ساتھ ایسی کوئی پرابلم تو نہیں ہے پھر بھی

وہ چابی کر شفٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔
لیکن اس سے پہلے انہوں نے مجھے ایک بات بتائی جو وہ صرف بلال اختر کے دوست ہونے کی وجہ سے جانتے تھے۔
انہوں نے کہا کہ اس گھر میں کسی آسیب کا سایہ ہے۔" فرقان حسن اپنی بات کہہ کر رک کر اس کی شکل دیکھنے لگے جو بدستور خاموشی سے انہیں منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ان کی بات کی وضاحت مانگ رہا ہو' تب ہی فرقان حسن کو کہنا پڑا۔
"وہ گھر بلال اختر کا آبائی گھر ہے' بلال اختر شروع سے اسی گھر میں رہتے آرہے ہیں' مگر اکثر سننے میں آتا ہے کہ اس گھر میں کسی لڑکی کی روح رہتی ہے۔" خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنی شروع ہو گئی' فرقان حسن اس کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔
"اور وہ روح صرف ان کی بیٹی کو نظر آتی ہے' یہاں تک کہ ایک بار اس لڑکی نے اپنی ایک دوست پر جانی حملہ بھی کر دیا تھا اور بعد میں یہ کہا تھا کہ یہ حملہ اس نے نہیں بلکہ اس روح نے کیا ہے جو اس گھر میں رہتی ہے۔
تب بلال اختر نے ڈی ایس پی سے ہی بات کی تھی اور اپنی بیٹی کے خلاف پولیس کیس بننے سے روکا تھا۔
اسی لیے ڈی ایس پی کو یقین ہے کہ بلال اپنا خاندانی گھر اپنی بیٹی کی وجہ سے ہی بیچ رہا ہے' کیونکہ بچپن سے ہی اس لڑکی کا نفسیاتی علاج ہو رہا ہے۔ مگر اس کی بیماری ٹھیک نہیں ہو رہی' ڈی ایس پی کو لگتا ہے یہ گھر بیچ کر وہ اس کی حالت میں سدھار کی ایک کوشش کر رہا ہے۔" فرقان حسن کی طویل بات خرم نے بڑے سکون سے سنی تھی۔ یہاں تک کے ان کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ البتہ بات کے اختتام تک اس کی مسکراہٹ کافی گہری ہو چکی تھی۔
"بھئی مسکرانا چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔" فرقان حسن نے کچھ بور ہو کر کہا تو خرم بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔
" Come on dad آپ تو ہارر موویز بھی نہیں دیکھتے' پھر بھی آپ اتنے خوف زدہ ہو رہے ہیں حالانکہ ڈر مجھے لگنا چاہیے جس نے Haunted House پر بیس کرتی ہر مووی دیکھ رکھی ہے۔"
"خرم" فرقان حسن تنبیہی انداز میں بولے۔
"No dad Im can it' ایک طرف تو آپ کہہ رہے ہیں۔"
اس لڑکی کے علاوہ کسی اور کو وہ روح نظر نہیں آتی' دوسری طرف آپ کہہ رہے ہیں' اس لڑکی کا بچپن سے نفسیاتی علاج ہو رہا ہے۔
"اب آپ خود بتائیں یہاں کہنے اور سننے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔"
"ہم وہ گھر خریدنے جا رہے ہیں۔" فرقان حسن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو خرم ان ہی کے انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔
"اور ہم وہ ہی گھر خریدیں گے۔" فرقان حسن خاموشی سے اسے دیکھنے لگے تو وہ لاپروائی سے کہنے لگا۔
"ڈیڈ یہ روحیں' بھوت' پریت' آسیب سب بکواس باتیں ہیں' اگر کوئی روح وہاں ہے تو صرف اس لڑکی کو کیوں نظر آتی ہے' باقی سب کو نظر کیوں نہیں آتی۔
کیونکہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔
اس کے والدین ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے طور پر وہ گھر بیچ رہے ہیں۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی بیماریاں کبھی ٹھیک نہیں ہوتیں' اس کا مرض اس لڑکی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔



ہمیں موقع مل رہا ہے اتنا اچھا گھر خریدنے کا' ہم ان توہم پرستی کے پیچھے اس موقع کو کیوں مس کر دیں' یہ تو سراسر بے وقوفی ہے۔" خرم ناصحانہ انداز میں بولا۔
"تمہاری ماں کو اس بارے میں' میں نے کچھ نہیں بتایا ہے' اگر انہیں پتا چلا ہے۔"
"آپ انہیں کچھ بتائیں گے بھی نہیں تو انہیں کچھ پتا بھی نہیں چلے گا' اسی لیے انہیں پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔
بلاوجہ وہ وہم میں مبتلا رہیں گی' جبکہ ہم سب خود وہ گھر دیکھ کر آرہے ہیں' کیا آپ کو اس گھر میں جا کر لگا کہ وہاں کوئی روح ہے' کیا کسی بھی زاویے سے وہ گھر آپ کو پراسرار لگا۔" خرم کے پوچھنے پر انہوں نے پوری سچائی سے گردن نفی میں ہلا دی اور ساتھ ہی کہنے لگے۔
"میں خود ان باتوں کو نہیں مانتا ہوں۔ لیکن پھر بھی دل میں خیال آرہا ہے اتنے سارے مکان موجود ہیں' پھر کیا ضرورت ہے اسی کو خریدنے کی' جہاں ایک لڑکی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہو۔" ان کی بات پر خرم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔
"کتنے بچے ہیں بلال اختر کے؟"
"ایک ہی بیٹی ہے۔"
"وہ جو اس دن اس کمرے میں موجود تھی۔" خرم نے چھوٹتے ہی کہا۔
"کون سے کمرے میں' میں نے تو نہیں دیکھا۔" فرقان حسن سوچتے ہوئے بولے۔
"ہاں آپ نے شاید اسے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ ہے نفسیاتی کیس۔" خرم کے استفہامیہ لہجے میں بلا کی حیرت تھی' پھر وہ قدرے تجسس سے پوچھنے لگا۔
"کیا کیا تھا اس نے اپنی دوست کے ساتھ۔"
"اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔" خرم کا منہ کھلا چلا گیا' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا تو فرقان حسن مزید تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔
"اس کی دوست وہاں اس گھر میں رہنے گئی تھی۔ وہ دونوں چھت پر اس روح کو بلا کر اس سے بات کرنے گئی تھیں۔ آدھی رات کو ان دونوں نے یہ خرافات کی تھیں تو بلال اختر کی بیٹی جسے وہ ڈی ایس پی نفسیاتی مریضہ بتا رہے تھے۔ اس نے اپنی دوست پر حملہ کر دیا' اس کا سر زمین پر دے مارا' وہ بری طرح چیخی تو سب لوگ جاگ گئے اور فوراً چھت پر پہنچ گئے۔
ڈی ایس پی کہہ رہا تھا اس لڑکی کی زندگی اللہ تعالیٰ نے رکھی تھی جو بلال اختر وغیرہ اتنی جلدی پہنچ گئے۔ ورنہ اتنے بڑے گھر میں محض آواز سے سمت کا اندازہ لگا کر فوراً پہنچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔" فرقان حسن کہتے چلے گئے۔
" Amazing " خرم نے آنکھیں پھیلا کر گویا اپنی حیرت کا اظہار کیا۔
"دیکھنے میں وہ لڑکی بہت ڈرپوک سی لگ رہی تھی' وہ کسی کے ساتھ اتنا وحشیانہ سلوک کر سکتی ہے۔
"it's unbeliveable"
"ہاں تو جو لوگ سائیکو ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں' دیکھنے میں وہ بہت معصوم اور سادہ ہوتے ہیں' جبکہ اندر سے ان کا ذہن پورا شیطانی ہوتا ہے۔"
"جب آپ کو پتا ہے کہ وہ سائیکو ہے تو پھر کیوں اتنا سوچ رہے ہیں' آپ سب کچھ فوراً فائنل کر دیں' تاکہ بلال اختر جلد سے جلد گھر خالی کر دیں اور ہم لوگ وہاں شفٹ ہو سکیں۔" خرم نے ایسے کہا جیسے وہ سامان پیک کیے بلال اختر کے گھر کے سامنے کھڑا ہو۔

فرقان حسن اس کے انداز پر مسکرا دیے تو ان کی مسکراہٹ کا مطلب تھا کہ وہ خرم کی بات پر راضی ہو گئے ہیں۔ تب ہی خرم بھی مسکرا کر یونیورسٹی جانے کے لیے پلٹ گیا۔ مگر ابھی وہ دو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ خرم رک کر پلٹے بغیر صرف گردن موڑ کر فرقان حسن سے پوچھنے لگا۔

"اس گھر میں کوئی سایا ہے یہ بات کتنے لوگ جانتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ کیا یہ بات بہت مشہور ہے؟"

"میرا نہیں خیال کہ اس بات کی زیادہ شہرت ہوئی لوگ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ بلال اختر کی بیٹی کا نفسیاتی علاج چل رہا ہے۔" فرقان پر سوچ انداز میں بولے تو خرم سر ہلا کر رہ گیا۔

"کیوں۔ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔" فرقان حسن نے پوچھا تو خرم

"کچھ نہیں" کے انداز میں کندھے اچکاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

جو بات اس کے ذہن میں آئی تھی اس کا تذکرہ اگر وہ فرقان حسن سے کرتا تو وہ یقیناً گھر خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے۔

اگر اس گھر کے آسیب زدہ ہونے کی کہانی بہت لوگ جانتے — تو ان لوگوں کے شفٹ ہوتے ہی مسز فرقان کو کسی نہ کسی کے ذریعے یہ بات پتا چل جاتی اور جس چیز میں انسان کو شک ہو جائے پھر اس چیز سے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ مسز فرقان بھی اڑتی ہوا سے خوف کھانے لگتیں۔ وہ ویسے بھی خاصی ڈرپوک قسم کی واقع ہوئی تھیں۔ ان کا تو اس گھر میں رہنا دوبھر ہو جاتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اگر اس گھر کے متعلق ایسی منفی باتیں مشہور ہیں تو لوگ بھی اس گھر کی طرف سے بدگمان ہوں گے اور یہی بات وہ فرقان حسن کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا' کوئی ان کے گھر کو کسی بھی لحاظ سے برا یا منحوس سمجھے یہ بات فرقان حسن کبھی برداشت نہ کرتے' جبکہ خرم کی عادت تھی جو چیز اسے پسند آجاتی وہ اسے ہر حال میں حاصل کرتا تھا۔ وہ گھر اسے بہت اچھا لگا تھا اسے اس قدر فضول اور بے بنیاد بات کے پیچھے تو وہ کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

سارے راستے وہ اسی گھر کے متعلق سوچتا رہا تھا' مگر یونیورسٹی کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ جیسے ہی باہر نکلا اس کی ساری سوچیں ہوا ہو گئیں۔ جو منظر اس کے سامنے تھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

وہ عجیب و غریب حلیے کا شخص جان بوجھ کر نمل اور اس کی دوست سے ٹکرایا تھا' بلکہ نمل پر ہاتھ میں پکڑی بوتل بھی انڈیل دی تھی۔

خرم اسی پل اس کی جانب بڑھا تھا' مگر اس کے پہنچنے تک اس لفنگے نے نمل کے تھپڑ کے جواب میں اس کے گدی پر پڑے بال بڑی بے باکی سے جکڑ لیے تھے۔

خرم کی آنکھوں میں تو گویا خون اتر آیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا' وہ اس شخص کی کھال اتار دے' مگر وہ تو اپنا غصہ پوری طرح نکال بھی نہیں سکا تھا کہ نمل نے وہ کر دیا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا اور اب جتنا وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا اتنا ہی ذلت کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔

حالانکہ صورت حال اس کی سمجھ میں بہت اچھی طرح آگئی تھی۔

نمل نے جو کچھ بھی اسے کہا تھا اس کے پیچھے بدگمانی کی وجہ وہ کہانی تھی جو خرم نے حمید اور ودی کو آزمانے کے لیے گھڑی تھی۔

یقیناً سمیر نے وہ سب کچھ سن کر نمل کو مطلع کر دیا تھا اور آج کی اس حرکت کو دیکھ کر نمل یہ ہی سمجھی کہ خرم نے اپنے پلان پر عمل کر دیا ہے۔

مگر وہ چاہے کتنا بھی لاجیکل ہو جاتا وہ نمل کے رویے کو چاہے جتنا بھی غیر جانبدار ہو کر دیکھ لیتا وہ اس کے الفاظ انہیں بھلا پا رہا تھا۔



نمل نے جتنی نفرت سے اس کی بے عزتی کی تھی وہ اس کی برداشت سے باہر تھی۔

"تم ایسے کرائے کے غنڈے منگوا کر یا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کسی ہوئی نازیبا حرکت تو کر سکتے ہو' مگر میری جیسی لڑکی کے وقار تک نہیں پہنچ سکتے' کیونکہ مجھ تک پہنچنا تمہارے جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔" یہ الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھا جو اس کے کانوں میں انڈیل دیا گیا تھا اور جس کے بعد اب اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا سوائے ان جملوں کی بازگشت کے جو اس کی اذیت میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔

وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا' دل تو چاہ رہا تھا ابھی اور اسی وقت اسے شوٹ کر دے' مگر دماغ دل کے اس تقاضے کو مسلسل رد کیے جا رہا تھا۔

وہ اسے تڑپانا چاہتا تھا۔

اسے تکلیف میں دیکھنا چاہتا تھا۔

جتنی نفرت سے اس نے دھتکارا تھا۔

اتنی ہی بے بسی سے وہ اسے اپنے آگے گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

اپنی اس خواہش پر وہ بڑی آسانی سے عمل کر سکتا تھا' اسے اغوا کر کے کسی ویرانے میں وہ اسے اپنے پاؤں پڑنے پر آسانی سے مجبور کر سکتا تھا۔

مگر دماغ نے اس کی اس خواہش کو بھی کو دل مسترد کر دیتا' کیونکہ ایسا کرنے سے تو نمل کی بات پر مہر لگ جائے گی۔

یہی تو کہا تھا اس نے کہ وہ اپنی دولت و امارت سے یا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کوئی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے' مگر اس کے وقار تک نہیں پہنچ سکتا' کیونکہ اس تک پہنچنا خرم کے بس کی بات نہیں تھی۔

دل و دماغ کے بیچ چھڑی اس جنگ میں اس کے اعصاب بری طرح شل ہو گئے تھے۔

چار گھنٹے تک مسلسل بے مقصد ڈرائیو کرتے کرتے وہ بری طرح تھک گیا تھا اور جس پل اسے یقین ہو گیا اب وہ گاڑی کہیں ٹھوک دے گا تب اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا' کیونکہ نمل سے بدلہ لیے بغیر وہ اس دنیا سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا راستے میں آئی ہر چیز اڑا دے۔

گھر آکر بھی وہ بغیر کپڑے بدلے جوتوں سمیت بستر پر آڑا ترچھا گر گیا۔

اندر کے شور کو دبانے کے لیے اس نے فل والیوم میں ڈیک آن کر دیا۔

تیز چیختا چلاتا شور و غل پر مبنی انگلش گانا گھر کے در و دیوار ہلا گیا تھا' مگر نمل کے الفاظ کی گونج کو دبانے میں ناکام رہا تھا۔

تب ہی اچانک کمرے میں ایک دم سکوت چھا گیا۔ خرم نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔

ڈیک کے پاس مسز فرقان کو کھڑا دیکھ کر خرم کچھ دیر تو ان کے غور سے دیکھتا رہا' پھر واپس چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔

"خیریت تو ہے بیٹا' تم آج اتنی جلدی کیسے آگئے اور اگر آہی گئے تھے تو کپڑے وغیرہ چینج کر کے ڈائننگ ٹیبل پر آجاتے یہ جوتے لے کر بیڈ پر کیوں چڑھ گئے ہو۔" مسز فرقان ڈیک کے پاس پڑی بے ترتیب cds کو اٹھا کر اسٹینڈ میں رکھتے ہوئے تواتر سے بولتی رہیں' مگر خرم بھی ان سنی کیے پڑا رہا تو وہ اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔

"کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹمپریچر چیک کرنا چاہا تو خرم ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"ٹھیک ہوں ماما' بس تھوڑا سر میں درد ہے' ایک کپ چائے بنوا دیں میرے لیے۔" وہ انگلیوں سے بال ٹھیک کرتے ہوئے خود کو ہر ممکن حد تک نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں ذرا بھی اندازہ ہو اس کی کیفیت کا' اگر انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پوچھ پوچھ کر اسے

عاجز کرتی تھیں۔

"یہ کون سا وقت ہے چائے کا، بھوک خراب ہو جائے گی پہلے کھانا کھاؤ۔" مسز فرقان کو اپنے کمرے سے بھیجنے کے لیے اس نے چائے کی فرمائش کی تھی ورنہ دل تو کچھ بھی کھانے پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں کھا کر آیا ہوں، آپ بس چائے بنوا دیں۔" خرم نے صفائی سے جھوٹ بولا تو انہوں نے سر ہلا کر اٹھتے ہوئے کمرے میں لگا انٹر کام اٹھایا اور نیچے موجود ملازم کو دو کپ چائے لانے کا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

خرم بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا جو اس کے بستر پر پڑے بے تحاشا کشنز کو اٹھا اٹھا کر ترتیب سے رکھنے لگی تھیں گویا ابھی ان کا یہاں سے ٹلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ ان کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ بالکل فارغ تھیں اور خرم کے اچانک آ جانے سے جیسے انہیں کوئی بات کرنے والا مل گیا۔ حالانکہ ان کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا۔ اکثر فلیچ ہونے کے ساتھ ہی ان کی فون کالز شروع ہو جاتیں شاید یہی وجہ تھی کہ انہیں باتیں کرنے کا بھی کچھ زیادہ ہی شوق ہو گیا تھا اس وقت بھی وہ اپنی کسی دوست سے فون پر بات کر کے اٹھی تھیں اور جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کسی اور کے گوش گزار کرنے کو بے چین تھیں کہ خرم آ گیا اگر وہ نہ آتا تو وہ کسی اور کو فون گھما کر یہ سب سنا رہی ہوتیں جو خرم کو سناتے وقت ایک بار بھی انہوں نے اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا ورنہ اس کے چہرے پر چھائی بے زاری دیکھ کر ان کی زبان کو خود ہی بریک لگ جاتے۔

"مسز صادق تو اس قدر جھوٹ بولتی ہیں کہ ان کی کسی بات کا یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا ابھی بھی وہ بتا رہی تھیں کہ مسز پرویز جو صرف دو تین دن کے لیے لندن گئی تھیں وہاں انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

ان کی بیٹی کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ انہوں نے سوچا یہاں تو کوئی بے وقوف نہیں بنے گا لندن میں کسی کو پکڑ کر بیٹی کو وہیں رخصت کر دیا۔

اب بھلا بتاؤ اگر یہ بات سچ ہوتی تو مجھے ان کے لندن جانے سے پہلے ہی پتا چل جاتا۔ کسی پر بہتان لگاتے ہوئے مسز صادق کو ذرا اپنی بیٹیوں کا خیال نہیں آتا حالانکہ ان کی بیٹیوں کی حرکتوں سے بھی میں خوب واقف ہوں۔"

"چھوڑیں ماما، بہتان اور غیبت دونوں ہی بری باتیں ہیں۔" خرم نے اکتا کر کہا مگر وہ تبھی ہی نہیں بلکہ تائیدی انداز میں بولیں۔

"ہاں یہی تو میں کہہ رہی ہوں اگر مسز پرویز کی بیٹی ایسی ہے بھی تو اس کی برائیاں میرے سامنے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اصل میں انہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہارے لیے مسز پرویز کی بیٹی کو پسند کر لیا ہے۔ میں نے ایک دو دفعہ اس کی تعریف کیا کر دی مسز صادق کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں' وہ چاہتی ہیں میں اپنے اتنے اچھے بیٹے کے لیے ان کی کسی بیٹی کو پسند کر لوں' وہ تمہارے قابل نہیں بھلا کہاں تم اور کہاں وہ لڑکیاں۔" خرم چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

ان کے لہجے میں غرور نہیں تھا' البتہ مسز صادق کے لیے غصہ ضرور در آیا تھا۔

"کیا پتا ماما آپ کے بیٹے کو لوگ کس قابل سمجھتے ہیں۔" خرم کا سپاٹ لہجہ انہوں نے محسوس ہی نہیں کیا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اپنی تعریف سننے کا دل چاہ رہا ہے تو صاف بتا دو' گھما کر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ شوخی سے بولیں' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگیں۔

"میرا بیٹا چاہے کسی قابل ہو یا نہ ہو' ان لڑکیوں کی حرکتیں میں اچھی طرح جانتی ہوں' کسی شریف گھرانے کی بہو بننے کے قابل نہیں ہیں وہ۔

میں تو ہمیشہ ایک ہی بات کہتی ہوں لڑکی بھلے ہی بہت خوب صورت نہ ہو مگر اچھے خاندان کی ہو' جسے گھر لا کر



ہمارے خاندان کا وقار بڑھے' گھٹے نہیں۔" مسز فرقان روانی میں بولتی چلی گئیں اور خرم کچھ لمحوں کے لیے سن سا ہو گیا' کمال کے وہ الفاظ جو تھوڑی دیر کے لیے اس کی سماعتوں سے ٹکرانا بند ہو گئے تھے ایک بار پھر سنائی دینے لگے۔

"مجھ تک پہنچنا تمہارے جیسے گرے ہوئے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔"

مسز فرقان اب بھی کچھ بول رہی تھیں مگر اب خرم کو ان کی آواز نہیں آ رہی تھی' ذہن میں سب کچھ جیسے ایک دم صاف ہو گیا' جو غبار سا دل و دماغ پر چھایا تھا وہ ایک دم چھٹنے لگا۔

جس عزم کے ساتھ وہ یونیورسٹی سے نکلا تھا وہ عزم پورا کرنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

وہ کمال کو رونا سکتا تھا' وہ جھکنا چاہتا تھا اپنے آگے ہارتے ہوئے شکست خوردہ دیکھنا چاہتا تھا تو اس کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی' وہ دوست یا وقار طریقے سے بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔

کیا سمجھتی تھی وہ خود کو کہ خرم حسن اس تک نہیں پہنچ سکتا' اس کے معیار تک آنا خرم کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اگر وہ یہ سمجھتی تھی تو اس نے ایسا سوچ کر بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ اب شاید اسے عمر بھر بھگتنا تھا یا کم از کم تب تک جب تک خرم حسن اس سے بدلہ لیتے لیتے بور نہ ہو جائے۔

☼ ☼ ☼

عائشہ اختر کو جب سے یہ پتا چلا تھا کہ بلال اختر نے ان کے سونے کے دوران نہ صرف ایک پارٹی کو پورا گھر دکھا دیا بلکہ ان کے ساتھ ڈیل بھی فائنل کر لی اور اگلے دن سے کاغذات کی تیاری بھی شروع کرا دی ہے۔ تب سے وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔ انہوں نے زوبیہ کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر بلال اختر سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔

خود زوبیہ کو ان کے اقدام سے تکلیف ہوئی تھی۔ اول تو وہ یہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ یہ گھر بکے اور یہ تو اسے کسی طور منظور نہیں تھا کہ یہ گھر وہ لوگ خرید لیں جو اس کمرے تک آئے تھے اور جن کے بیٹے نے ایک پل میں طے کر لیا تھا کہ زوبیہ والا کمرہ اس کا ہو گا۔

جب سے زوبیہ نے یہ سنا تھا اس کے وجود پر ایک تھکن سی سوار ہو گئی تھی اور اس پر مما پاپا کا زور زور سے لڑنا' وہ جسمانی اور ذہنی دونوں طور پر مضمحل ہو گئی تھی پھر بھی وہیں کھانے کی میز پر بیٹھی ان کی لڑائی سنتی رہی۔

"میں آخری بار کہہ رہی ہوں آپ یہ گھر نہیں بیچیں گے۔" عائشہ اختر چیخ پڑیں تو بلال اختر بھی کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"اور میں بھی آخری بار کہہ رہا ہوں تم اس موضوع پر اب کچھ نہیں بولو گی' یہ گھر میں بیچ رہا ہوں بہت اچھی قیمت بھی لگ گئی ہے۔"

"اس گھر کی کوئی قیمت ہے ہی نہیں۔ یہ گھر کتنا انمول ہے یہ آپ مجھ سے پوچھیں۔" عائشہ اختر کے عجیب و غریب لہجے پر بلال اختر تو کیا خود زوبیہ بھی انہیں چونک کر دیکھنے لگی۔

"زوبیہ بیٹا آپ اپنے کمرے میں جائیں۔" بلال اختر نے صاف اسے منظر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیوں؟ زوبیہ کے سامنے بات کرتے جھجک ہے یا ہمت نہیں ہے زوبیہ کے سامنے بات کرنے کی۔" عائشہ اختر تنک کر بولیں' بلال اختر نے جس طرح لب بھینچے تھے اس سے صاف ظاہر تھا انہوں نے خود کو کچھ کہنے سے بمشکل روکا ہے۔

زوبیہ کو ایسا لگا وہ محض اس کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہ گئے ہوں۔

"زوبیہ میں نے آپ سے کہا ہے آپ جائیں۔" بلال اختر ایک ایک لفظ چبا کر بولے تو زوبیہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تب ہی اس نے عائشہ اختر کو روہانسے لہجے میں کہتے سنا۔

"اس گھر کے لیے میں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی بچی کو بھی کھو دیا ہے اور اب آپ اسے ہی بیچنے کی بات کر رہے ہیں۔" زوبیہ چلتے چلتے رک کر عائشہ اختر کی شکل دیکھنے لگی۔

بلال اختر ان کی چلتی زبان سے تنگ آ کر چلا کر بولے۔

"اسی بچی کے لیے اس گھر کو بیچ رہا ہوں' کوئی اپنے لیے نہیں کر رہا یہ سب' اس لیے براہ مہربانی یہ جذباتی باتیں بند کر دو۔"

"تمہیں کتنی بار یہاں سے جانے کے لیے کہنا پڑے گا زوبیہ۔" بلال اختر کی دھاڑ پر زوبیہ سہم کر تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ اتنی تیزی سے سیڑھیاں چڑھی تھی کہ اس کا سانس پھولنے لگا تھا' اگر وہ بلال اختر سے اتنا ڈرتی نہیں تو وہاں رک کر عائشہ اختر کی گفتگو سننے کی کوشش ضرور کرتی۔

جانے وہ کن قربانیوں کا ذکر کر رہی تھیں اور پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا کہ۔

"یہاں تک کہ اپنی بچی کو بھی کھو دیا۔"

وہ تو اسے ذہنی مریضہ سمجھتے تھے' پھر اس کی بیماری کے پیچھے وہ اس گھر کو مورد الزام کیوں ٹھہرا رہی تھیں۔

وہ تو یہ مانتی ہی نہیں تھیں کہ اسے اس گھر میں کوئی روح نظر آتی ہے' پھر بھلا اس گھر سے اس کی بیماری کا کیا تعلق ہے۔

وہ تو شائستہ خالہ کے وجود سے ہی انکار کر دیتیں تو بھلا ان کی روح کو کیا مانتیں' وہ تو کئی بار بڑی سختی سے کہہ چکی تھیں۔

"کوئی نہیں ہے میرا' لاوارث ہوں میں' جیسے یتیم خانے میں بچے ہوتے ہیں نا' کوئی آگے نہ پیچھے' میں بھی ایسی ہی ہوں۔"

ان کا جذباتی انداز میں کہنا ظاہر کرتا تھا جیسے وہ اپنے گھر والوں سے لڑ جھگڑ کر بیٹھی ہیں۔

مگر آج کی ان کی گفتگو سے زوبیہ کچھ اور بھی الجھ گئی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت تھی نہ کوئی فائدہ۔

وہ کبھی شاذ و نادر غصہ میں ایسا بول گئی تھیں۔ غصہ اترنے پر ان سے ان کی باتوں کی وضاحت مانگنا فضول تھا۔ وہ کبھی بھی قبول نہ کرتیں اور پھر زوبیہ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ ان سے ان کی کسی بھی بات پر جواب طلب کرتی۔

مگر اس کے اندر بے شمار سوال سر اٹھاتے تھے' آخر شائستہ خالہ کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا جو مما پاپا تو ذکر تک سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں' بلکہ یہاں تک کہہ دیتیں۔

"شائستہ نام کی میری کوئی بہن نہیں ہے' یہ صرف تمہارے دماغ کا فتور ہے۔"

زوبیہ خاموشی سے اپنے بستر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی رہی' عائشہ اختر اور بلال اختر کے قدموں کی آواز اسے اپنے دروازے کے باہر سنائی دی تھی' پھر اس نے ان کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے سنا تو اسے یقین ہو گیا ان کی لاحاصل بحث ختم ہو چکی ہے' مگر کسی نتیجے پر پہنچے بنا ہی وہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچ گئے سونے کے لیے۔

☆ ☆ ☆

تحمل اس قدر غصے میں وہاں سے نکلی تھی کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ شام تک کہیں جا کر



جب اس کی کیفیت ذرا نارمل ہونی شروع ہوئی تو رومیلہ اس کے گھر چلی آئی۔

وہ صبح سے اس کا فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی' کیونکہ اسے معلوم تھا رومیلہ نصیحتوں کا پلندہ کھول دے گی۔

اور واقعی یہی ہوا' اسے دیکھتے ہی رومیلہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"یہ تم نے کیا کیا تحمل۔ کیا ضرورت تھی تمہیں خرم پر ہاتھ..."

"ضرورت! جو کچھ ہوا اس کے بعد بھی تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کیا ضرورت تھی' بجائے مجھے سمجھنے کے تم مجھے سمجھا رہی ہو۔" تحمل کا صبح والا لاوا ابھر کر بہنے لگا۔

"میں تمہیں سمجھتی ہوں' لیکن تھوڑا بہت حالات کو بھی سمجھنا چاہیے' جس طرح تمہارے جانے کے بعد خرم اپنی گاڑی لے کر نکلا ہے' اسے دیکھنے کے بعد سے مجھے ہول اٹھ رہے ہیں' پتا نہیں وہ کیا کرنے والا ہے۔ اتنا تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں وہ تمہیں اتنی آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔" رومیلہ کے چہرے پر اس کے لیے پریشانی ہی پریشانی تھی۔

تحمل اس کی باتوں پر دھیان دیے بغیر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"جو کرنا ہے کر لے' لیکن مجھے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔" تحمل کے حتمی انداز پر رومیلہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو تحمل نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے چپ کرا دیا۔

"امی گھر پر ہیں' انہوں نے اگر کچھ سن لیا تو خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی' اب ختم کرو اس بات کو۔"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

انسان کی زندگی سفر سے عبارت ہے۔ ازل سے انسان حالت سفر میں ہے۔ کبھی اس کا سفر اپنی ذات کی تلاش کے گرد رہتا ہے تو کبھی اس کا مقصد سفر کسی ایسی شخصیت کے لیے ہوتا ہے جو اس کی پہنچ سے دور ہو۔ مگر پھر بھی اسے پانے اور حاصل کرنے کی لگن و جستجو ہمہ وقت اسے گردش میں الجھائے رکھتی ہے مگر اس کا سفر ہنوز جاری رہتا ہے اور وقت گزر جاتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی گزرنا ہے۔

کرن کی سالگرہ کے موقع پر حسب روایت ہم نے قارئین سے کچھ دلچسپ سوالات کیے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

سوالات

(1) 2010ء میں شائع ہونے والے ناول' ناولٹ اور افسانوں میں آپ کا پسندیدہ اقتباس یا پوئیشن؟

(2) شاعر کہتا ہے۔

روز اٹھ کر چاند ٹانکا ہے فلک پر رات کو<br>
اور دن کی روشنی میں رات تک آیا کیے<br>
ہاتھ بھر کے فاصلے کو عمر بھر چلنا پڑا

ایسی کوئی شخصیت جس تک پہنچنے کے لیے آپ نے مستقل سفر کیا ہو پھر بھی فاصلہ طے نہ ہوا ہو؟

(3) اپنے پسندیدہ اداکار/اداکارہ' سیاست دان یا شخصیت کو اس کی سالگرہ کے موقع پر آپ کیا تحفہ دینا پسند کریں گی؟

(4) اگر آپ کو اپنے ماضی میں جانا پڑا تو آپ اپنے کون سے دور میں جانا چاہیں گی وجہ بھی بتائیں؟

# باتیں کچھ معنی اور بے معنی سی

ریحانہ امجد بخاری

## انیقہ نائلہ۔ چکوال

1 ۔ پہلا سوال خاصا مشکل اور وقت طلب ہے۔ اس ایک سوال کے ساتھ ہی ذہن میں کئی تحریروں کے بے شمار اقتباس گھومنے لگے ہیں۔ مگر وائے ری قسمت تمام اقتباسات پرانی تحریروں کے ہیں۔ سال 2010ء کے نہیں۔ اب کیا کروں؟ بہرحال! نومبر 2010ء کے شمارے میں "عشق آتش" کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اس میں دو جملے (فی الوقت اقتباس موجود نہیں نا!) مجھے بے حد اچھے لگے۔

"آپ کا چہرہ آپ کا دوست ہے' یہ آپ کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتا۔" اسی کے برعکس "عمر جہانگیر" "علیزہ" سے کہتا ہے۔

"تمہارا چہرہ ساری کہانی کہہ دیتا ہے۔" (اف یہ عمر جہانگیر بھی بے وقت یاد آتا ہے۔) خیر دوسرا جملہ۔

"جب سے میں نے آپ کو حفظ کیا ہے خود کو بھول گیا ہوں۔" بہت گہرا جملہ ہے یہ۔

2 ۔ ایسی شخصیت' اب کیا کہوں یہ میرا پاگل پن ہی ہے نا! اب ایک ایسی شخصیت جس کا حقیقت میں نام و نشان نہ ہو ہم اسے پانے کی تمنا کریں' یہ پاگل پن ہی ہے نا۔ بھی پاگل ہی نہیں اسے کھونا کیسا؟ سات برس ہونے کو ہیں مجھے اس شخص کی تمنا میں' کیا کہوں؟ عمیرہ احمد نے "امر بیل" لکھ کر مجھے عمر کا اسیر کر دیا۔ ایک عمر جہانگیر کی وجہ سے مجھے عمر نام سے عشق ہے۔ اور یقین مانیے عمر کے علاوہ کوئی نہیں جسے پانے کو میں صدیوں سے منتظر ہوں۔ بقول شاعر!

مینہ برستا رہا مزاج پہ بادل کی طرح<br>
چاند نکلا ہے مجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

مگر اس برسوں کے سفر کے باوجود یہ بھی لگتا ہے میرا پاگل پن بھی کانوں سے "مسز عمر" کی دستک سنتی رہے گی۔ وہاں وہیں ہوں جہاں تھی' تیرے دھاگے کے پاگل پن میں کمی آئے۔

3 ۔ یوں تو میری پسندیدہ شخصیات کی فہرست لمبی ہے اور جو بدلتی رہتی ہے۔ مگر دو شخصیات ایسی ہیں جو روز اول سے میری پسندیدہ ترین ہیں۔ ان میں ایک عمیرہ احمد ہیں۔ جن کا ہر ہر لفظ مجھے جنون کی حد تک پسند ہے اور دوسری میں خود' خود اپنی پسندیدہ شخصیت ہوں۔ (کیا کروں میں خاصی خود پسند واقع ہوئی ہوں۔) رہی بات تحفہ دینے کی تو کتاب میری اولین ترجیح ہے۔ عمیرہ احمد سے ملنا تو دیوانے کا خواب لگتا ہے اور انہیں تحفے میں کیا دوں یہ کافی مشکل مرحلہ ہے۔ اسے پھر کبھی بیٹھ کر حل کریں گے۔ رہا میرا خود کا تحفہ تو میری سالگرہ عنقریب آیا ہی چاہتی ہے۔ یوں تو میری خواہش ہوتی ہے کہ خود کو عمیرہ احمد کا ہی ناول تحفتاً پیش کروں۔ مگر قسمت "امر بیل" "پیر کامل صلی اللہ علیہ وسلم" تا "من و سلویٰ" تک سبھی ناول میرے پاس موجود ہیں۔ اب کیا کروں؟ تحفہ بھی ضروری ہے ورنہ تو میں خود سے خفا ہو جاؤں گی۔ لہٰذا اس بار میں نے خود کو "دل اک شہر جنوں" اور "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" دینے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔

4 ۔ ویسے تو میں کہتی ہوں۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب

مگر اس کے باوجود' جواب تو دینا فرض ہے نا! نہ جانے کس مفکر نے کہا تھا کہ۔

"عورت کی عمر کے تین ادوار ہیں' بچپن' جوانی اور پھر جوانی۔" تو میں پہلے اور دوسرے دور میں جانا پسند کروں گی۔ بچپن کا وہ دور کتنا اچھا تھا' یہ ان دنوں کی بات ہے۔ (میری تعلیم کے چوتھے سے پانچویں سال تک) جب اماں (نانی جان) زندہ تھیں میں' سعدیہ اور جنید رات کو ان سے کہانی سنے بغیر نہیں سویا کرتے تھے۔ میری اماں' عظیم عورت' ہندوستان میں خوش حالی میں رہیں۔ پاکستان میں خود کام کر کے رزق حلال کمایا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین) کیا دور تھا وہ' رات کے کھانے پر ہم سب بہن بھائی موجود ہوتے اب تو..... (خیر جانے دیں)

پھر 2007ء تا 2008ء کا زمانہ جب میں نے

لگ بی۔ ایڈ کرتے جا رہی۔ کالج میں بہترین اساتذہ کا ساتھ رہا جن سے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھا۔ ان سے اب دوستی کا رشتہ استوار ہے۔

اور فائزہ' فرحت' غزالہ اور حمیرا جیسی بہترین سہیلیاں..... کیا دن تھے ہم کہتے کہ نہیں پڑھنا مگر پیریڈ زبردستی پڑھانے پر مصر وہ سردیوں کی ٹھٹھرتی صبحیں جب گھاس کے اوپر زمین کا فرش' اور ہم صبح کی سرد ہوا سے لطف اندوز ہوتے' سیڑھیوں پر ٹانگیں پسار کے بیٹھنا' پیپرز کی پریشانی' وہ نیند کے جھونکے' کیا کیا یاد کروں' کس کس کو یاد کروں؟ زندگی کا بہترین وقت (کالج میں) گزرا۔ دل کہتا تھا یہ وقت تھم جائے' مگر وقت کب ٹھہرا ہے بھلا' شاعر کہتا ہے۔

کیا خبر تھی کہ چلے گی ایسی ہوا<br>
کہ خشک پتوں کی طرح دوست بکھر جائیں گے

آہ! کیا دور یاد دلایا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ خیر' میری طرف سے تمام قارئین کو کرن کی سالگرہ مبارک' اللہ ترقی سے نوازے آمین۔ اپنا خیال رکھیے' خوش رہیے۔

## نگل ہما۔ فیصل آباد

وفا کی بستی میں رہنے والوں سے ہم نے محسن یہ طور سیکھا لبوں پہ صحرا کی تشنگی ہو' مگر دلوں میں نہاں سمندر

1 ۔ 2010ء میں شائع ہونے والے تمام ناولز زبردست رہے۔ سبھی شماروں کو آگے رکھے' کسی ایک تحریر' ایک اقتباس کا انتخاب بہت مشکل ہے۔ اسی سال "دست کوزہ گر" جیسی تحریر کا آغاز ہوا' جس کی کئی اقساط گزرنے کے باوجود زوبیہ کی شخصیت ابھی تک ایک معمہ ہے۔ "بساط دل" کا اختتام بھی خوب صورت رہا۔ خصوصاً" عنایہ کے انجام نے دل خوش کر دیا۔ نایاب جیلانی چھائی رہیں۔ نبیلہ عزیز کی تحریر "رسم" مجھے بہت پسند آئی۔ اور سعدیہ عابی ہارون کی تحریر "اسے اک معجزہ کہتے ہیں" میں عنایہ کا شافعی سے لگاؤ اور "صراط مستقیم" کا آئیڈیا مجھے لگا جیسے میرے خواب کی تعبیر ہو۔ مجھے بھی ایک ایسا ادارہ بنانے کا شوق ہے۔ اسی ناول میں سے ایک اقتباس لکھ رہی ہوں۔

"اس کی موجودگی کے دم سے مجھے احساس رہتا تھا کہ اللہ میرے بہت قریب میرے آس پاس موجود رہتا ہے۔ میرے وجود میں' میرے گھر میں اسی کے دم قدم سے

ہرکشیں اور وحشتیں تمام تھیں۔ مجھے کبھی اپنے اکیلے ہونے کا یا پھر تنہائی کی اس حالت پر افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے چھوٹے تمام کام کرکے اسے کھانا کھلا کے اس کی ہر اور اس کی خوشی کے مطابق اس کے ساتھ کھیل کے اور کبھی کبھی اس کی ناراضی برداشت کرکے مجھے ہمیشہ ایک گہرا سکون حاصل ہوتا تھا۔ ہاں البتہ اس کی تکلیف اور بیماری مجھے ہمیشہ ڈرایا کرتی تھی۔"

اس ناول میں اگرچہ عنایہ کا کردار کافی انتہا پسند سا ہے، مگر مجھے بہت پسند آیا۔ کافی حد تک میں خود بھی ایسی ہی ہوں، نفع نقصان سے لاپروا۔

تو میرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں، خوف زوال بھی نہیں

تھی اس قدر عجیب مسافت کہ کچھ نہ پوچھیے
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں اور خواب تھک گئے

2۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے بظاہر بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے، مگر ایک موڑ اچانک ایسا سامنے آتا ہے کہ انسان حیرت و دکھ سے ساکت رہ جاتا ہے کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے ریاضتیں کیں۔ دعائیں مانگیں، اپنی خوشیاں انہیں سونپ دیں اور ہمارے ہاتھ کیا آیا؟ ایک سعی لاحاصل... تنہائی... ویران آنکھیں یا بنجر دل... یہی سب حاصل سفر ہوتا ہے اور اچانک پتا چلتا ہے کہ ہم جس جانب سفر کررہے ہیں وہ منزل تو کسی اور کی ہے ایسے میں کیا احساسات ہوسکتے ہیں؟ یہی سب کچھ مجھ پر بیتا۔ اپنی ذات کے بے مایہ ہونے کا دکھ بہت گہرا ہوتا ہے اندر تک چھلنی کردیتا ہے۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی، مگر اس کو بسر اس نے کیا

دو سال چار ماہ اور تیرہ دن کا یہ سفر جب اختتام کو پہنچا تو تھکن عمر بھر کی ہے، درد رگ رگ میں سرائیت کرگیا۔ مجھے خود اپنے حوصلوں کا علم نہ تھا، آزمایا تو گویا ہمت چٹان بن گئی۔ چند دنوں میں عمروں کا سفر کیا۔

طویل بہت ہے کشاکش ذات کا سفر
آگہی کے بعد ہے کم آگہی بہت

ایک ہی بات ایک ہی سوچ تھی جس نے مضبوط کیا کہ اگر ماں کھیلنے کے لیے ہمارے ہاتھ میں انگارہ بھی دے دے

تو اللہ جو کہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے ہمارے ہاتھ میں غلط چیز کیسے تھما سکتا ہے۔ اہم چیز رشتے نہیں وہ اعتماد اور محبت ہے جو ان کو قائم رکھتا ہے۔ بہت سے چہروں سے نقاب ہٹے جنہیں مخلص اور دوستی کا دعوا تھا وہ ہی زخمی کرنے کو تیر لیے صف اول میں تھے۔ دل کو تکلیف تو بہت ہوئی، مگر اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے۔ کھرے اور کھوٹے الگ الگ ہوگئے۔

میرے خدا مجھے اپنی امان میں رکھنا
کسی کے درد کا نشتر میری تلاش میں ہے

وہ چند دوست جنہوں نے اس مشکل مرحلے میں بھی میرا ساتھ دیا، ان کا شکریہ خاص طور پر باجیہ، غزل، پروین اور ام کلثوم اور سب سے بڑھ کر آصف بھائی آپ سب نے حق دوستی ادا کردیا۔ آصف بھائی آپ کا وہ جملہ کہ "گڑیا اگر مجھے ایک فیصد بھی یہ امکان نظر آتا کہ تمہاری خوشی پوری ہوگی تو میں ہر حد سے گزر جاتا۔" آئی لو یو سوچ تک لی۔ مجھے آپ لوگوں پر واقعی فخر ہے۔

3۔ مجھے پھول اور کتابیں بے تحاشا پسند ہیں۔ سو میں اپنے دوستوں اور پیاروں کو زیادہ تر کتب ہی گفٹ کرتی ہوں۔ میری پسندیدہ شخصیت محسن نقوی جبکہ فیورٹ سیاست دان پرویز مشرف ہیں۔ محسن نقوی تو زندہ نہیں ہاں مشرف صاحب کو میں ان ہی کی کتاب گفٹ کروں گی اور ایک میرا ارمان ہے کہ میں پاپا کو ان کے خواب کی تعبیر دے سکوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اور آصف بھائی CSS کریں تو میں انہیں یہ تحفہ دینا چاہوں گی۔ آصف بھائی کو میں ان کے فیورٹ ناول اور پھول گفٹ کرنا چاہوں گی۔ اداکار مجھے کوئی خاص پسند نہیں ہیں سو معذرت۔ اور میں اپنی دوستوں کو ڈھیر ساری خوشیاں اور زبردست لونگ انڈر اسٹینڈنگ پارٹنرز گفٹ کرنا چاہتی ہوں۔ (ہنسیں مت)
وہ جو [illegible] میرے نام کے وہ تمہیں بھی [illegible] ہیں، انہیں میں سوال میرے دوست [illegible]

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے

اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے



میری امیدوں کا حاصل میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

میرے لیے ماضی کچھ بہت زیادہ خوش گوار نہیں، ہاں مجھے اگر ماضی میں جانا پڑے تو میں اپنے بچپن کے اس دور میں جانا چاہوں گی جب میں حفظ کررہی تھی۔ مجھے اس دور میں اپنی ماما کی بہت توجہ ملی۔ میری عمر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجھے حفظ مکمل کرنے پر خالہ نے چین سیٹ اور ڈول گفٹ کی تھیں۔ میری عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ اور میری ماما کی خوشی میرے لیے ناقابل فراموش لمحات ہیں۔ اور ایک اور دور میں بھی واپس جانا چاہتی ہوں وہ میرے کالج کے ابتدائی سال ہیں۔ مجھے فرسٹ ایئر میں میم شبانہ عامر اور ثنا مریم جیسی ٹیچرز ملیں، جن کا میری کامیابیوں میں اہم کردار ہے۔ پوری کلاس کے ساتھ دوری اور آصف کے وہ الفاظ۔
"وہ کل تمہاری صورت بہت یاد آئی ہے۔ کالج تمہارے جانے سے ویران ہوگیا ہے۔"

سحر آفتاب۔ باغبان پورہ لاہور

1۔ بہت دفعہ ذہن پر دستک دی، اپنی یادداشت کے دریچوں کو کھولا، مگر ہر بار ایک ہی جواب موصول ہوا۔ سعدیہ راجپوت کا "عشق آتش"۔
"عشق آتش" اگرچہ سال کے آخر یعنی نومبر میں شائع ہونا شروع ہوا، مگر میری نظر میں پھر بھی بازی لے گیا۔ "عشق آتش" کا موضوع، الفاظ کا چناؤ، کرداروں کی مضبوطی، موضوع کے آگے بڑھنے کی رفتار غرض اس ناول کا حرف حرف سعدیہ راجپوت کو ایک باصلاحیت اور منجھا ہوا اہل قلم کار ثابت کرتا ہے۔
میرا پسندیدہ اقتباس بھی اسی ناول کی ابتدائی سطور پر مشتمل ہے۔ ان الفاظ کو میں نے ایک بار پڑھنے کے بعد دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھا اور تاحال میں ان الفاظ کی گرفت میں ہوں۔
"کون کہتا ہے زندگی سمجھی اور سمجھائی نہیں جاسکتی، جبکہ مردہ جسموں سے بھرے قبرستان قدرت کی یونیورسٹیز ہیں اور دو گز زمین تلے دبا ہر شخص زندگی کا پروفیسر تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم پیدا ہوتے ہیں، مرجاتے ہیں، پر جی نہیں پاتے کہ ہم نے تو بس وقت کو جینا سیکھا ہے۔ زندگی کو تو ہم نے کبھی جیا ہی نہیں، اور جب یہ ہی وقت ہمارے ہاں ختم ہوجاتا ہے تو سوچتے ہیں کہ ہم عمر بھر وقت کے کھاتے میں نفع نقصان درج کرتے رہے تو وہ کون سا پیمانہ تھا جو اس بے وقعتی کے کام آیا اور کیا کوئی ایسا فارمولا بھی ہے جو بتاسکے کہ نفع نقصان کے سوا کچھ نہیں نقصان تو صرف نقصان ہی دے سکتا ہے، جبکہ سچ تو یہ ہے کہ زندگی دراصل کب ہے یہ تو سودا ہی گھاٹے کا ہے۔ ہم تو عدم میں بہت آرام سے تھے، پھر اس زندگی کے ہاتھوں وجود میں بدل کر اس متضاد دنیا میں آئے بھی، آزمائش میں ڈالے گئے اور آزمائش میں نہ تو منافع کی امید ہوتی ہے اور نقصان کی، مگر حیرت ہے پھر بھی ہم خسارے کی فہرست مرتب کرتے رہے۔"

2۔ اس سوال کا جواب میں ایک شعر سے ہی دینا چاہوں گی۔

تجھ سے تو دل کے پاس ملاقات ہوگئی
میں خود کو ڈھونڈنے کے لیے در بدر گیا

زندگی کی پچیس بہاریں الحمدللہ دیکھ لی ہیں مگر اپنی ذات کی تلاش تاحال ادھوری ہے۔ جب بھی قرآن کا ترجمہ پڑھوں، کوئی حدیث نظر سے گزرے، صوفیا اور اولیاء کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کروں یا کسی ادیب کے شاہکار کو پڑھوں تو خود کو ملامت کرتی ہوں کہ میں کتنی تہی دست ہوں، میری سوچ، میرا خیال، میرا تخیل، میرے الفاظ، میرا انداز اور اطوار اتنے مکمل اور بہترین کیوں نہیں کہ مثال بن سکوں۔

3۔ میں تمام اداکاروں کو ان کی سالگرہ پر اس دعا کا تحفہ دینا چاہوں گی کہ اللہ ان کو نیکی اور حیا کے راستے پر چلائے جبکہ تمام سیاست دانوں کو علامہ اقبال کے افکار اور قائداعظم کے سیاسی خیالات اپنانے کی درخواست کروں گی تاکہ پاکستان اسلامی اقدار کو پاسکے۔

4۔ میں رب کائنات کے احسانوں تلے سرنگوں ہوں۔ الحمدللہ میں ایک پرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ تاہم میرے پاس ایسا کوئی اختیار ہو تو میں اپنے ماضی کے اس بہترین اور سنہری دور میں جانا پسند کروں گی جو میرا کالج اور یونیورسٹی کا زمانہ طالب علمی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دور غم دوراں، غم جاناں اور غم روزگار سے پاک تھا اور علم کے سمندر کے بیش قیمت اور گراں قدر موتی بہترین کتابوں اور ادب کی صورت میں ایک ہاتھ کے فاصلے پر

لائبریری میں موجود ہوتے تھے' جس کو پڑھ کر اپنی تشنگی دور کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابا پاپا کے اساتذہ کا دست شفقت ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ میری ذات کی کمیوں کو دور کرتا رہتا تھا اور میری شخصیت کے جھول ختم ہوتے رہتے تھے۔

## عالیہ ذوالقرنین۔۔۔ سنت نگر لاہور

1۔ مجھے کرن میں شامل ہونے والے ناولٹ "گوشہ عافیت" میں اس وقت جو پوزیشن اچھی لگی جب عاصمہ اپنی نند کا ساتھ دینے اس سے تعلقات اچھے کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور پھر مختلف کرائسز سے گزرتی ہے۔ یہ بہت سی ایسی بہنوں کے لیے بھی ایک سبق ہے جو اپنے شوہروں کو اعتماد میں لیے بغیر کوئی بھی بڑا قدم اٹھا لیتی ہیں اور پھر ساری صورت حال کی ذمہ دار خود بن جاتی ہیں' چاہے جانے میں یا انجانے میں۔ میری ان بہنوں سے جو اس وقت میرے یہ جوابات پڑھ رہی ہیں۔ گزارش ہے کہ شادی کے بعد عورت کے لیے سب سے زیادہ قابل اعتماد اور قابل اعتبار رشتہ صرف اور صرف اس کے شوہر کا ہے۔ ورنہ پھر بعض اوقات ان حالات تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے جن سے آج کل "گوشہ عافیت" میں عاصمہ گزر رہی ہے۔

2۔ ایسی شخصیت جس تک پہنچنے کے لیے میں نے مسلسل سفر کیا اور پھر بھی فاصلہ طے نہ ہوا وہ ذات کبریا میرا مالک ارض و سماں میرا بہت پیار کرنے والا رب ہے۔ میرا اللہ ہے۔ جو دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے مجھے اپنی عطا کی جانے والی نعمتوں کا لالچ دے رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ماں اپنے دونوں ہاتھ کھول کر اپنے بچے کو اپنے پاس بلانے کے لیے مختلف ٹافیوں' بسکٹوں اور چپس کا لالچ دیتی ہے۔ میرا رب بھی مجھے اسی طرح پیار سے بلا رہا ہے' میں ہر دفعہ اس کی طرف بڑھتی ہوں' لیکن پھر اچانک میرے گناہوں کی دیوار اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ مجھے نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔ میرے بار عصیاں سے میرے پاؤں میں چلنے کی سکت نہیں رہتی' بس یہ ہی ایک سفر ہے جو ازل سے جاری ہے۔ جس کا کوئی اختتام نہیں ہے۔ مگر نہیں' اس کا اختتام ہے جب میرا بہت پیار کرنے والا اللہ میری ناتوانی' میری بے بسی' میری بے بسی دیکھ کر خود میری طرف چند قدم اور بڑھ جائے اسی پل ان شاء اللہ اس سفر کا اختتام ہو گا۔

3۔ اپنی پسندیدہ شخصیت کو جن میں میرے بہت سے چاہنے والے وہ لوگ جو مجھے اس وقت بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں جب تمام انسان نیند لے کر سو رہے ہوتے ہیں۔ جن میں میری والدہ' میری ایک دوست فرح (کراچی) جو کہ ایک کامیاب وکیل ہیں۔ میرے ایک بزرگ انکل ارشاد جو سندھ ہائی کورٹ میں ہوتے ہیں۔ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ تمام دوست اور لوگ' جو گاہے بگاہے میری زندگی میں آتے رہے ہیں۔ ان سب کو تحفہ دینے کے لیے میں کسی ایسی چیز کا انتخاب نہیں کروں گی جو فانی ہو جانے والی ہو۔ بلکہ ان کے لیے تہجد میں اپنے رب کے سامنے جھک کر ان کی زندگی کی آسانیاں طلب کروں گی' دونوں جہانوں کی کامیابیاں طلب کروں گی۔ آقائے نامدار کا روز حشر میں ان کا سامنا اس حال میں طلب کروں گی کہ وہ بڑھ کر ان کا استقبال کریں۔ ان سے خوش ہوں۔ اور ان کے لیے وہ تمام خوبیاں اور بہتری طلب کروں گی جو میرے آقا نے مانگیں اور ان تمام آفات' آزمائشوں' مصیبتوں اور تکالیف سے نجات طلب کروں گی جو میرے آقا نے طلب کیں اللہ عزوجل ان تمام لوگوں کو جن کا کسی بھی طرح مجھ سے کوئی تعلق ہے اپنی خاص رحمتوں کے حصار میں رکھے (آمین)

4۔ اگر مجھے بھی اپنے گزشتہ دور میں جانے کا اختیار دیا جائے تو اس کے لیے میرا منتخب دور میرے عمرے اور حج کا دور ہو گا۔ آج سے چار سال پہلے اگست 2006ء میں میں اور میرے شوہر ذوالقرنین عمرے پر گئے تھے۔ وہ پہلی نظر... اور اب اس سال 2010ء میں حج پر گئے وہ پہلی نظر... جو بیت اللہ شریف پر پڑی ناقابل بیان احساسات لیے ہوئے تھی جن کو بیان کرنا الفاظ و تحریر میں لانا مجھ جیسی ذرہ ناچیز کے اختیار میں نہیں۔ کہتے ہیں پہلی نظر میں جو مانگو ملتا ہے۔ اللہ رب العزت کا اپنے آنے والے مہمانوں سے وعدہ ہے۔ مگر اس حالت میں مانگنا بذات خود ایک سخت طلب مرحلہ ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ اپنی خوش بختی پر ناز کروں کہ آج میں اس مقام پر کھڑی ہوں جہاں پیغمبروں اور اولیاء کرام کے قدم پڑے جہاں محبت کرنے والے رب کی رحمتیں ابر باراں کی طرح برستی ہیں۔ جہاں اللہ کی عطا اس طرح نچھاور کی جاتی ہے کہ بڑے سے بڑا کشکول



بھی چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ جہاں صرف محبت ہے' رحمت ہے' بخشش ہے' نجات ہے' صرف اور صرف عطا ہے اور عطا کرنے پر نظر بھی نہیں کی جاتی کہ لینے والا مستحق ہے یا نہیں؟ کبھی تو اپنے اس بابرکت مبارک جگہ پر ذرا سی جگہ ملنے پر بھی اپنی خوش بختی پر ناز ہوتا ہے' رشک آتا ہے اور کبھی سمجھ نہیں آیا کہ اپنی بدبختی اور بدنصیبی پر کس طرح ماتم کروں کہ آج میرا نامہ اعمال میں ایک ذرہ برابر نیکی بھی نہیں۔

ایسا کوئی ایک عمل بھی تو نہیں جو قدموں کو لڑکھڑانے سے روک دے' کوئی تو ایک ہی ایسی نیکی ہوتی کہ میں فخر سے اپنے رب کے حضور لے کر حاضر ہوتی۔ مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تو خالی ہاتھ' خالی دامن اپنے رب کے سامنے کھڑی تھی' ساکت اور آنکھوں سے گرتا آنسو اپنی' جو کوئی ایک بھی نیکی نامہ اعمال میں نہ ہونے کے باوجود بڑے دھڑلے سے اپنے پیارے اللہ سے بہت کچھ مانگ رہا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ میرے رحمان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ میرا رحیم آج ہر طرح رحم کو تیار ہے۔ میرا وہاب آج صرف اور عطا کی بات کر رہا ہے۔ آج اس کی بارگاہ میں خطا کی کوئی پوچھ نہیں' خطا پر کوئی سرزنش نہیں۔ خطا کا کوئی ذکر نہیں۔ اللہ اکبر وہ باتیں تو مجھ سے ختم ہونے پر بھی ختم نہ ہوں گی۔ لیکن میں اپنے اسی دور میں صرف ایک بار نہیں بار بار جانا چاہوں گی' اب اجازت دیں' لیکن اگر ہو سکے تو مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

## فوزیہ ثمرین بٹ۔۔۔ گجرات

1۔ اگر مجھے پتا ہوتا سال کے اینڈ میں آپ یہ سوال پوچھیں گے تو بے شمار پوزیشن اور اقتباس بتا سکتی تھی۔ میرے خیال میں 2010ء میں ایسا کوئی اقتباس نہیں گزرا جو پسندیدگی کی لسٹ میں آ سکے۔ اگر آپ 2010ء کی جگہ' نہ لگاتے تو شاید میں اپنے ایک دو فیورٹ اقتباس لکھ دیتی۔ کہانی ہو فلم ہو یا ڈرامہ مجھے زیادہ تر کوئی سین' کوئی فقرہ ہی پسند آتا ہے۔ مجھے عمیرہ احمد کے ناول امر بیل سے یہ اقتباس بہت پسند ہے۔ اگر جگہ ہوئی تو ضرور شائع کیجیے گا۔

"زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے' کمپرومائز' پرسکون زندگی گزارنے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ جس چیز کو تم بدل نہ سکو اس کے ساتھ کمپرومائز کرنا سیکھ لو۔ اپنی کسی بھی خواہش کو جنون مت بنایا کرو' زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں' جو ہمیں مل نہیں سکتیں' مچلتے ہیں روتے ہیں چلاتے ہیں بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں۔ کیونکہ وہ کسی اور کے لیے ہوتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی میں ہمارے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں' بلکہ بہت کچھ ہمارے لیے بھی ہوتا ہے۔"

2۔ زندگی تو ایک مسلسل سفر ہے' کچھ لوگوں کی زندگیوں میں صرف سفر لکھ دیے جاتے ہیں۔ ان کی منزلوں کا نشاں نہیں ہوتا۔ وہ حالات سفر میں رہتے' مگر منزل ان کا نصیب نہیں ہوتی' خیر ایسی کوئی شخصیت نہیں جس کے لیے سفر کیا ہو۔

3۔ اداکار کی بجائے اگر آپ گلوکار کہتے تو میں شہزاد رائے کا نام لیتی۔ ان کی سالگرہ 13 فروری کو ہوتی ہے۔ ان کی سالگرہ والے دن میں ایک بہترین ٹائی گفٹ دیتی اور فرمائش کرتی شہزاد بھائی آپ اپنے ہر لائیو شو میں اپنا یہ والا گانا "کبھی کبھی تو ملا کرو' ہمیں بھی درشن دیا کرو" ضرور گایا کریں۔ اپنی فیورٹ اداکارہ مرینہ خان کو ایک پیاری سی بلیوں کا جوڑا گفٹ کرتی اور سدا خوش رہنے کی دعا دیتی۔

اداکار فیصل قریشی کو "ڈنڈی" پیر دیتی اور کہتی اوئے اللہ کے بندے ہر ڈرامے میں رومانس بگھارتے نظر آتے ہو۔ کچھ اپنی وائف پہ رحم کھاؤ۔ کچھ اس کے لیے بھی بچا رکھو۔

سیاست دان پسندیدگی کی لسٹ میں یہ سوال تو آپ کا بڑا غیر ضروری ہے۔ خود بتائیے جن باسٹھ سالوں میں ان عظیم لوگوں نے پاکستان کا حشر کر دیا ہے۔ یہ کسی کی پسندیدگی کی فہرست میں ہو سکتے ہیں۔ ویسے میں شیخ رشید صاحب کو ایک لال مفلر' تسبیح اور جائے نماز کا تحفہ دیتی اور کہتی شیخ صاحب اب بس کریں اب آپ کے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ خود بھی سکون لیں اور دوسرے کو اس کا موقع دیں۔

4۔ سوال انٹرسٹنگ ہے۔ آپ نے ایک دور کا پوچھا ہے۔ میں پہلے تو عمرو عیار کے دور میں جانا پسند کرتی اور عمرو عیار سے کسی طریقے اس کی زنبیل لے کر آج کے دور میں آ جاتی اور تمام سیاست دانوں کے تمام اثاثوں کو اس زنبیل میں ڈالتی اور تمام مستحق لوگوں کو دے دیتی۔ پھر شاید جو آج ہمارے ملک کے حالات ہیں ویسے نہ رہتے۔

دوسرا اور مجھے اپنے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا لگتا ہے۔ کاش میں اس دور میں پیدا ہوتی' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیز ہوتی۔ ان کا ہر کام میں اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ کنیز ہوتی پاک بی بی حضرت فاطمۃ الزہرہ کی۔ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ وہ حسین دور جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم امام حسین کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا کرتے تھے۔ ان کی ہر خوشی' ہر فرمائش کو پورا کرتے' کاش کہ میرے اختیار میں ہوتا ہے تو میں ناچیز' ان کے پیروں کی خاک ان متبرک ہستیوں کو دیکھ سکتی۔ ان پاک ہستیوں کے صدقے اللہ نے ہمیں سب نعمتوں سے نوازا ہے۔

### سونیا رباب... قاضیاں محلہ بالا

1 ۔ ویسے تو ہر سال بہت ساری کہانیاں ایسی ہوتی ہیں کہ برسوں دماغ سے نہ نکل سکیں اور اس سال بھی بہت کچھ خاص پڑھنے اور سیکھنے کو ملا۔ ستمبر 2010ء کے شمارے میں عظمیٰ ہارون کا مکمل ناول آیا تھا اور یقین کریں' ناول کے شروع کے لفظوں نے ایسا اثر کیا۔ وہ ہی آپ سب سے شیئر کر رہی ہوں' کیونکہ ڈائری میں قید کر لیے تھے' عظمیٰ کہتی ہیں۔

"کتنی بڑی بھول ہے انسان کی یا شاید پھر اس کی سرشت میں ہی یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ جب وقت نے اسے اپنے پیروں کے کانٹوں کو الجھے ہوئے رستوں سے چننے میں مصروف رکھا ہو تو وہ نہ جانے کون سی خوش فہمیوں کے اثر میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید وقت نے اس کی خاطر باقی تمام دنیا کے لیے بھی اپنی مخصوص رفتار سے چلنا ترک کر دیا ہو گا۔ اور میرے خیال سے یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کو کھو دیتے ہیں' وقت اپنی رفتار سے ان کو ہم سے بہت دور لے جاتا ہے۔"

تو اک بار مل تو سہی مجھ سے کہیں
تجھ کو یقین آجائے گا دل میں گھر کیا آتا ہے مجھے

2 ۔ جی ہاں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں صرف دس منٹ لگاتی ہوں اور ہر کسی کو اپنا بنا لیتی ہوں۔ خوش مزاج ہونا' سوا ایسی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ ہاں اگر کبھی کوشش ہی نہ کی ہو تو وہ اور بات ہے۔ یاد آیا بچپن میں ایک ہماری مس تھیں مس عائشہ خان' میری عجیب اور معصوم سی خواہش تھی کہ میں باقی ہوں کی طرح ان کو عاشی کہوں اور وہ آمنہ کی طرح مجھے بھی پیار کریں اور میں ان سے ہاتھ ملاؤں مگر میری یہ خواہش تب پوری نہ ہوئی اور وہ آمنہ مس عائشہ کو صرف اس لیے پسند تھی کہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ ہاں یہ ہاتھ ملانے والی خواہش کچھ عرصہ شہر میں پوری ہوئی سو وہ نہ بچپن میں جب ان کے سامنے جاتی تو وہ صرف غصے سے دیکھتی تھیں۔ خیر مس عاشی مجھے اس دن آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ برسوں پرانی آرزو پوری ہوئی اور آپ مسکرا کر ملیں۔ (ہاں یہ زیادہ برسوں پرانی نہیں ہے صرف آٹھ برس پرانی بات ہے۔)

2 ۔ گفٹ کیا دوں گی۔ اگر کسی لڑکی کو دیا تو میں کالے رنگ کی خوب صورت سی شال گفٹ کروں گی' کسی لڑکی کے لیے یہ سب سے خوب صورت تحفہ ہے۔ اور اگر میں بھی وصی شاہ کو گفٹ دوں تو میرے خیال میں پرفیوم ٹھیک ہے۔

4 ۔ میں تیار بیٹھی ہوں جی اور مجھے دس سال پیچھے جانا ہے' زیادہ پیچھے جا کر میں نے کیا کرنا ہے۔ میں تو صرف دس سال پیچھے جانا چاہتی ہوں۔ اور یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے کہ تب بچپن تھا اور نانی کا خوب صورت آنگن تھا۔ نانی' نانا کا وہ انمول پیار تھا۔ بچپن دن تھے جو گزر گئے۔ وہ بارشوں میں نہانا' دھوپ میں ایک ساتھ گھومتے رہنا' واپس آکر نانا کا چھپ کر نانا کا ووٹ حاصل کرنا' جھولے پہ سارا دن گزار دینا اور گرمیوں کی چھٹیاں' تین ماہ جو ہوا کرتی تھیں' وہ جیسے ہفتوں میں گزر جاتی تھیں۔ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دور تھا۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں دس سال پیچھے جا سکتی۔ لیکن یہ کاش بھی نا' درمیان آگیا پھر سے۔

### سائرہ کرن... کوٹ چھٹہ

1 ۔ سعدیہ عابد چوہدری کے ناولٹ "میں وہ نہیں" سے یہ اقتباس لکھ رہی ہوں۔

"زینب نے ایک بار کہا تھا کہ میں عبیرہ اور آپ کو اکٹھے نہیں دیکھ سکتی مگر اس نے حسن کو عبیرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ حسن کہتا تھا کہ زینب ایک پہیلی ہے۔ سب اسے خود غرض اور احسان فراموش کہہ رہے تھے کہ اگر اس نے ضیاء سے ہی شادی کرنا تھی تو اتنے سال کیوں نہیں کی؟

اس کی شادی کے بعد حسن اس جگہ بیٹھا تھا جہاں وہ اس کی مہندی کی رات بیٹھی تھی۔ اس کے نہ ہونے کے احساس نے حسن ابراہیم کی وہ حالت کر دی تھی کہ اگر ڈاکٹر جاوید دیکھ لیتے تو اسے ابنارمل تصور کرتے۔ پتا نہیں یہ محبت کھو دینے کا دکھ تھا یا بہاروں کے چلے جانے سے دیوانہ انسان بن گیا' تکلیف اور دکھ محسوس کرنے والا۔ اسے پہلی بار اس تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ جس سے زینب اشفاق اپنی زندگی کے پانچ سال گزری تھی۔"

2 ۔ نہیں جی' ایسی کوئی بھی شخصیت نہیں ہے۔

3 ۔ میرا پسندیدہ اداکار سلمان خان ہے تو اسے اس کی سالگرہ پر میں اپنی آپی نبیلہ عزیز کا ناول "ایسا ہی ہو" اور اپنے ہاتھ سے بیک کیا ہوا کیک گفٹ کرنا چاہوں گی۔

4 ۔ اگر مجھے اپنے ماضی میں جانا پڑے تو میں اپنے بچپن کے دور میں جانا پسند کروں گی۔ میں نے اپنا سارا بچپن اپنے ننھیال میں انجوائے کرتے ہوئے گزارا ہے یا پھر اپنے کالج کے حصہ میں جانا پسند کروں گی۔ میں نے اپنی کالج لائف بے حد انجوائے کی تھی۔ اب مجھے اپنی ساری کلاس فیلوز بے حد یاد آتی ہیں۔ کتنی شرارتیں کیا کرتے تھے ہم۔ مجھے اس وقت کہانیاں لکھنے کا جنون تھا۔ جس وقت میڈم لیکچر دے رہی ہوتیں۔ اسی وقت میرے ذہن میں کہانیوں کے آئیڈیاز آتے تھے' جو میں لیکچر چھوڑ کر لکھنے بیٹھ جایا کرتی تھی کئی دفعہ اس حرکت پر ٹیچر سے ڈانٹ بھی پڑ جاتی تھی مگر خواہش کا کیا کیجیے۔ خیر وہ لمحے بہت یاد آتے ہیں۔ اور یہ حسین یادیں ہی میرا اثاثہ ہیں۔ آخر میں کرن کو سالگرہ مبارک۔

### سہیل... شہداد پور

1 ۔ شمسہ صدیق کا ناول "پھر کرم ہو گیا" بہت اچھا لگا اور اس کا اقتباس مجھے بہت اچھا لگا وہ یہ ہے۔

"نماز پاکیزگی کا دوسرا نام ہے' ایک دفعہ روح میں سمو کر نماز ادا کرنے سے انسان پاکیزگی کی لذت سے واقف ہو جاتا ہے اور پھر اس لذت سے دور رہنا مشکل لگنے لگتا ہے اور اگر ایک بار انسان اس لذت کو روح کی غذا بنا لے تو پھر اس کے بغیر زندہ نہیں رہ پاتا۔"

2 ۔ ابھی تک ایسا ہوا نہیں' ابھی تو اتنا سفر نہیں کیا' کسی شخصیت کے پاس پہنچنے میں۔

3 ۔ میں اپنے پسندیدہ اداکار یا سیاست دان کو اگر کبھی گفٹ دوں گی تو وہ قرآن پاک بمعہ تفسیر دوں گی کہ پڑھو اور عمل کرو۔

4 ۔ اگر ماضی میں جانا پایا ہوں تو اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جانا چاہوں گی جب انہوں نے کتنی مشکلیں اٹھائیں' ان کے صبر کو دیکھنا چاہوں گی اور محمد بن قاسم' محمود غزنوی کے دور میں جانا چاہوں گی۔ محمد بن قاسم نے اتنی چھوٹی عمر میں سندھ کو آزاد کروایا' محمود غزنوی کے دور میں اس نے اپنی ہمت سے سترہ علاقے فتح کرے اور انہیں شکست نہیں ہوئی' ایک ہمارے سیاست دانوں سے پاکستان کے مسئلے حل نہیں ہو رہے۔

### حمیرا... نامعلوم

1 ۔ 2010ء میں شائع ہونے والے تمام ناول ناولٹ اور مکمل ناول بہت اچھے تھے۔ اس میں شائع ہونے والی اسٹوری "طلوع سحر ہے شام محبت" نایاب جیلانی از دی بیسٹ رائٹر آف دی ایئر 2010ء (میری طرف سے) اس میں میرا پسندیدہ اقتباس!

"مگر وہ کتنی نام بہت خوش قسمت ہو۔ ایک دفعہ آنکھ کھول کر دیکھو۔ عبدالباری رو رہا ہے۔ بابا جان رنجیدہ ہیں۔ حنا کی آنکھیں نم ہیں۔ میں درد سے پھٹا دل لیے تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔ اس شاہ قدوس کی حویلی کے بیرونی دروازے کے ساتھ شان سے کھڑے بڑ کے درخت کی چھاؤں میں تنہا افسردہ زبان عبث غم سے بوجھل دل لیے تمہیں ایک نظر دیکھنے کی غرض سے کھڑا ہے اگر دیکھ لو تو اپنی خوش قسمتی پر مرنے کے بعد بھی غرور آجائے۔"

2 ۔ میری زندگی میں تو ایسی کوئی شخصیت نہیں' میرا اللہ پر ایمان ہے جو میرے لیے بہتر ہو گا' وہ مجھے مل جائے گا۔

3 ۔ میری پسندیدہ شخصیت عمیرہ احمد کو میں ان کی سالگرہ پر بہت سی دعائیں اور ان کے لیے اچھی سی کتاب "پیر کامل" جیسی گفٹ کروں گی' کیونکہ مجھے ان کے لکھنے کا انداز بہت اچھا لگتا ہے۔

4 ۔ اگر مجھے ماضی میں جانا پڑے تو میں اپنے بچپن میں جانا چاہوں گی ۔۔۔ وہ زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا' نہ فکر فردا نہ غم روزگار بس سکون اور آزادی کا احساس تھا۔ وہ وقت' وہ لمحہ مجھے ہر پل یاد آتے ہیں۔ اب ایسی آزادی کہاں؟ ہزاروں وسوسوں میں دل گھرا رہتا ہے' حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں ملک کے۔ اللہ ہمارے وطن کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

# بول کہ لب آزاد ہیں

ریحانہ علی احمد

### ام طیفور ۔۔۔ گوجرانوالہ

چند دن پہلے ہمارے گھر کچھ رشتہ داروں کی محفل جمی تھی۔ چائے کا سلسلہ جاری تھا۔ بات سے بات نکلی تو بات جا پہنچی لڑکیوں کے دوسرے شہروں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کی۔ سبھی زور و شور سے اپنی اپنی آراء سے نوازنے لگے۔ جن کا لب لباب یہ ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے۔

''ارے آج کل کی لڑکیاں ماشاء اللہ لڑکوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ بہتر سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور لڑکوں کا دوسرے شہروں میں اکیلے جا کے پڑھنا تو عام بات ہے اب میری ہی بیٹی کو لیجیے اکیلے ڈائیوو پہ بیٹھتی تھی اور وہاں جا اترتی تھی روز' ماشاء اللہ لاہور کی کون سی گلی ہے جو اس کے علم میں نہیں خود ہی ڈرائیونگ سیکھی اور خود ہی وہاں مارکیٹ جا کے اپنی ضروریات زندگی کی چیزیں لے آتی تھی۔''

''واہ' واہ! ماشاء اللہ۔'' دوسری جانب سے آواز اٹھی' اور وہ صاحب بولے۔

''دیکھیں جی! اب تو وہ دور ہی نہیں کہ بچیاں جس شہر میں اسکولنگ مکمل کریں وہیں کے کسی کالج یا یونیورسٹی میں جا پہنچیں۔ اب تو دوسرے شہر جا کے پڑھنے کا اپنا ہی ایک کریز ہے اب بھلا پرائیویٹ پڑھنا بھی کوئی پڑھنا ہے۔ جب تک آپ کالج کے بعد یونیورسٹی کا منہ نہ دیکھیں آپ دنیا کو کچھ نہیں سکتے۔ جو لڑکیاں گھر بیٹھے پرائیویٹ ایگزامز دیتی ہیں ان کی پڑھائی تو ''گھو کھاتے'' جاتی ہے۔''

یہ طنز دراصل ہمارے لیے تھا کیونکہ ہمارے پرائیویٹ ایم اے انگلش کو ہمارے خاندان والے اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک ہماری ڈگری کی کوئی ویلیو نہیں۔

خیر قارئین! یہاں آپ سے اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ آپ بھی جان سکیں کہ ہماری اخلاقی اقدار کا رخ کس جانب ہے۔ اخلاقی حدود و قیود کی بات تو بعد میں آتی ہے' کیا مذہبی نقطہ نظر سے یہ سب جائز ہے؟

یہاں بات لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے کی نہیں بلکہ دوسرے شہروں میں جا کر حاصل کرنے کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آؤٹ آف اسٹیشن جا کر پڑھنے والی لڑکیاں غلط ہیں مگر بلا ضرورت و مجبوری شہر جا کے پڑھنے والیوں پہ ضرور اعتراض ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اب کوئی شہر یا علاقہ ایسا رہ گیا ہے جہاں کالجز' یونیورسٹیز اور اکیڈمیز نہیں ہیں اور بالفرض اگر کہیں نہیں بھی ہیں تو وہاں کی لڑکیوں کی تو مانا مجبوری ٹھہری اور دور دراز ہوسٹلز میں رہنا بھی ایک مجبوری۔ ان لڑکیوں کو ہوسٹل میں جس طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس طرح کا ماحول ان جگہوں کا ہو چکا ہے وہ کسی سے بھی اب چھپا نہیں ہے۔

الامان والحفیظ اور شاباش ہے ان لڑکیوں پہ جو ایسے ماحول میں خود کو بچا کر تعلیم سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ اب یہ تو ہوا مجبوری کا سودا' مطلب جن کو تعلیم شہر میں میسر نہیں وہ گھروں سے دوری برداشت کرتی ہیں۔ مگر ان کا کیا کیجیے جن کے سڑک پار ہی بڑے بڑے تعلیمی ادارے اکیڈمیز سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ اب اصل بات یہ ہے کہ ماں باپ کی نظروں سے دور' دوسرے شہروں میں خود مختار انداز فکر اور رہن سہن کے ساتھ ڈگری کا حصول اسٹیٹس سمبل بن چکا ہے اور یہ ہی المیہ ہے۔ اب اگر میری قارئین بہنیں برا نہ مانیں تو ذرا دوسرے پہلو پہ بھی غور کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو اسلام میں اکیلے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی ہے؟ وہ بھی کسی نا محرم کے بغیر! پلیز! اس پہ کوئی مت سوچے۔

''قارئین! سیف یہ سب اب کہاں چلتا ہے' زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا اور محترمہ محرم' نامحرم کے چکر میں پڑنے لگی ہے۔'' کیونکہ میری پیاری بہنوں! اسلام اور شرع زمانے کے تغیر و تبدل سے بے پروا ہیں۔ تو جب عورت کو اکیلے گھر سے نکلنے کی ممانعت ہے تو کیا غیر مردوں کے ساتھ بلا حجاب پڑھنے کی اجازت ہو سکتی ہے؟ کیا وہ پڑھائی جائز ہو



کی جس میں علم ربی کی نفی ہو؟ کیا ایسی لڑکیوں کا حصول علم جہالت کے مترادف ہو گا جب سر برہنہ اور جسم نیم برہنہ ہو گا؟ میری فیملی میں جن لڑکیوں کو اس بات سے چڑ ہے کہ اب کو ایجوکیشن ہے تو کیا برقع اوڑھ لیں۔ تو میں اس کے جواب میں اپنی بھابھی کو آگے کر دیتی ہوں۔

یقین کیجیے اس لڑکی نے MBA میں پنجاب لیول پہ ٹاپ کیا۔ وہ تھرو آؤٹ حجاب لے کر تعلیم حاصل کرتی رہی ہیں۔ مانا کہ ایسی مثالیں کم نہیں مگر ہیں تو سہی نا۔ مگر کیا دوسروں کو دین کا شعور نہیں؟ کیا یہ سب صرف چند لوگوں کے سمجھنے کے لیے ہے۔ صرف [illegible] کی ہے۔ میری درخواست ہے لڑکیوں سے کہ اپنی تعلیم کو جائز بنائیے۔ رب کی تدبیر خفیہ ہوتی ہے اور اس خفیہ تدبیر سے مجھے' تمہیں' ہم سب کو ڈرنا چاہیے۔ جس کا شکار بہت سی لڑکیاں دوران تعلیم ہوتی ہیں۔

ان کی آزاد روش انہیں اس اندھے گڑھے تک لے جاتی ہے جس میں وہ ذلت اور غلاظت کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔ فی امان اللہ۔

### افشاں نور ۔۔۔ کراچی

''بول کے لب آزاد ہیں تیرے'' یہ سلسلہ شروع کر کے آپ نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ واقعی ہم آزاد ہیں اور آج ہر عام انسان کو بولنے کا حق حاصل ہے۔ میرا موضوع ہمارے معاشرے کی ایک بہت ہی اہم برائی ہے۔ جس کا تعلق ہمارے اپنے نفس سے ہے۔

اگر آج ہمارے معاشرے میں کوئی بچہ ضدی ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری اس کے بڑوں پر ڈال دی جاتی ہے۔ جو نوے فیصد درست بھی ہے لیکن اگر ہم بچوں کو بچپن ہی سے ان کی بے جا خواہش رد کر کے ان کے نفس پر قابو پانا سکھا دیں تو یقیناً' کوئی بچہ کل بڑا ہو کر اپنے نفس کا غلام نہ ہو بچوں کو بچپن ہی سے گناہ' ثواب کے بارے میں بتائیں ان کو مارنے کے بجائے اچھے' برے میں تمیز کرائیں اور اس طرح ان کو ان کے عمل کے بارے میں بتائیں کہ نہ صرف وہ اکیلے میں بلکہ سب کے سامنے بھی کوئی غلطی نہ کریں۔

ڈانٹنے یا مارنے سے بچے ماں' باپ کے سامنے (ڈر کی وجہ سے) وہ عمل نہیں کرتے لیکن اکیلے میں وہ کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ جس کے نتیجے میں بچے بڑے ہو کر دوسری [illegible] میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر افسوس آج اگر کوئی بچہ غلطی کرتا ہے تو ہم یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ بڑا ہو کر سمجھ جائے گا۔

یاد رکھیے بچپن کی عادت بڑے ہو کر اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے' چھوٹتی نہیں۔ اگر آج سے ہی ہم بچوں کو اچھے برے کی تمیز سکھا دیں تو ہمارے بچے اپنے نفس کے غلام ہونے سے بچ جائیں اور ہمارا معاشرہ پچاس فیصد برائیوں سے بچ جائے۔ اپنی بات کا اختتام میں اس خوب صورت شعر سے کروں گی کہ۔

انسان کی خواہش کی کوئی انتہا نہیں<br>
دو گز زمین چاہیے دو گز کفن کے بعد

### شمائلہ تاج ۔۔۔ خانپور

آج اس کالم میں' میں بات کرنا چاہوں گی اپنے ملک کے ریلوے نظام پر۔ بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ملک کا ریلوے کا نظام بہت خراب ہو چکا ہے۔ اتنی بدنظمی' اتنی بے ترتیبی اور غیر ذمہ داری ہے کہ حد نہیں۔ وقت کی پابندی تو گویا خواب ہو چکی ہے۔

دسمبر 2010ء میں مجھے اپنی فیملی کے ساتھ کراچی جانے کا اتفاق ہوا' جاتے جاتے سفر میں رات ہو گئی اور یقین کریں پوری ٹرین میں ایک بھی بلب یا ٹیوب لائٹ نہیں تھی' پوری ٹرین گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی' ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بھی نظر نہ آ رہے تھے۔ خیر جیسے تیسے کراچی تو ہم پہنچ ہی گئے مگر ریلوے والوں کی حد درجہ غیر ذمہ داری' لاپروائی کا اندازہ تو 30 دسمبر کو ہوا جب ہم کراچی سے بذریعہ ٹرین خانپور واپس آئے۔ 30 دسمبر کی صبح ہم لوگ تقریباً 6 بجے اپنے ماموں کے گھر سے چلے اور 8 یا ساڑھے آٹھ بجے ٹرین کراچی سے روانہ ہوئی۔ ہم خوش کہ ٹرین وقت پر چلی ہے اور ہم ٹائم سے خانپور پہنچ جائیں گے مگر ہماری خوشی عارضی ثابت ہوئی' وہ ایسے کہ کراچی کی حدود سے نکلتے ہی ٹرین اچانک رک گئی' کافی دیر بعد پتا چلا کہ ٹرین کا انجن فیل ہو چکا ہے' خیر جیسے تیسے نجانے کہاں سے انجن منگوایا۔ پھر ٹرین چل پڑی' کچھ دیر بعد ٹرین پھر سے رک گئی' پھر پتا چلا کہ جو انجن منگوایا تھا وہ

بھی حل ہو گیا ہے۔ دوسرا انجن خراب ہونے کے بعد تیسرا لایا گیا۔ مگر تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد تیسرا منگوایا جانے والا انجن بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا' کیونکہ وہ انجن انتہائی کمزور تھے یعنی وہ اتنی بڑی ٹرین کو لے کر نہیں چل سکتے تھے (یہ ٹرین میں سوار لوگوں کی رائے تھی) خیر پھر چوتھا انجن لگا اور ٹرین آہستہ آہستہ حیدر آباد پہنچی۔ وہ سفر جو کراچی سے حیدر آباد دو ڈھائی گھنٹوں کا ہے ہم نے نو گھنٹوں میں طے کیا۔ تمام مسافروں کا تھکن اور کوفت سے برا حال تھا شام کے تقریباً" چار بجے ہم حیدر آباد پہنچے تھے۔ جہاں انجن دوبارہ تبدیل کیا گیا یوں ٹرین چلی اور ہر اسٹیشن پر رکتی رہی' چلتی رہی اور حد تو یہ تھی کہ اتنی بڑی ٹرین میں صرف اور صرف ایک چھوٹی سی ٹیوب لائٹ تھی جو کہ ہماری خوش قسمتی کہہ لیں کہ جس بوگی میں ہم تھے وہیں پر تھی۔ خیر اللہ اللہ کر کے صبح کے چھ بجے ہم لوگ خانپور کے اسٹیشن پر پہنچے۔ یوں ہم نے بارہ گھنٹوں کا سفر بائیس گھنٹوں میں طے کیا۔

میری درخواست ہے پاکستان ـــ ریلوے والوں سے کہ پلیز کچھ تو خیال کریں ٹرینوں کے اوقات کار کا ——— پابندی وقت ——— مسافروں کی کوفت اور تھکن کا خیال کریں اور ایک اور بڑی بات کہ ٹرینوں میں لائٹ کا انتظام کریں۔ ٹرینوں میں لائٹ نہ ہونے سے ایک تو مسافروں کو پریشانی ہوتی ہے دوسرا یہ کہ ایسی صورت حال میں چور' ڈاکو با آسانی اپنا کام کر سکتے ہیں۔ اللہ اس ملک کا حامی و ناصر ہو۔

**عقیلہ عروج ـــ نامعلوم**

"کھول کہ لب آزاد ہیں تیرے" جب میں نے اس جملے کو پڑھا تو اس سلسلے کے مقصد کو سمجھتے ہوئے میں ایک دم سے بہت پرجوش ہو گئی تھی بہت سی باتیں بہت سے مسائل میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ جن کے سامنے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے میں کرن کی بے حد مشکور ہوں کہ جس نے آج مجھے لب کشائی کا موقع دیا ہے جس مسئلہ پر میں بات کرنے جا رہی ہوں وہ اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ مسئلہ ہے صبر و برداشت کی کمی جس کی وجہ سے آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے لیے عظیم نقصان کے مرتکب ہو رہے ہیں تحمل اور صبر کی برداشت کی کمی کی وجہ سے آج اگر کسی کو ذرا سی غلط بات یا ہار اور یہ برداشت کرنا پڑ جاتا ہے تو وہ اسے اپنے لیے ظلم عظیم تصور کرتے ہوئے خودکشی کا راستہ چنتا ہے۔

بے شک اللہ قادر مطلق ہے اور انسان کو بہت سے اختیارات دیے ہیں مگر ان اختیارات کا غلط استعمال کر کے وہ اپنی دنیا و آخرت تباہ کر لے یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ آج خودکشی کی بڑھتی ہوئی شرح کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ آج کی نسل اللہ کی رحمت اور اچھے وقت سے مایوس نظر آتی ہے اور آج خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھتے ہوئے اس امر کو سمجھنا مشکل نہیں کہ آج والدین اپنے بچوں کی بڑے غلط انداز سے پرورش کر رہے ہیں بچوں کو دی جانے والی بے جا آزادی ان کو دیا جانے والا بے جا لاڈ پیار انہیں والدین اور مذہب سے دور کر رہا ہے جس سے ان میں ایمان اور صبر و برداشت کی کمی واقع ہو رہی ہے۔ جس سے خودکشی کی شرح بڑھ رہی ہے۔

میری تمام ایسے والدین سے گزارش ہے جو اپنے بچوں سے دور ہیں کہ محض سوسائٹی اور فیشن کے نام پر اپنے بچوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑیں بلکہ ان پر نظر رکھیں اور ان کو مذہب اور اچھی عادات سے قریب تر کریں تاکہ خدا سے محبت اور تھوڑے سے صبر و برداشت کی بدولت وہ چھوٹی چھوٹی ناانصافیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت خود میں پیدا کریں جس سے معاشرے میں ایک اچھی روایت قائم ہو تاکہ خودکشی جیسا بزدلانہ عمل آخرت میں شرمندہ کر دینے والا عمل

☆ ☆





## کرن کرن خوشبو

### پروردگار

عربی کی ایک حکایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین گئے تو انہیں بخار نے آلیا اور اس کے بعد بھوک ستانے لگی۔ حضرت موسیٰ نے دعا کی۔

"اے میرے رب! میں مسافر ہوں' مریض بھی ہوں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" اللہ جل شانہ نے فرمایا۔

"اے موسیٰ! کیا تو جانتا ہے کہ غریب کون ہوتا ہے؟ مریض کون ہوتا ہے اور بغیر مال والا کون ہوتا ہے؟"

حضرت موسیٰ نے فرمایا۔

"اے رب! مجھے اس کا علم نہیں۔" اللہ نے فرمایا۔

"غریب وہ ہے۔ جس کا میری طرح کا حبیب نہ ہو اور مریض وہ ہے۔ جس کا میری طرح کا طبیب نہ ہو اور بغیر مال والا وہ ہے۔ جس کا میری طرح کا کارساز نہ ہو۔"

کرن عدنان ـــ کراچی

### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

○ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ کے اہل و عیال نے مسلسل دو دن بھی جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ (شمائل ترمذی)

(یعنی کھجوروں سے اگرچہ اس کی نوبت آ گئی ہو لیکن روٹی سے کبھی یہ نوبت نہیں آئی کہ مسلسل دو دن ملی ہو)

○ کبھی کبھی گیہوں کی روٹی بھی تناول فرمائی ہے۔ (خصائل نبوی)

○ سہل بن سعد رضی اللہ سے کسی نے پوچھا کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی سفید میدہ کی روٹی بھی کھائی ہے۔" انہوں نے جواب دیا کہ "آپ کے سامنے آخر عمر تک میدہ آیا بھی نہ ہو گا۔" (بخاری شمائل ترمذی)

○ حضرت انس رضی اللہ سے روایت ہے کہ "حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میز پر کھانا تناول نہیں فرمایا۔ نہ چھوٹی طشتریوں میں کھایا نہ آپ کے لیے کبھی چپاتی پکائی گئی۔ آپ کھانا چمڑے کے دستر خوان پر تناول فرماتے تھے۔" (شمائل ترمذی)

انجم ناز ـــ لاہور

### ماں کا مقام

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ جلیل القدر پیغمبر تھے جن کو خدائے بزرگ و برتر نے پیغمبری اور کلام کے لیے منتخب فرمایا اور معجزات عطا کیے۔ جب آپ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے کلام کے لیے جاتے تو ان کی سلامتی کی دعا ان کی ماں کے مقدس لبوں پر ہوتی۔ والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد جب آپ ایک مرتبہ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے جا رہے تھے تو غیب سے آواز آئی۔

"اے موسیٰ! سنبھل کے اب تمہارے لیے دعا کرنے والے لب خاموش ہیں۔"

فوزیہ ثمر بٹ ـــ گجرات

### باتوں سے خوشبو آئے

○ اپنا ادب کروانے کے لیے دوسروں کا ادب کرو تمہارا احترام خود بخود کیا جائے گا۔

○ کسی کا راز تلاش نہ کرو اگر معلوم ہو جائے۔ تو فاش نہ کرو۔

○ دین پر عمل تبھی ہو سکتا ہے جب دل میں سلف

صالحین کی محبت اور عظمت ہو۔

○ معاف کرنا سب سے زیادہ اسے زیب دیتا ہے۔ جو سزا دینے پر قادر ہو۔

○ تھوڑا دینے پر مت شرماؤ کیونکہ خالی ہاتھ لوٹانا اس سے بھی گری ہوئی بات ہے۔

○ جب عقل بڑھتی ہے تو باتیں کم ہو جاتی ہیں۔

میرا عبدالغنی بٹ در بخف۔۔۔ لودھرے

## کرنیں

☆ دنیا کوئی ایسی بری جگہ بھی نہیں 'ابھی پھول کھلنے بند نہیں ہوئے' صبح پورے بل سے ہوتی ہے اور روز سورج پورے یقین سے طلوع ہوتا ہے۔ خزاں آتی ہے اور رکے بنا چلی جاتی ہے کہ بہار نے آنا اور ٹھہرنا ہوتا ہے۔

☆ بنانے والے نے لوگوں کو ستار کے تاروں جیسا بنایا ہے۔ بس آپ کو اتنا پتا ہونا چاہیے کہ کون سی تار کو چھیڑنا ہے پھر وہی آواز نکلے گی اور وہی دھن بجے گی جو آپ بجانا چاہیں گے۔

☆ مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں۔

ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے۔ جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ فائل 'کتاب' نہیں رہتی بلکہ انسائیکلو پیڈیا بن جاتی ہے۔

ایک فائل خطوط 'کارڈز' فون نمبرز کی بھی ہوتی ہے۔ اسے بھی کبھی کبھار دیکھنا چاہیے۔ جو بھول گئے ہوں انہیں یاد کر لینا چاہیے۔

شفق افتخار۔۔۔ سکھر

## سلطنت کی قیمت

ایک مرتبہ ہارون الرشید عباسی نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ مجلس میں اس وقت مشہور عالم' زاہد ابن سماک بھی موجود تھے۔ پانی آگیا اور ہارون الرشید پینے ہی کو تھا کہ ابن سماک نے کہا۔

"ذرا ٹھہر جایئے اگر آپ سے یہ پانی روک لیا جائے تو اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کیا خرچ کر سکیں گے۔" ہارون نے جواب دیا۔

"پیاس کو بجھانے کے لیے اگر ایک پیالہ نصف سلطنت کے عوض بھی ملے تو میں یہ قیمت دینے کو تیار ہوں۔" پھر جب ہارون نے پانی پی لیا تو ابن سماک بولے۔

"امیر المومنین! اگر یہ پانی جو آپ نے پیا ہے جسم کے اندر رک جائے اور باہر خارج نہ ہو سکے تو اسے نکلوانے کے لیے آپ کیا خرچ کر سکیں گے؟" ہارون نے کہا کہ "ایسی صورت میں ساری سلطنت دے ڈالوں گا۔"

ابن سماک نے فرمایا۔

"یہ ساری سلطنت جو ایک چلو بھر پانی کے عوض دی جا سکتی ہے۔ اس پر اتنا اترانا اور غرور و تکبر میں انجام کو بھول جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ خدا کا خوف کیجیے اور اس کی مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کو ہرگز فراموش نہ کیجیے۔" ہارون الرشید پر اس نصیحت کا بہت اثر ہوا اور وہ دیر تک گردن جھکائے روتے رہے۔

ریحانہ علی احمد۔۔۔ کراچی

## بہترین جواب

شیطان نے ایک بار فرعون کے دروازے پر دستک دی فرعون نے پوچھا۔

"کون؟" شیطان نے کہا۔

"لعنت ہو تجھ پر 'دعوائے خدائی کا کرتے ہو اور معلوم نہیں دروازے پر کون ہے۔"

زینب احسن زئی۔۔۔ فیصل آباد

## دیکھوں گا

اپنا آپ تماشا کر کے دیکھوں گا<br>
خود کو اس سے تنہا کر کے دیکھوں گا<br>
کب بچھڑا تھا کون سی گھڑی تھی یاد نہیں<br>
لمحہ لمحہ یکجا کر کے دیکھوں گا<br>
وعدہ کر کے لوگ بھلا کیوں دیتے ہیں<br>
اب کے میں بھی ایسا کر کے دیکھوں گا

تسنیم چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یوکے



## فرمودات کلام

☆ احترام اگر بے لوث کیا جائے تو زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔

☆ تغیر اس کائنات کا بنیادی اصول ہے۔

☆ شرافت سے جھکا ہوا سر ندامت سے جھکے ہوئے سر سے بہتر ہے۔

☆ اگر تم کسی کا بھلا کر رہے ہو تو یقین کرو کہ تم اپنا بھلا کر رہے ہو۔

☆ باتیں گھڑنے کے فن کو ادب کہتے ہیں۔

☆ باتونی شخص کم گو شخص کی نسبت جلدی مصائب کا شکار ہوتا ہے۔

☆ ارتکاز کے حصول کا بہترین طریقہ عبادت ہے۔

☆ الفاظ اظہار کا سب سے ستا ذریعہ ہیں۔

☆ بات اپنے اثر کے اعتبار سے چھوٹی یا بڑی ہوتی ہے۔

☆ شر کے خطاب سے پکارے جانے والے شخص کی ہر بات دہشت پہلو ہوتی ہے۔

☆ ذہانت' معاملہ فہمی کا دوسرا نام ہے۔

☆ ساتھ دینا بھی اپنائیت کا ایک اظہار ہے۔

☆ تکرار گفتگو کے حسن کو گہنا دیتی ہے۔

☆ کسی چیز پر ڈالی گئی ایک نگاہ آپ کی مجموعی سوچ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

☆ نگاہ کا زاویہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔

☆ عقلمندوں کے لیے دنیا نہایت وسیع جگہ بے وقوفوں کے لیے دنیا نہایت مختصر ہوتی ہے۔

☆ انسان کو لفظ نہیں رویے مارتے ہیں۔

☆ تھکن کا احساس منزل پر پہنچ کر ہی پوری طرح جاگتا ہے۔

☆ کسی کو بے وقوف بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی تعریف کر دی جائے۔

☆ کسی کام کو نامکمل چھوڑنا انسانی فطرت نہیں حتی کہ وہ اپنی حسرتوں کو اپنی اولاد کے راستے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ارم نیازی۔۔۔ کراچی

## بچھڑ گیا

شاخ سے ہاتھ چھڑا کر<br>
ہوا کی بات میں آکر<br>
بارش کے میلے میں گیا<br>
اور اپنے آپ سے بچھڑ گیا

(پروین شاکر)

نبت سنعیہ۔۔۔ کروڑ پکا

## مصرع مکمل کرنا

ایک زمین دار جو شاعر بھی تھا اپنے مزارع کے ساتھ کھیتوں میں جا رہا تھا۔ وہ مزارع سے پوچھنے لگا۔

"کیا تمہیں شاعری سے رغبت ہے؟"

مزارع نے کہا۔ "ہاں جناب۔"

اس پر زمین دار نے کہا۔

"ایک مصرع میرے ذہن میں ہے لیکن جب تک دوسرا مصرع ذہن میں نہیں آتا سناؤں گا نہیں۔"

مزارع بولا۔

"جناب! آپ پہلا مصرع سنا دیں' ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔" زمین دار نے کہا۔

"میں دل بیچتا ہوں' میں جاں بیچتا ہوں' میں سارا جہاں بیچتا ہوں۔" مزارع نے اسی وقت مصرع مکمل کر دیا۔

"میں منج بیچتا ہوں' میں گاں بیچتا ہوں' میں وڑے کی ساری تھاں بیچتا ہوں۔"

ثریا شاہ۔۔۔ کروڑ پکا

## سنو

کیسے زندہ ہیں ان سازشوں کے موسم میں<br>
اب کوئی خواب نہیں خوابوں کے موسم میں<br>
اسے مجھ سے محبت تھی اس طرح کی جیسے<br>
ہلکی سی دھوپ ہو بارشوں کے موسم میں

سور تھ سانمہ۔۔۔ روحل والی گاؤں

☆ ☆

**امبرہ کی ڈائری میں تحریر**
داغ دہلوی کی غزل

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشک بار کیا
تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا

تڑپ پھر اے دلِ ناداں کہ غیر کہتے ہیں
اخیر کچھ نہ بنی، صبر اختیار کیا

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا

فسانۂ شبِ غم اُن کی اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا، کچھ نہ اعتبار کیا

بنے گا مہر قیامت ایک خالِ سیاہ
جو چہرہ داغِ سیہ رُو نے آشکار کیا

---

**سورٹھ ساندہ کی ڈائری میں تحریر**
منیر نیازی کی ایک نظم

کھیل دُھوپ چھاؤں کا
صحنِ صبحِ نو میں ہے
وہ قدیم راستے
شہرِ دہ خیال کے
عکسِ حسن کا وجود ہے
تھا سفر میں پارسا
اُن کی ایک جھلک بھی ہے
سامنے کی دید میں
آج کے اقرار میں
آنے والے دور کے
خوشنما خمار میں

ان کی اک جھلک بھی ہے
چاہتوں کے سال میں
تجلہ وصال سی
آج کی بہار میں

---

**نورالایمان احمد کی ڈائری میں تحریر**
امجد اسلام امجد کی غزل

کہنے کو میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں
امجد مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

آشفتگی سے اُس کی اسے بے وفا نہ جان
عادت کی بات اور ہے دل کا بُرا نہیں

تنہا اُداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر
ہر بات سن رہا ہے مگر بولتا نہیں

خاموش ریت جنگل کا دُھواں تا چار سُو
نکلا کب آفتاب، مجھے تو پتا نہیں

امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
اُن میں کوئی بھی عکس میرے نام کا نہیں

---

**نزہت جبیں ضیاء کی ڈائری میں تحریر**
پروین شاکر کی نظم

چلو اس خواب کو ہم ترک کر دیں
اور آنکھوں کو یہ سمجھا دیں
کہ ہر تصویر میں ہلکا گلابی رنگ چاہنے سے نہیں
آتا



بہت سے نقش نقاشِ ازل ایسے بناتا ہے
کہ جن کا حاشیہ گہرا ہے
اور نقش ہلکا سرمئی رہتا ہے
اور جن پر کسی بھی زاویے سے چاند اُترے
یہ کبھی روشن نہیں ہوتے
خدا کچھ کام آدھی رات کو کرتا ہے
جب اس کے پہلے میں
سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا
نہ خاک بھی
کسی ایسی ہی ساعت میں بنا ہوگا
ہماری آنکھ میں جو خواب اُترا تھا
بہت خوش رنگ لگتا تھا
مگر اس کے دھکنے میں
کئی آنکھیں لہو ہوئیں
کتابوں اور پھولوں سے سجے جس گھر کے آنگن میں
ہم اپنے آپ کو کھلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں
وہاں اک اور گھر بنیاد سے یوں سر اُٹھاتا ہے
کہ ہم اندر سے ہل جاتے
مگر چپ چاپ رہتے تھے
یہ چپ دیمک کی صورت ہم کو اک دن چاٹ جاتی
تمہارے دُکھ سے میں واقف ہوں
اور اپنے مقدر کی لکیروں کی بھی محرم ہوں
ہمارے بس میں رنگوں کا چناؤ ہے
نہ خط کا
سو اس تصویر کو تحلیل کر دیں
ہم اپنا کینوس تبدیل کر دیں

---

**سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری میں تحریر**
محسن نقوی کی غزل

دشتِ ہجراں میں سایہ نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں ترے آبلہ پا تیرے بعد

لب پہ اک حرفِ طلب تھا، نہ رہا تیرے بعد
دل میں تاثیر کی خواہش، نہ دُعا تیرے بعد

درد بیتے میں ہوا فرد میرا تیرے بعد
دل کی دھڑکن ہے کہ ماتم کی صدا تیرے بعد

تجھ سے بچھڑا ہوں تو مرجھا کے ہوا زرد ہوا
کون دیتا ہے مجھے کھلنے کی دُعا تیرے بعد

ملنے والے کی منہوم نہیں کر کے
کوئی چہرہ بھی نہ آنکھوں نے پڑھا تیرے بعد

جان محسن مرا حاصل یہی مبہم سطریں
شعر کہنے کا ہنر بھول گیا تیرے بعد

---

**مشعال جنید کی ڈائری میں تحریر**
خالد معین کی نظم

**چلو یوں ہی سہی**

چلو یوں ہی سہی
ترکِ تعلق کر لیا تم نے
وگرنہ میں تمہارے ساتھ
کتنی دُور تک چلتا
تم اک موجِ صبا رفتار
میں اک آبلہ پا تھا
کتنے بادل تمہارے ساتھ تھے
اور تشنگی میرا مقدر تھی
تمہیں اب اس سے کیا
میں دشتِ جاں میں
وحشتوں کے درمیاں
پھر کتنا تنہا ہوں
تم اپنے حلقۂ احباب میں خوش ہو
سو خوش ہی رہنا
مگر میں ڈرتا رہتا ہوں
کہ زخمِ شناسائی کی کسک
تم تک نہ جا پہنچے

شگفتہ سلیمان

مسز سید یوسف رضا ________ فاضل پور
مجھے چھوڑ دے میرے حال پر تیرا کیا بھروسا ہے چارہ گر
یہ تیری نوازشیں مختصر میرا درد اور بڑھا دیں

سورٹھ سانمد ________ روحل والی کالونی
میرے موسم گزر گئے اور یار اب آئے
دکھوں نے چاٹ لیا ہیں اور غم کھلا اب آئے
یہ وقت تو اب رونے کا نہیں ہے لیکن
میں کیا کروں میرے سوگوار اب آئے

صائمہ ادریس ________ لاہور
آسیب زدہ گھر کا میں وہ دروازہ ہوں محسن
دیمک کی طرح کھا گئی جسے دستک کی تمنا
میرے ہاتھوں کی لکیر دل میں یہ عجیب بھید چھپا
میں جس شخص کو چھو لوں وہ مرا نہیں رہتا

نواب زادی سولنگی ________ مورو سندھ
نہیں ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں

ندا، مدیحہ ________ کراچی
بلکتے رہنے سے بھی کبھی رکتے ہیں بہتے آنسو
عمر بھر ہوگی یہ برسات چلو سو جائیں

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات
دل میں تھی ویرانی ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم، موسم کتنا پیارا ہے
باتوں باتوں میں آ ذرا اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر دنیا کا ہر دکھ ہمیں گوارا ہے

نادیہ ________ گجرات
کئی زمانے میں اپنی کڑی شکست کے بعد
خود اپنے ٹوٹے ہوئے بازوؤں میں قید رہا
وہ ایک چہرہ جو آنکھوں میں آ بسا تھا کبھی
تمام عمر مرے آنسوؤں میں قید رہا

شمیم صدر الدین رحمانی ________ صفدر آباد
بہار کیا ہے ہم تو چراغ شب کی طرح
اگر جلے بھی تو بس اتنی روشنی ہوگی
کہ جیسے تند اندھیروں کی راہ میں جگنو
ذرا سی دیر کو چمکے، چمک کے کھو جائے

کرن شفیق ________ فیصل آباد
آج کی صبح سر وصال کے آئینے میں
پھر ترے خون کی پوشاک پہن کر آئی
پھر دل ویراں میں ترے قرب کا موسم اترا
پھر ترے درد کی سوغات میسر آئی

بینش ________ کراچی
محسن جب بھی چوٹ نئی کھا لیتا ہوں
دل کو یاد آ گئے ہیں یار پرانے کیوں

صائمہ جبی ________ کراچی
جو ہو سکے تو گریباں کے چاک سی لینا
وگرنہ تم بھی ہماری طرح سے جی لینا

خدیجہ سلیم ________ کے، ڈی، اے
اُس کی نفرت بھی محبت ہوگی
میرے بارے میں وہ سوچے تو سہی
اُس کے قدموں میں بچھا دوں آنکھیں
میری بستی سے وہ گزرے تو سہی

صائمہ سندھو ________ گوجرہ
وہ جنگل کے پھولوں پر کیوں مرتا ہے
اُس کو اچھے لگتے ہیں ویرانے کیوں

عظمیٰ غلام نبی ________ کراچی
ہمارے گھر پہ گری بجلیوں کو کیا خبر محسن
کہ اس ملبے پہ اک تازہ نگر تعمیر ہونا ہے

سدرہ ودیہ ________ خوشاب
غموں سے یاری بھی ہمت بحال رکھتے تھے
ذرا ذرا سی کسک دل میں سنبھال رکھتے تھے
عجیب طرز کے ندرت پسند تھے ہم بھی
خوشی خوشی میں کوئی غم بھی پال رکھتے تھے

تحریم عائشہ ________ کراچی
جس کے لیے توڑ دیں ساری حدیں
آج اسی نے کہا اپنی حد میں رہو

نامرہ بتول ________ خوشاب
بارش کی طلب ہے تو سمندر کی طرف جا
یہ ابر تو صحراؤں میں برسا نہیں کرتے
پچھتاوے سے بڑھ کر کوئی آزار نہیں ہے
جب دل لگاتے ہیں تو دریا نہیں کرتے

سیدہ قیصرت گیلانی ________ کہروڑ پکا
اک ہجر تھا جس میں بتا دی تمام عمر
اک پل تھا ہم نے جس کو زمانہ بنا دیا
اس درجہ صبر کر لیا کہ سے بھی یقیں نہ تھا
اس نے ریاضتوں کو بھی طعنہ بنا دیا

گڑیا شاہ ________ کہروڑ پکا
غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا
کسی کتاب کا ممکن نہیں یکجا ہونا
جو برائی تھی، مرے نام سے منسوب ہوئی
دوستو! کتنا برا تھا، مرا اچھا ہونا

سائرہ پروا کرن ________ کوٹ چھٹہ
رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے
کتنی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

زینب صدیقی ________ کوٹ چھٹہ
بچھڑے ٹوٹے ہوئے پتوں کا سہارا لے کر
وحشت دل کسی جگنو سے ادھار لے کر
وسعت دنیا میں امیدوں کا کنارہ لے کر
میں تمہیں یاد کروں، اک عمر دوبارہ لے کر

ثمینہ زبیدہ ________ کراچی
آئی تھی کبھی میرے لفظوں میں روشنی
اور مجھ سے یہ کمال تجھے دیکھ کر ہوا
پھر آ گئے میرا حامی کرید نے
پھر مجھ سے اک سوال تجھے دیکھ کر ہوا

امبر وسیم ________ لاہور
جن کو پینے کا سلیقہ ہے وہ پیاسے ہیں قتیل
جتنے کم ظرف تھے اس دور میں مے خوار ہوئے

مریم سعدیہ ________ کراچی
میں اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پہ بیٹھا ہوں
مجھے مہلت خدا کی ہے کبھی ملنے چلے آؤ

تنزیلہ چوہدری ________ آکسفورڈ لیگ
خوبصورت ہیں آنکھیں تیری
رات کو جاگنا چھوڑ دے
خود بخود نیند آ جائے گی
تو مجھے سوچنا چھوڑ دے

فرزانہ احمد ________ کراچی
کچھ روز سے زنداں نظر آتی ہے یہ دنیا
اب کچھ تو یہاں اہل نظر ہو کے رہے گا
انسان سمٹتا ہی چلا جائے کہاں تک
لگتا ہے کہ دیوار میں در ہو کے رہے گا

صبا احمد ________ کراچی
الزام کچھ تو گردش ایام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو نہ بازار مت بنا
ہر ایک کے لیے نہ کھلا رکھ اسے قتیل
یہ دل ہے ایک گھر اسے بازار مت بنا

الماس ________ کراچی
تھی ایسی بے خودی کہ جب آیا وہ سامنے
مفہوم گر گیا مرے دست سوال سے

راشدہ ________ اسلام آباد
ایسا نہیں کہ غم نے بڑھا لی ہو اپنی عمر
موسم خوشی کا وقت سے پہلے گزر گیا
لکھنا مرے مزار کے کتبے پہ یہ حروف
مرحوم زندگی کی حراست میں مر گیا

رابعہ یاسمین ________ کراچی
شاید میں کچھ اور بھی تیرا ساتھ دے سکوں
اے زندگی کبھی تو پلٹ کر مجھے پکار

نشا نورین ________ جھنڈا ہولا سنگھ
آج بھی دیکھ لیا اس نے کہ میں زندہ ہوں
چھوڑ آیا ہوں اسے آج بھی حیرانی میں

زینت احسن زینی ________ منصورہ آباد
آ کے کہو کہوں حاضر مزید دکھ دے لے
بہت سکون ملا ہے اگر ستا کے مجھے

☆ ☆

# کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

## انڈوں کے کباب

**اجزا :**

| | |
|---|---|
| انڈے | چار عدد |
| قیمہ | 250 گرام |
| آئل | حسبِ ضرورت |
| کالا زیرہ | آدھا چائے کا چمچہ |
| لونگ | چار عدد |
| بڑی الائچی | ایک عدد |
| نمک | حسبِ ذائقہ |
| ہری مرچ | دو عدد |
| پسی ہوئی کالی مرچیں | آدھا چائے کا چمچہ |

**ترکیب :**

انڈوں کو خوب اچھی طرح ابال کر چھلکے اتار لیں اور انڈوں کو الگ رکھ دیں۔ تمام مسالا جات کو پیس کر باریک کرکے ملائیں۔ پھر قیمے میں ملا کر سل پر سب اجزا باریک پیس کر مکس کر لیں۔ اب اس آمیزے ابلے ہوئے انڈوں کے گرد ہاتھ سے دبا کر لگائیں پھر ایک گہرے فرائی پین میں کوکنگ آئل ڈال کر گرم کریں۔

قیمے والے انڈے کے گرد دھاگہ لپیٹ کر تل لیں سرخ ہونے پر باہر نکال لیں اور دھاگہ اتار کر پلیٹ میں ڈال کر کھانے کے لیے پیش کریں۔

## پیازی کباب

**اجزا :**

| | |
|---|---|
| قیمہ | آدھا کلو |
| ادرک | ایک چائے کا چمچہ |
| لہسن | ایک چائے کا چمچہ |
| نمک | چوتھائی چائے کا چمچہ |
| سرخ مرچ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| گرم مسالا | چوتھائی چائے کا چمچہ |
| بیسن | ایک کھانے کا چمچہ |
| تیل | آدھا کپ |
| پیاز | تین عدد (قتلوں میں کٹی ہوئی) |
| ٹماٹر | دو عدد |
| سبز مرچیں | دو عدد |
| دھنیا کے پتے | حسبِ ضرورت |

**ترکیب :**

قیمہ میں ادرک، لہسن، نمک، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مسالا اور بیسن اچھی طرح ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر اس قیمے کے بیضوی شکل کے کباب بنا لیں۔ تیل گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر سنہری مائل تل لیں پھر اس میں ٹماٹر ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں اب اس میں کباب ڈال کر بغیر ڈھکے اتنا پکائیں کہ کبابوں کا پانی خشک ہو جائے جب پانی خشک ہو جائے تو سبز دھنیا اور ہری مرچیں چھڑک کر پیش کریں۔

## مسالا بھری بھنڈیاں

**اجزا :**

| | |
|---|---|
| بھنڈیاں | آدھا کلو |
| دھنیا (ثابت) | ایک چائے کا چمچہ |
| زیرہ (ثابت) | دو چائے کا چمچہ |
| سونف (ثابت) | ایک چائے کا چمچہ |
| رائی (ثابت) | ایک چائے کا چمچہ |
| تیل | آدھا کپ |
| ادرک | آدھا چائے کا چمچہ |
| لہسن | چوتھائی چائے کا چمچہ |
| سرخ مرچ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| ہلدی | چوتھائی چائے کا چمچہ |
| کڑی پتا | چند عدد |
| املی کا رس | ایک کھانے کا چمچہ |
| نمک | حسبِ ضرورت |

بھنڈی کو بیچ میں سے اس طرح کاٹیں کہ دونوں ٹکڑے آپس میں جڑے رہیں۔ اب دھنیا، زیرہ، سونف اور رائی کو بھون کر پیس لیں یہ مسالا بھنڈی میں بھر دیں۔ اس کے بعد ایک دیگچی میں گھی گرم کریں۔ اس میں لہسن، ادرک، سرخ مرچ پاؤڈر، نمک، ہلدی اور کڑی پتا ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے راس میں مسالا بھری بھنڈیاں ڈال دیں۔ ساتھ ہی املی کا عرق بھی شامل کر دیں۔ ڈھک کر دم پر رکھ دیں اور بھنڈیاں گلنے تک پکائیں کر گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ سرو کریں۔

## بنارسی آلو

**اجزا :**

| | |
|---|---|
| آلو (ابلے ہوئے) | 600 گرام (چوکور ٹکڑوں میں) |
| املی کا پیسٹ | دو چائے کے چمچے |
| ٹماٹر کا پیسٹ | دو چائے کے چمچے |
| سونف | ایک چائے کا چمچہ |
| لال مرچ پاؤڈر | ایک کھانے کا چمچہ |
| ہلدی | ایک چائے کا چمچہ |
| گرم مسالا | ایک چائے کا چمچہ |
| کریم | چار کھانے کے چمچے |
| نمک | حسبِ ذائقہ |
| ہرا دھنیا (کترا ہوا) | چار کھانے کے چمچے |
| کوکنگ آئل | تین کھانے کے چمچے |

**ترکیب :**

کڑاہی میں آئل ڈال کر گرم کریں۔ پھر اس میں سونف ڈال دیں۔ جب اس کا رنگ تبدیل ہو جائے تو آلو شامل کر لیں۔ چند لمحے بعد اس میں املی کا پیسٹ، ٹماٹر کا پیسٹ، خشک مسالے پیس کر اور نمک بھی ڈال دیں اور اچھی طرح ملا لیں تاکہ مسالا آلوؤں پر اچھی طرح لگ جائے۔ پانچ منٹ تک پکانے کے بعد کریم اور ہرا دھنیا ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

## قیمہ میتھی پنیر کے ساتھ

**اجزا :**

| | |
|---|---|
| قیمہ | آدھا کلو |
| میتھی کا ساگ | ایک کلو |
| ادرک لہسن (پیسٹ) | ڈیڑھ چائے کا چمچہ |
| ہلدی | آدھا چمچہ |
| ٹماٹر | ڈیڑھ پاؤ |
| نمک | ایک چائے کا چمچہ |
| پسی لال مرچ | ایک چائے کا چمچہ |
| ثابت لال مرچ | چھ عدد |
| پیاز (بڑی) | ایک عدد |
| پنیر (کش کیا ہوا) | ایک کپ |
| ہری مرچ (کتری ہوئی) | پانچ عدد |
| ہرا دھنیا (گارنشنگ کے لیے) | تھوڑا سا |
| آئل | حسبِ ضرورت |

**ترکیب :**

ایک دیگچی میں آئل ڈال کر گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر ہلکی سنہری کر لیں۔ اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر بھونیں اور پھر ٹماٹر، ہلدی، نمک اور پسی ہوئی لال مرچ کے علاوہ ثابت مرچ ڈال کر پانچ منٹ تک مزید بھونیں۔ مسالا بھون جائے اور خوشبو آنے لگے تو اس میں قیمہ ڈال کر ایک کپ پانی ملائیں اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔ قیمہ گلنے پر پانی خشک کرتے ہوئے اسے اچھی طرح بھونیں۔ باریک کٹی ہوئی میتھی اچھی طرح دھو کر قیمے میں شامل کر دیں اور دھیمی آنچ پر دس سے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ میتھی گل جانے پر اس میں پنیر مکس کر دیں اور ہری مرچیں ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔ مزے دار قیمہ میتھی پنیر کے ساتھ تیار ہے۔

# حسن و صحت

ادارہ

تمام ماہرین حسن نے اب تسلیم کیا ہے کہ کلینزر، ٹونرز اور دیگر حسن میں اضافے کے لیے بنائی گئی بیوٹی پروڈکٹس کے بجائے قدرت کے فراہم کردہ نباتاتی اور غذائی اجزا میں حسن اور جلد کی حفاظت اور صحت کے لیے بے شمار مفید عناصر موجود ہیں مثلاً" وٹامن A وٹامن E ضروری فیٹی ایسڈ اور فلیونوآئیڈز (Flavonoids) وغیرہ جو کہ تمام عام غذائی اجزا میں پائے جاتے ہیں جلد کے لیے اکسیر کا کام انجام دیتے ہیں مثلاً "سبزیاں" دودھ پھل' نٹس اور بیج وغیرہ خاص طور پر ہمارے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔ ان ہی قدرتی اجزا کو اعلا ترین کاسمیٹکس میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد کی حقیقی ستھرائی' از سرنو بحالی' مردہ خلیات سے نجات اور تازہ حسن افزا خلیات کی نشوونما ان قدرتی اجزا سے بہتر لیبارٹری میں تیار شدہ پروڈکٹس نہیں کر سکتی ہیں۔

○ مثال کے طور پر لیموں ایک بہترین اسٹرینجنٹ ہے جو مانع تکسید وٹامنز اور فوٹو کیمیکل پر مشتمل ہوتا ہے جس سے جلد کی ٹوٹ پھوٹ سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے اور جلد' گرد و غبار' سگریٹ کے دھویں' الٹروائلٹ ریز (سورج کی نیم بنفشی شعاعوں) وغیرہ سے ہونے والے نقصان سے محفوظ رہتی ہے اور اگر یہ نقصان ہو بھی چکا ہو تو لیموں کا استعمال جلد کو دوبارہ سے نئی چمک دمک اور تازگی بخشتا ہے۔

○ گاجر کا رس نا صرف جلد کو نئی تروتازگی عطا کرتا ہے بلکہ ایگزیما اور کیل مہاسوں سے نجات کے سلسلے میں بھی معاونت کرتا ہے۔

○ انگور کا رس کٹی پھٹی جلد کی مرمت کرتا ہے اور سوزش اور جلن پیدا کرنے والے جلدی مسائل میں ٹھنڈک اور تازگی پہنچاتا ہے۔

○ کھیرے جلد سے اضافی چکنائی کو جذب کرتے ہیں اور ان میں شامل اجزا جلد کی خارش' کھجلی اور جلن وغیرہ سے نجات دلا کر جلد کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔

○ کھیرے کا رس آنکھوں کو حسن بخشتا ہے اور حلقوں' پپوٹوں کی سوجن اور آنکھوں کی تھکن دور کر کے آنکھوں کو چمک دمک عطا کرتا ہے۔

○ قدرتی اور ہربل اجزا کا ایک بہترین فائدہ یہ ہے کہ آپ کی جلد کی قسم اور مسائل یا رنگت جو بھی ہو مثلاً" خشک یا چکنی' جواں یا پختہ' گوری یا سانولی حساس یا مسائل کا شکار یہ قدرتی اجزا ان تمام اقسام کی جلد کی صفائی ———— رنگت میں نکھار' تازگی اور چمک دمک کی فراہمی کا کام نہایت سہل اور بہترین انداز سے سرانجام دیتے ہیں۔

## دودھ اور ٹماٹر کا کلینزر (نارمل اور چکنی جلد کے لیے)

ٹماٹر وٹامن C' B' A اور معدنیات مثلاً" پوٹاشیم میگنیشیم وغیرہ کا خزانہ ہوتے ہیں اور ایک منفرد فوٹو کیمیکل جسے لائیکوپین کہتے ہیں ان میں شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری تیار ہونے والی اس ترکیب میں اعلا درجے کی حسن بخش غیر ضرر رساں تیزابی خصوصیات والے اجزا شامل ہیں جو جلد کی صفائی کو بہترین طریقے سے سرانجام دیتے ہیں۔ اس میں دودھ میں شامل لیکٹک ایسڈ اور ٹماٹر میں شامل فروٹ ایسڈ کا امتزاج موجود ہے جو اس کلینزر کو ایک بہترین صفائی کرنے والا عمل ثابت کرے گا۔ مفید پہلو یہ ہے کہ یہ جلد پر نہایت نرمی سے عمل کرتا ہے۔ یہ نارمل اور چکنی جلد کے لیے بہترین ہے۔

**اجزا :**



| | |
|---|---|
| ٹماٹر (کٹا ہوا) | ایک عدد |
| دودھ (تازہ) | 150 ملی لیٹر |
| پانی | حسب ضرورت |

ٹماٹر کو بلینڈ کر کے چھان لیں۔ چھانے ہوئے رس میں برابر مقدار میں دودھ ملائیں۔ اب اس چہرے اور گردن پر لگائیں دس منٹ بعد حسب ضرورت پانی سے چہرہ اچھی طرح دھولیں۔

## خشک اور جھریوں والی جلد کے لیے

جلد کی تازگی اور جوان عمری لوٹانے کے لیے یہ ماسک بہترین ہے۔

| | |
|---|---|
| دودھ کی بالائی | ایک کھانے کا چمچ |
| روغن گلاب | دو قطرے |

کریم (بالائی) اور روغن گلاب کو ملا کر آنکھوں سمیت چہرے اور گردن پر لگائیں ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھولیں یا ایک تولیہ کو نیم گرم پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں اور اس سے چہرہ صاف کریں پھر موئسچرائزر لگالیں۔

## ہربل کلینزر (ہر قسم کی جلد کے لیے)

یہ کلینزر چہرے پر پھیلی اضافی چکنائی کو جذب کرتا ہے۔ میک اپ اور گرد و غبار کو جلد سے بہترین طور پر صاف کرتا ہے جلد کے لیے ضروری روغنیات کی فراہمی یقینی بناتا ہے اور جلد میں موجود قدرتی روغنی مادوں کی حفاظت کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| جو کا آٹا | 40 گرام |
| سورج مکھی کے بیج | 30 گرام (باریک پسے ہوئے) |
| بادام (باریک پسے ہوئے) | 35 گرام |
| گلاب کی پتیاں | ایک چائے کا چمچ |
| دار چینی پاؤڈر | ایک چٹکی |
| دودھ یا بالائی یا پانی | حسب ضرورت |

ایک پیالے میں تمام اجزا کو مکس کریں پھر پانی (چکنی جلد کے لیے) یا دودھ (نارمل جلد کے لیے) یا بالائی (خشک جلد کے لیے) اپنی جلد کی مطابقت سے ملا کر گاڑھا پیسٹ بنا کر اپنے چہرے اور جسم پر لگائیں بیس منٹ بعد دھولیں۔
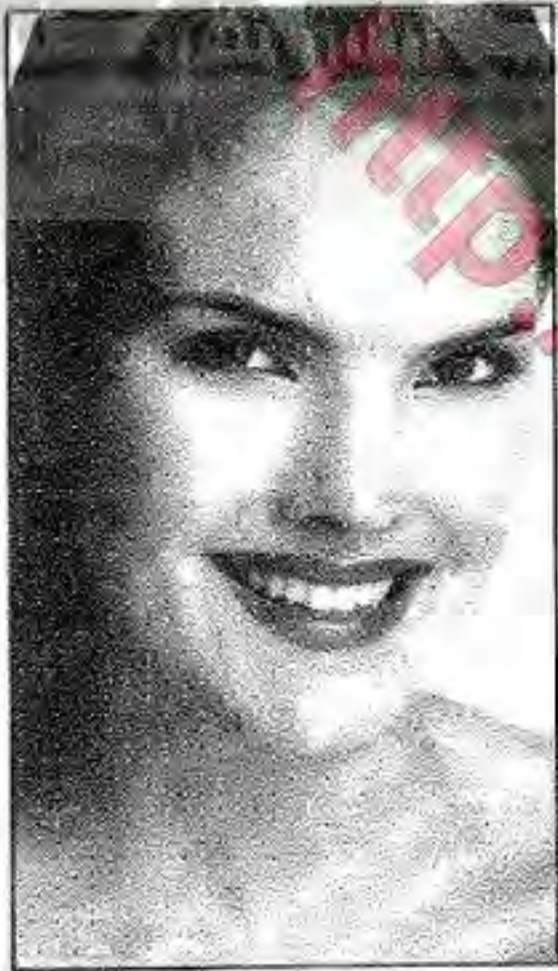
## اسٹرابیری اسٹیم (ہر قسم کی جلد کے لیے)

بھاپ لینے سے جلد کو نا صرف صحت مند چمک دمک ملتی ہے بلکہ یہ جلد کے مساموں کو کھولتی ہے اور اس میں چھپے گرد و غبار اور میل کچیل کو صاف کرتی ہے اگر آپ مستقل مسائل زدہ اور بجھی بجھی جلد کی مالک ہیں تو اس کلینزر کو اپنایئے اور ورا اپنی جلد کا حسن اور رنگت کا نکھرا ہوا روپ دیکھیے۔

| | |
|---|---|
| لیونڈر آئل | ایک کھانے کا چمچ |
| اسٹرابیری | 50 گرام |
| گلاب کی پتیاں | حسب ضرورت |

ایک دیگچی میں پانی گرم کریں یہاں تک کہ وہ ابلنے لگے پھر اس میں اسٹرابیری لیونڈر آئل اور گلاب کی پتیاں ڈالیں۔ پانچ سے پندرہ منٹ تک سر اور چہرے کو

تولیے سے ڈھک کر بھاپ لیں۔ پھر چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر خشک کر لیں۔

## کولنگ ٹونر

(حساس جلد کے لیے) کھیرے اور وٹامن A سے بھرپور گاجر کے رس پر مبنی یہ ٹونر آپ کی جلد کو ٹھنڈک اور سکون بخشتا ہے اور حساس جلد کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| کھیرا (رس نکال لیں) | ایک عدد |
| گاجر کا رس | 100 ملی لیٹر |
| چائے کا پانی | 100 ملی لیٹر |
| لیموں کا عرق | 100 ملی لیٹر |

تمام اجزا کو مکس کر کے چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد منہ دھو لیں۔

## عرق گلاب اور انگور کا ماسک (ہر قسم کی جلد کے لیے)

یہ ماسک ٹونر ہر قسم کی جلد کے لیے موزوں ہے۔ اس میں انگور کے اجزا خشک، حساس اور پھٹی ہوئی جلد کے لیے اکسیر ہیں جبکہ یہ جلد کو جواں عمری بھی عطا کرتے ہیں جبکہ عرق گلاب کے ایسٹرینجنٹ خصوصیات کے حامل اجزا جلد کو Tone کرتے ہیں اور اسے موئسچرائزر کے لیے تیار کرتے ہیں۔

اجزا:

| | |
|---|---|
| عرق گلاب | 125 ملی لیٹر |
| گلیسرین | ایک چائے کا چمچہ |
| بادام کا تیل | ایک چائے کا چمچہ |
| گریپ فروٹ کا رس | بارہ قطرے |

تمام اجزا کو اچھی طرح مکس کر کے چہرے اور گردن پر لگائیں پھر مساج کریں ایک منٹ انتظار کریں پھر نیم گرم پانی سے چہرا اچھی طرح دھو لیں بقیہ آمیزے کو فریج میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

## گرین ٹونر (ہر قسم کی جلد کے لیے)

موجودہ تحقیقات سے سبز چائے کے شفائی اور حسن بخش اجزا کی دریافت سے یہ تیزی سے کاسمیٹکس بنانے والی کمپنی کے درمیان مقبولیت حاصل کر رہی ہے یہ بہترین مانع تکسید ہے۔ بڑھاپے سے محفوظ رکھتی ہے اور جلد کو جھریوں سے بچاتی ہے یہ جلد کی خارش دور کرتی ہے اور بہترین ٹھنڈک فراہم کرتی ہے۔

| | |
|---|---|
| معدنی پانی | 200 ملی لیٹر |
| سبز چائے کی پتیاں | چار چائے کے چمچے |
| پودینہ | ایک چائے کا چمچہ |
| لیموں کا رس | ایک چائے کا چمچہ |

سبز چائے اور پودینے کو پانی کے ساتھ ابال لیں پھر لیموں کا رس شامل کریں۔ آمیزے کو ٹھنڈا کریں اور چہرے پر لگائیں بیس منٹ بعد منہ دھو لیں۔

## کھیرے کا تازگی بھرا ٹونر (ہر قسم کی جلد کے لیے)

کھیرا چکنی جلد کے مسائل دور کرتا ہے اور لیموں جلد کی نشوونما اور جلد کے خلیات کو از سر نو زندگی عطا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انڈے کی سفیدی جلد کی Tone اور رنگت کو نکھار کر جلد کو سختی اور جواں عمری بخشتا ہے یہ جلد کو ملائمت عطا کرنے میں بھی اکسیر ہے اور مسامات کو بند کرتی ہے۔ اس ٹونر کو روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔

اجزا:

| | |
|---|---|
| کھیرا (رس نکال لیں) | ایک عدد |
| انڈے کی سفیدی | ایک عدد |
| لیموں کا رس | ایک کھانے کا چمچہ |
| پودینہ | ایک چائے کا چمچہ |

تمام اجزا کو ایک پیالے میں مکس کریں اور روئی کے پھائے کی مدد سے آمیزے کو چہرے پر لگائیں۔ جب جلد تنی ہوئی محسوس ہونے لگے تو پانچ منٹ مزید انتظار کریں اور اس کے بعد منہ دھو کر موئسچرائزر لگائیں۔



### علاج

میاں نفیس احمد ایک ماہر نفسیات کے پاس پہنچے اور بولے۔

"میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا ہے۔"

"اچھا اچھا۔" ماہر نفسیات نے کہا۔

"تو آپ کی قوت ارادی کو مضبوط کر دوں تاکہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کر سکیں اور غلطی کی تلافی۔"

"نہیں نہیں۔" میاں نفیس جلدی سے بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کر دیں۔"

صائمہ جہانگیر۔۔۔ کراچی

### مطلب

شوہر مطالعے میں مصروف تھا۔ بیوی آتے ہی کہنے لگی۔

"غضب خدا کا ایک شخص نے میری کار کو ٹکر مار دی اور کار کا کچومر نکال کر رکھ دیا۔"

"لیکن ایسا شدید حادثہ کیسے ہوا؟ کیا دونوں کاریں بہت تیز تھیں؟"

"میری کار تو اس وقت ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار پر تھی۔"

"پھر دوسری کار بہت تیز رفتاری سے آ رہی ہوگی؟"

"اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔" بیوی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ جب ٹکر ہوئی تو اس میں کوئی نہ تھا اس کا مطلب یہی ہے کہ کار کھڑی تھی۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھروڑ پکا

### پہچان

"لیکن بیگم صاحبہ! جس کار نے ٹکر مار کر آپ کو نیچے گرایا تھا اس کا نمبر تو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔" بیگم صاحبہ سے سپاہی نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے نمبر نہیں دیکھا۔" بیگم صاحبہ نے سوچ کر جواب دیا۔

"ہاں البتہ اس کار میں ایک اسمارٹ سی عورت بیٹھی تھی، جو گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی اور کپڑا ساٹھ روپے میٹر والا تھا، اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی جس میں نقلی ہیرا تھا، بالوں میں سونے کا کلپ تھا۔ جبکہ وہ مصنوعی پوستین کا کوٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔"

صابر نثار محمد۔۔۔ اسلام آباد

### علاج

ایک صاحب کی بھینس بہت بیمار ہو گئی۔ انہوں نے اس کا تذکرہ اپنے دوست سے کیا دوست نے بھینس کے مرض کے بارے میں استفسار کیا اور کہا۔

"تم نے اسے دوائیں تو دی ہوں گی۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" دوست نے کہا۔

"میرے پاس بھی ایک بھینس تھی اور اسے بھی تقریباً یہی مرض لاحق ہوا تھا۔ جو تمہاری بھینس کو ہے۔"

"اچھا پھر تم نے کیا کیا تھا۔"

"میں نے اسے کڑوا تیل پلایا تھا۔" بھینس والے

صاحب اپنے گھر آئے اور انہوں نے بھینس کو کڑوا تیل پلایا تھا۔
"مگر وہ تو تیل پیتے ہی مرگئی۔" جواب میں ان کے دوست نے کہا۔
"میری بھینس بھی مرگئی تھی۔"

صبا احمد۔۔۔ کراچی

## مزا

ایک روز صبح کے وقت کسی نے فائر ہاؤس کا دروازہ دھڑ دھڑایا اور زور زور سے چلایا۔
"آگ آگ۔" فائر بریگیڈ کے ارکان باہر دوڑے اور دیکھا کہ ٹرک میں لدی ہوئی کار سے شعلے نکل رہے ہیں۔ جب آگ بجھادی گئی تو عملے کے ایک رکن نے دوسرے سے کہا۔
"اب اس نوکری پر مزا آئے گا۔ لوگ آگ لگی چیزوں کو یہاں لانے لگے ہیں۔"

فوزیہ ثمرین بٹ۔۔۔ گجرات

## ہے کون

خاتون نے فیصلہ کیا کہ وقت آگیا ہے کہ اپنے چھوٹے بچے کو خلوت کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔
اس روز جب وہ غسل خانے میں گئیں تو دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ جلد ہی بچہ ماں کو آوازیں دیتا ہوا اندر آ گیا اور غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ماں نے غسل خانے کے اندر سے چیخ کر کہا۔
"منے تم اندر نہیں آسکتے۔ کیونکہ یہاں پر عورت ہے۔" منے نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ عورت ہے کون۔"

انجم خان۔۔۔ کراچی

## بری عادت

"لیکن ڈارلنگ!" شوہر نے بے بسی سے کہا۔
"اگر ہم نے نئی کار خرید لی تو اس کی قیمت کہاں سے ادا کریں گے؟"
"بس تم میں یہ بہت بری عادت ہے۔" بیوی تنک کر بولی۔
"تم ایک وقت میں بہت سارے مسائل جمع کر لیتے ہو۔"

ثمیرا۔۔۔ لاہور

## لاعلمی

ایک دوا فروش کہہ رہا تھا۔
"میری دوا کھانے سے عمر کافی بڑھ جائے گی، میری طرف دیکھیے میری عمر پانچ سو سال ہے، میں کتنا طاقتور اور صحت مند دکھائی دے رہا ہوں۔"
یہ سن کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے دوا فروش کے چیلے کو بلا کر پوچھا۔
"کیا ان کی عمر پانچ سو سال کی ہے؟" یہ سن کر چیلے نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"مجھے معلوم نہیں کیونکہ میں ان کے ساتھ صرف دو سو سال سے ہوں۔"

اسماء۔۔۔ پنڈی

## اعلا نسل

ایک عورت کتا خریدنے گئی، فارم کا منیجر ایک کتا دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔
"اس نسل کا یہی ایک کتا رہ گیا ہے۔ اس لیے سستا مل جائے گا۔" عورت نے کہا۔
"اس نسل کا کتا میرے شوہر کو پسند نہیں آئے گا۔" منیجر نے کہا۔
"آپ خاوند کی پسند کی پروا نہ کریں، آپ کو اس نسل کے خاوند تو کئی مل جائیں گے، لیکن اس نسل کا کتا نہیں ملے گا۔"

رافعہ۔۔۔ لاہور

## قسمت

کسی فقیر نے ایک آدمی سے پیسے مانگے، اس آدمی نے کہا۔



"میں تین بار اپنی داڑھی پر ہاتھ مارتا ہوں، جتنے بال میرے ہاتھ میں آئیں گے تمہیں اتنے ہی روپے دوں گا۔"
انہوں نے تین بار ہاتھ مارا مگر کوئی بال ان کے ہاتھ نہیں آیا، اس آدمی نے فقیر سے کہا۔
"تمہاری قسمت میں کچھ بھی نہیں ہے۔" فقیر نے کہا۔
"کیوں نہیں حضور، داڑھی آپ کی اور ہاتھ میرا، پھر دیکھیے میری قسمت۔"

ساجدہ اکرم۔۔۔ کوئٹہ

## ایک سے

استاد نے شاگرد سے کہا۔
"تم دو دن اسکول کیوں نہیں آئے؟" شاگرد نے کہا۔
"میرے پاس ایک ہی پینٹ شرٹ ہے اور وہ میں نے پرسوں دھوئی تھی۔" استاد نے پوچھا۔
"اور کل؟" شاگرد نے کہا۔
"کل میں آ ہی رہا تھا کہ آپ کے گھر کی بالکنی میں آپ کی شرٹ اور پینٹ ٹنگی ہوئی دیکھی تو گھر لوٹ گیا۔"

فاخرہ بتول۔۔۔ کراچی

## خوش قسمت

چرچ میں ایک پادری صاحب یہ بتا رہے تھے کہ "انسان کا صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ آدمی زندگی میں جو کچھ بھی پاتا ہے وہ اپنی محنت و مشقت کے بل بوتے پر حاصل کرتا ہے۔"
مثال دیتے ہوئے پادری نے کہا۔
"جارج ذہین تو ہے لیکن محنت سے جی چراتا ہے، اس لیے زندگی میں زیادہ ترقی نہ کر سکا، اس کے برخلاف جان نے محنتی ہونے کی وجہ سے زندگی میں اپنے لیے ایک اعلا مقام پیدا کیا اور جب مرا تو اپنی جوان بیوہ کے لیے لاکھوں کی جائیداد چھوڑ گیا۔"
یہ سن کر پیچھے سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔
"شاید آپ کو تازہ ترین اطلاع نہیں ملی ہے، جارج اب جان کی بیوہ سے شادی کر رہا ہے۔"

شاہدہ۔۔۔ لاہور

## عقلمندی

ایک نوجوان نے اپنے دوست سے کہا۔ "تم اپنی محبوبہ کے لیے جو کوٹ لے گئے تھے اس کے بارے میں اس نے کیا کہا؟"
دوست نے کہا۔ "کہتی تھی کہ کوٹ تنگ ہے۔"
نوجوان نے کہا۔ "پھر کیا تم نے کوٹ تبدیل کردیا؟"
دوست نے جواب دیا۔ "نہیں میں نے محبوبہ تبدیل کر دی۔"

نازیہ۔۔۔ سیالکوٹ

## جلدی

ایک شخص شہر جا رہا تھا۔ راستے میں اس کا ایک دوست ملا اور اس نے اس شخص کو ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے دیا۔ سال بھر بعد جب وہ شخص شہر سے واپس آیا تو دوست نے پوچھا۔
"میں نے سال بھر پہلے تمہیں جو خط دیا تھا کیا تم نے اسے پوسٹ کردیا۔" اس پر اس شخص نے جھلا کر کہا۔
"اگر تمہیں اتنی ہی جلدی ہے تو یہ لو اپنا خط خود ہی پوسٹ کر دینا۔"

سارہ۔۔۔ لاہور

## معلومات

باپ نے بیٹے سے کہا۔
"تمہیں پتا ہے جب جواہر لعل نہرو تمہاری عمر کے تھے تو اپنی کلاس کے مانیٹر تھے۔" بیٹے نے کہا۔
"ہاں جانتا ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ جب وہ آپ کی عمر کے تھے تو بھارت کے پردھان منتری تھے۔"

شہلا خان۔۔۔ کورنگی

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

**زینب میر ـــــ شہدادپور**

س : "اگر آپ کو خلیج کی جنگ کے محاذ پر بھیج دیا جائے تو کیا آپ جائیں گے؟ ویسے آخری خواہش بتا کر جایئے گا۔"

ج : "اگر بھیجا گیا (خود سے جانے کا سوال دراصل میرا نہیں ہوا) تو آخری خواہش یہ ہوگی کہ مستقبل کے شہید کی بیوہ بلاؤں۔"

**شبانہ میمن ـــــ میرپور خاص**

س : "فرض کرو کہ اگر سگریٹ پینے پر پابندی لگ جائے تو تم تصویریں کیسے کھنچوایا کرو گے کیونکہ تمہاری تصویریں تو سگریٹ کی بنا ادھوری ہوتی ہیں۔ کہیں کنڈا ساتو نہیں پکڑ لوگے؟"

ج : "تمہارا مشورہ اچھا ہے' عمل کرنے کی سوچیں گے۔"

**ناصرہ عفت ـــــ کراچی**

س : "یہ تو سب کو پتا ہے کہ جب انسان کو بے تحاشا غم ملتا ہے تو وہ رو دیتا ہے مگر جب کوئی خوشی میسر ہوتی ہے تو تب بھی یہ آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں؟"

ج : "نازک آنکھیں' برداشت کا مادہ کم ہوتا ہے ان میں۔"

**طاہرہ گل ناس ـــــ کلر سیداں**

س : "ذوقی بھائی! یہ بتائیں کہ جو درد ملتا ہے ہمیشہ اپنوں سے ہی کیوں ملتا ہے؟"

ج : "کیونکہ پھر غیروں سے شکایت کون کرے۔"

**ماریہ محمد اسماعیل ـــــ کراچی**

س : "ذین بھیا! رات کو بھالی میرے پاس آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ تمہارا بھائی مجھ کو بہت مارتا ہے۔ کیوں بھائی! آپ بھابی کو کیوں مارتے ہیں' جلدی سے جواب دو؟"

ج : "ماریہ واقعی تم اپنے بھائی کو سمجھاؤ' یہ گری ہوئی حرکت نہیں کرنا چاہیے انہیں۔"

**شہلا سعید ـــــ جھنگ صدر**

س : "ذین بھائی! کسی نے مجھ سے پوچھا کہ بچپن کس عمر سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ بڑھاپے میں کیونکہ لوگ بالکل چھوٹے بچے بن جاتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ج : "مگر ہم تو جوانی میں بھی بچے ہیں۔"

**فرزانہ سعید ـــــ سکھر**

س : "ذوالقرنین ناراض مت ہونا' ذرا یہ تو بتاؤ کہ جب اللہ عقل بانٹ رہا تھا تو تم کہاں تھے؟"

ج : "سب سے آگے اور سب سے پہلے لے کر آیا تھا۔"



**سبزہ کریا ـــــ کراچی**

س : "ایک نو آموز سائیکل سوار کے لیے دشوار ترین مرحلہ کیا ہے؟"

ج : "معلوم نہیں۔"

**زریں فرزانہ ـــــ شاہ پور صدر**

س : "شادی والے دن دولہا بے چارے کو کس بات کی مبارکباد دی جاتی ہے؟"

ج : "اس کے حوصلے کی۔"

**نور جہاں احمد ـــــ شہدادپور**

س : "بھیا! کیا آپ سچ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

ج : "وثوق سے کہہ نہیں سکتا فی الحال۔"

**زبیدہ عفاف ـــــ گوجرانوالہ**

س : "بھائی! یہ بتاؤ اپنے آپ کو بہادر اور نڈر کیوں سمجھتے ہیں جبکہ آپ؟"

ج : "بھئی! میں نے کب اپنے آپ کو بہادر اور نڈر سمجھا ہے؟ یونہی الزام دے رہی ہیں آپ۔"

**روبینہ لطیف بٹ ـــــ اوکاڑہ**

س : "ذوقی بھیا! آپ پلیز بتا ہی دیں کہ یہ آپ ہر وقت کیا لکھتے رہتے ہیں تمہیں ان کو تو؟"

ج : "لکھتے خط ہی ہیں مگر بھیجتے نہیں۔"

**روبینہ سراج ـــــ کراچی**

س : "محبت کے پرجوش میچ میں جیت کس کی ہوتی ہے؟"

ج : "جو اچھا کھیلے اس کی۔"

**شازیہ میر محمد ـــــ حیدر آباد**

س : "جب سے بنلے یہ دہلا کا کالم شروع ہوا ہے آپ جواب دے رہے ہیں مگر تصویر وہی جوانی کی چلا رہے ہیں' کبھی بڑھاپا بھی تو سامنے لایئے؟"

ج : "غلط فرمایا آپ نے' بتدریج ہم تصویریں بدل کر اپنی اصل عمر سامنے لاتے رہتے ہیں۔"

**اقصیٰ خان ستو ـــــ بہاولپور**

س : "ہر دماغ دو منزلہ ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل آخرت سے کام سرانجام دیتی ہے اور نیچے کی دنیاوی۔ آپ کی کون سی منزل بہتر کام کرتی ہے؟"

ج : "دونوں ہی بیک وقت نہایت تیز رفتاری کے ساتھ کام کرتی ہیں۔"

**راشدہ پروین ـــــ گجرات**

س : "کہتے ہیں کہ

شکوہ! خدا سے نہ کرو گناہ گار ہو گے

شکوہ! بندوں سے نہ کرو' مایوسی ہوگی

شکوہ! تقدیر سے نہ کرو' مل نہیں سکتی

شکوہ! سماج سے نہ کرو' اجازت نہیں

شکوہ! اپنے آپ سے نہ کرو' دیوانے کہلاؤ گے

شکوہ! اپنوں سے نہ کرو' کمتر کہلاؤ گے

بھیا! آپ ہی بتائیں پھر شکوہ کس سے کریں؟"

ج : "نہ کریں کسی سے بلکہ شکوے کی ضرورت پر نظر رکھیے' شاید ہو ہی نا پھر۔"

**شائستہ اقبال ـــــ گجرات**

س : "بندہ اپنی اوقات کب بھولتا ہے؟"

ج : "جب گھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔"

**مہ جبین قزلباش ـــــ فیصل آباد**

س : "ذین بھیا! شادی کے بعد مرد اتنا سنجیدہ کیوں ہو جاتا ہے' حالانکہ شادی سے پہلے بہت ہنس مکھ ہوتا ہے؟"

ج : "جس کے لیے ہوتا ہے' وہ نہیں ملی ہوتی جبھی تو۔"

**ثمینہ اکرم۔۔۔ بہار کالونی لیاری**

اللہ پاک بزرگ و برتر کے حضور آپ کی خیر و عافیت اور دائمی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ اے اللہ ارض پاکستان اور شہر کراچی کو امن و امان کا گہوارہ بنادے آمین۔

مارچ کا کرن ڈائجسٹ تو وقت مقررہ پر ہی ملا۔ سرورق پر براجمان دلہن نے تو جیسے مبہوت ہی کر دیا۔ اف۔۔۔ کیا خوب صورت میک اپ اور جیولری ہے۔ گولڈن اور گرین کلر کا کیا حسین امتزاج ہے۔ واقعی اتنی حسین دلہن نے دل موہ لیا۔

سب سے پہلے "نامے میرے نام" پڑھا۔ سرفہرست خط تابندہ منصور (مردان) کا رہا۔ کئی بہنوں نے لکھا ہے کہ کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے تو شاید یہ میرا آخری خط ہو یا میں اب آئندہ خط نہ لکھ سکوں۔ پیاری قارئین آپ کی شادی ہو رہی ہے ناخدانخواستہ آپ کو کالے پانی کی سزا تو نہیں ہو رہی جو آپ باہر کی دنیا سے رابطے نہ رکھ سکیں۔ شادی کو ہوا نہ بنائیں یہ تو سنت رسول ہے۔ ہم آپ کی ازدواجی خوشیوں کے لیے اللہ کے حضور دعا گو ہیں۔

اس ماہ مجموعی طور پر کرن میں بہترین تحاریر شائع ہوئیں۔ "باتیں کچھ معنی بے معنی سی" اپنے عنوان کی طرح منفرد رہا۔ اس سلسلے میں میری پوری فیملی کو ثمینہ اکرم کے جوابات زیادہ پسند آئے (یہ میری نہیں میری فیملی ممبرز کی رائے ہے)

مستقل سلسلے سب اچھے جا رہے ہیں۔ "گوشہ عافیت" کی اس مرتبہ کی قسط نے تو جیسے مجھے خرید ہی لیا۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی۔۔۔ دونوں کو شگفتہ بھٹی نے کس قدر خوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ طلاق حلال امر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا ناپسندیدہ عمل ہے۔ یہ تین لفظ زبان سے نکلنے کے بعد پچھتانے سے کیا حاصل۔ اللہ سے دعا ہے کہ دلنشین نے نصیر احمد سے شادی محض مجبوری میں نہ کی ہو بلکہ اللہ دلنشین کے دل میں نصیر احمد کی سچی محبت ڈال دے اور وہ دوبارہ وجیہہ تک پہنچنے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ اب اگر ایک مخلص شخص کا ساتھ عصمہ کو ملا ہے تو اسے اس کی قدر کرنی چاہیے ورنہ محبتیں بار بار دل کے دروازے پر دستک نہیں دیتیں۔ شگفتہ بھٹی ایک کھرا مقصد اور اصلاح لیے ہمیشہ اپنی تحریروں میں موجود ہوتی ہیں۔ اللہ سے محبت کا اظہار ان کی تحریر میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس قسط میں اللہ سے محبت نے انہیں عشق حقیقی عطا کیا۔

"عشق آتش" کے بارے میں کیا تبصرہ کروں اس کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ قسط نمبر 4 میں بلیجہ کے مرنے کا سین سعدیہ جی نے اتنی خوب صورتی سے لکھا کہ ہم سامنے چلنے والی کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ مگر ایک بات سے میں اختلاف کروں گی کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد معافی مانگنے پر تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے پھر بابا جان کو نور الہدیٰ کیوں معاف نہ کر سکے جبکہ بیٹی کے مر جانے کے بعد تو سب سے زیادہ نقصان ان ہی کا ہوا اور یہ سزا قدرت نے انہیں خود ہی دے دی۔ سانپ مرا۔۔۔ پچھتاوے کی صورت میں۔۔۔ باپ کی طرح پرورش کرنے والے آبا کے لیے نور الہدیٰ دل کیوں نہ صاف کر سکے۔ دوسری طرف وجدان مصطفیٰ نے واقعی سچے عاشق کا حق ادا کر دیا۔ اگر عشق میں بلیجہ جان کی بازی ہاری تو وجدان بھی دیوانہ ہو کر در بدر بھٹکتا رہا۔ اس کو پڑھ کر لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی سچی محبت کی یاد تازہ ہو گئی۔

قسط نمبر 5 میں مجھے مولانا عبدالخالق کا کردار بہت زیادہ پسند آیا سعدیہ راجپوت اس مرتبہ بھی مبارک باد کی مستحق ٹھہریں لیکن اب کچھ لگا کہ وجدان نے تمام عمر شادی نہیں کی اور شایان وہ بچہ ہے جو جھاڑیوں سے ملا اور جس کی وجہ سے وجدان دوبارہ زندگی کی طرف لوٹا۔

"پیا کا گھر" بشریٰ انصاری سے ملاقات پسند آئی۔ ہم اپنے بچپن سے ہی بشریٰ انصاری کو ایسے ہی جوان اور ترو تازہ دیکھتے آ رہے ہیں۔ نایاب جیلانی کے ناول نے ہمیں "ساہی' سوہنی اور سونی" کے چکر میں الجھا کر رکھ دیا۔ ویسے ناول مزے دار رہا۔ "دروں" اور "دست کوزہ گر" بھی ٹھیک جا رہے ہیں۔ باقی افسانے ابھی پڑھ نہیں پائی۔ باقی مستقل سلسلے پسند آئے۔ کھانے پکانے کی تراکیب بھی مزے دار لگیں۔ کتاب جاسن تو ضرور ٹرائی کروں گی۔ اب اجازت دیں۔ اپنا بہت خیال رکھیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

**فوزیہ تبسم۔۔۔ گجرات**

کرن ہوا مارچ کو ملا۔ مارچ کا سالگرہ نمبر تھا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ حسب عادت و حسب روایت سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ میر کارواں محمود بابر فیصل کے لیے جو دعائیں نکلتی ہیں کہ جن کی بدولت ہمیں گھر بیٹھے ایک بہترین درس گاہ ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ محمود صاحب کے بلند درجات کرے (آمین) سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول کو پڑھا۔ امجد بخاری کی نعت پسند آئی۔

قارئین کی عدالت میں "عمران عباس" کا انٹرویو بہت شاندار رہا۔ جس طرح عمران کا ظاہر خوب صورت ہے۔ باطن اس کا اس سے زیادہ حسین ہے۔ اس کی باطنی پاکیزگی ہی ہے جو اس کے چہرے سے معصومیت کو ظاہر کرتی ہے۔ بہرحال بہت عرصہ کے بعد انٹرویو میں دلچسپی جاگی۔ گڈلک عمران بھائی جس طرح تم شوبز کی دنیا میں رہ کر اپنے رب سے رابطہ جوڑے ہوئے ہو اللہ تمہیں ہر میدان میں کامیاب کرے (آمین)

"پیا کا گھر پیارا لگے" میں بشریٰ انصاری اب ان کے بارے میں میں کیا کہوں ہر دل عزیز خاتون ہیں زندگی کے ہر میدان میں انہوں نے اپنی محنت سے کامیابیاں ہی حاصل کی ہیں۔ پاکستان ٹی وی کی بہت نائس اور سوبر خاتون ہیں۔ "دو کا پہاڑا" میں دانش تیمور کے جوابات بھی بہترین تھے۔ "باتیں کچھ معنی بے معنی سی" میں بھی نے اچھا لکھا۔

اب آتے ہیں ہم سعدیہ جی کے "عشق آتش" کی طرف۔ واقعی ہم لوگ رائٹر کے دماغ تک رسائی نہیں کر سکتے۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا کیا کیا آئیڈیاز کے گھوڑے دوڑائے اور کہانی کیا رخ اختیار کر چکی ہے۔ سعدیہ جی آپ کو ذرا بھی وجدان پہ ترس نہیں آیا۔ اس بے چارے نے اک جرم محبت ہی تو کیا تھا اور آپ نے اسے جدید دور کا مجنوں بنا دیا۔ وجدان کی حالت دیکھ کر دل اشکبار ہو گیا۔ مولوی عبدالخالق نے مرحوم محترم اشفاق احمد کے باباجی کی یاد تازہ کر دی۔ خاص کر ان کے بامعنی جملوں نے کہ دنیا میں ابھی اللہ لوک ہے۔۔۔ موجود ہیں جن کی بدولت اس دنیا کا حسن قائم ہے۔ اب ساری کہانی کی تھی سمجھ آ گئی میرے خیال میں "عشق آتش" سال رواں کا بہت ناول ہوگا۔

"گوشہ عافیت" کیا عصمہ نے حلالہ کی نیت سے نصیر احمد سے شادی کی ہے میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے لگتا ہے وجیہہ بھی ایسا نہیں چاہے گا کیونکہ اس کے باطن میں روحانی تبدیلی شروع ہو چکی ہے کہانی اختتام پذیر ہے پلیز شگفتہ جی اچھے سے اینڈ پہ کیجیے گا۔

مکمل ناول "ساہی اور سونی" میں نایاب صاحبہ اگر ساہی کا ساتھ دیتیں یعنی سوہنی سے شادی کروا کر تو ہم نے ناراض ہو جانا تھا۔ سونی کا اعتبار اٹھ جانا تھا۔ ساہی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرد شدید محبت کے باوجود اک نئی محبت کی گنجائش رکھتا ہے کیوں یہ مرد ذات کا دل نہیں بھرتا سونی نے ساہی کو معاف کر کے نہ صرف اپنا گھر بلکہ اپنی محبت کو بھی بچا لیا۔ "کوئی لمحہ محبت کا" صدف زیب کا بہت اچھا تھا۔ عباس اور شانزے کی زندگی سے بھرپور شرارتیں اچھی تھیں۔ خاص کر عباس کی محبت بھری بے ایمانیاں عباس اور شانزے کی پیار بھری نوک جھوک کہانی کی جان تھی۔

"بس ایک بوند سی" نازیہ جمال کا کافی سبق آموز افسانہ تھا۔ احسان صاحب اپنے ہی لفظوں کی پکڑ میں آ گئے۔ جو کچھ معراج دین نے کیا۔ احسان کا اشتعال میں آنا لازمی تھا مگر پہلی غلطی کی معافی ہونی چاہیے احسان صاحب کو معراج دین کو ایک موقع تو ضرور دینا چاہیے تھا اب پتا نہیں معراج دین کی بددعا تھی یا احسان کی آزمائش جو سب قسمت کی ستم ظریفی کی لپیٹ میں آ گئے۔

باقی افسانے گزارے لائق ہی تھے۔ مستقل سلسلے اس بار بھی بہت شاندار رہے۔ شاعری میں ندا لقمہ کا شعر پسند آیا۔

ٹیلے پہ دیا ہمیشہ کی طرح لاجواب سلسلہ ہے۔
"نامے میرے نام" میں مسز تابندہ منصور کا تبصرہ اچھا لگا۔ واقعی ہم شگفتہ جی کے اس ناول کے پیچھے مقصد کو جان ہی نہیں سکے۔
قارئین کی عدالت میں آئندہ ماہ اگر نعمان اعجاز یا پھر ہمایوں سعید ہوں ـــــ تو بہت مزا آئے گا۔ اچھا اب اجازت دیں۔

## انیقہ انا۔۔۔ چکوال

بارہ تاریخ کو کرن آیا اور ایک دن میں پڑھنے کے باوجود آج اٹھارہ آ پہنچی' ہر روز خط لکھنے کا سوچتی ہوں پر یا تو نیند آجاتی ہے یا واپڈا والوں کی مہربانی۔
خیر "سرورق" کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ بڑی دھوم تھی نئے سلسلے کی مگر آپ نے دو سلسلے شروع کیے دونوں ہی ـــــ چلیں بسلا والا تو کچھ قابل قبول ہے مگر یہ پیا مجھے شوبز سے چڑ ہے آپ اتنا ہی کرن میں شوبز کو جگہ دیتے ہیں سارا مزا کرکرا ہو گیا۔
سالگرہ نمبر میں اگرچہ وہی چند گنے چنے نام دکھائی دیے اور کوئی دھانسو قسم کی تحریر جیسے "نادیہ امین" کی "طلب عشق" "فوزیہ کی" "زاویہ نظر" وغیرہ وغیرہ نہیں تھیں۔ اب یہ نہیں کہ تحاریر اچھی نہیں تھیں مگر کچھ تو مس تھا نا! نایاب' ماشاء اللہ ایک بچی کے ساتھ آپ اتنا تواتر سے کیسے لکھ پاتی ہیں۔ اس دفعہ ناول بہت اچھا تھا سونی ساحی اور سوہنی تینوں کردار اپنی اپنی جگہ بہترین تھے۔
صدف زیب کا ناول اچھا رہا۔ دو لوگوں کو ملانے کا ایک بچگانہ سا منصوبہ ـــــ بھلا اتنے میچور افراد ان میں ایجروالی حرکات سے متاثر ہو سکتے تھے۔ پہلے تو میں اسی پر ہنسی..... علاوہ ازیں ناول اچھا ہی تھا۔
"عشق آتش" تو کچھ زیادہ ہی طویل ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے میرا سلسلہ وار ناول ہے۔ میں نے تاحال نہیں پڑھا فرصت ملی تو پڑھیں گے۔
"گوشہ عافیت" میں اسی نہج پر جا رہا ہے جس کا سوچا تھا۔ بس علالہ کا خیال ذہن میں نہیں رہا تھا۔ اب لگتا ہے گویا نصیر عصمہ کو طلاق نہیں دے گا۔ عصمہ کے تاثرات سے محسوس ہوتا ہے گویا وجیہہ کا خیال بہت جلد اس کے دل سے نکل جائے گا اور دوسری جانب وجیہہ عشق حقیقی کے اس رمز کو پالے گا جو نصیب والوں کو ملتا ہے۔

فوزیہ یاسمین کے ناول میں تاحال کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اتنے مہینوں سے ایک ہی بات کو لاسٹک کی طرح کھینچا جا رہا ہے۔ نہ زوبیہ کی خالہ کا کردار واضح ہوتا ہے نہ کمل اور خرم کے جھگڑے کم ہوئے۔ اب کچھ تو قصہ بڑھائیں نا! نبیلہ عزیز کا "دردل" بھی اب تک نہیں پڑھا۔ اب مجھے اجازت دیں اس بار اتنا ہی کافی ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

## شمائلہ تاج۔۔۔ خانپور

میں کافی عرصے بعد کرن کے "نامے میرے نام" میں شرکت کر رہی ہوں۔ سولہ مارچ کی صبح جب میری آنکھ کھلی تو میرے تکیے کے پاس ہی بیڈ پر کرن پڑا تھا۔ جلدی سے کرن اٹھایا اور مندی مندی آنکھوں سے کھولا اور 'بول کہ لب آزاد ہیں' تلاش کرنا چاہا کیونکہ اس کالم میں میں نے لکھ بھیجا تھا مگر کیا' وہ کالم تو سرے سے مارچ کے کرن میں تھا ہی نہیں۔ خیر امید پر دنیا قائم ہے اور ہم امید ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اس بار تو سارے افسانے ہی اچھے تھے۔ "ام تمامہ" کا "گوٹری جیسی ہاڑے" زبردست تھا۔ یہ سچ ہے آج کے دور میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ سفید پوش گھرانے کے لوگوں کی خصوصاً بچوں کی خواہشات اکثر ناتمام ہی رہتی ہیں اور حسرتوں میں بدل جاتی ہیں مگر اس افسانے میں 'معقوے' اپنی خواہش پوری کر لی اور ایسے رنگ سے سامنے بھی آئی۔
آصفہ تحریمہ کا "سمجھوتا" بھی اچھا لگا مگر بھی کر گیا۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ اکثر لڑکیوں کی پڑھائی کو ان کے لیے طعنہ بنا دیا جاتا ہے۔ مکمل ناول میں نایاب جیلانی کا "ساحی' سونی اور سوہنی" بہت اچھا لگا۔ بہت عرصے بعد ایسا ناول پڑھنے کو ملا۔ ساحی اور سونی کی آپس کی گفتگو نے بہت لطف دیا۔
"باتیں کچھ معنی' بے معنی سی" میں سب کے جوابات ہی اچھے تھے۔ انٹرویوز مجھے کچھ خاص پسند نہیں ہے اور میں بہت کم پڑھتی ہوں۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں سب کا انتخاب پسند آیا۔ تبصروں میں حرمت روا اور فوزیہ تمر بٹ کا تبصرہ جاندار تھا۔

## زوبیہ خان۔۔۔ کشمیر

آپ کے پرچے میں پہلی بار تو نہیں البتہ دوسری بار خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں جو پہلا خط لکھا تھا وہ یا تو ڈاک کی نذر ہو گیا یا پھر ردی کی ٹوکری کا نصیب بنا امید ہے کہ اس بار تو خط شائع ہو ہی جائے گا۔
جماعت نہم میں تھی جب سے کرن' شعاع اور خواتین کو پڑھنا شروع کیا اور آج جبکہ میں ایم اے انگلش کی اسٹوڈنٹ ہوں تو بھی ان کے ساتھ رشتہ برقرار ہے۔ کرن کا پرچہ ہمیشہ سے میرے لیے موسٹ فیورٹ رہا ہے' مجھے لو اسٹوریز اٹریکٹ کیا کرتی تھیں مگر وقت اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ زاویہ نظر بھی بدل گیا۔ اب افسانوں اور ناولز میں چھپے اصل معنی اور مقاصد پہچاننے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرا ذاتی خود خیال ہے کہ لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اپنی تحریر سے انصاف کرنا اور آپ کی رائٹرز بخوبی یہ کام کر رہی ہیں۔
سلسلہ وار ناولز میں سے "دست کوزہ گر" اور "دردل" دونوں ہی بہت اچھے ہیں مگر فوزیہ یاسمین کا انداز تحریر بے حد جامعیت لیے ہوتا ہے' ان کا مطالعہ' ان کا مشاہدہ اور تحریر پہ گرفت قابل تحسین ہے' کئی بار ان کے مختلف ناولز پڑھ کر بے اختیار ان کو مبارک باد کہنے کا دل چاہا مگر بے حد مصروفیت کی بنا پر ایسا نہ کر پائی مگر خیر دیر آید درست آید کے مصداق اب میری طرف سے اتنے بہترین ناولز لکھنے پر ان کو ڈھیروں مبارک باد اور شکریہ۔
اس کے علاوہ نایاب جیلانی بھی منفرد لکھنے والوں میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ شگفتہ بھٹی کا "گوشہ عافیت" شروع میں تو اچھا لگا مگر اب اسے پڑھتے ہوئے بے حد بوریت ہوتی ہے (معذرت کے ساتھ) ان کی تحریریں گو کہ ہی نہج لیے ہوتی ہیں مگر انداز تحریر بھی بور سا لگنے لگتا ہے (قطعی ذاتی رائے) تبصرہ نگاروں میں انیقہ انا کے تبصرے بے حد پسند ہیں 'وہ ہر تحریر پر حاتج کی پروا کیے بغیر اپنی رائے کا کھل کے اظہار کرتی ہیں' ان کے خیالات میں مجھے اپنے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔
کمال ابا! بس دوا کے لئے خدا کے لیے چھوڑ دیتی ہوں۔
اب اجازت دیں۔

## شیبا عشرت۔۔۔ کراچی

اس بار تو شمارہ بارہ تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا خاص کر مہندی لگے ہاتھ' سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت پاک پڑھی۔ آصفہ تحریمہ قاضی کا افسانہ "سمجھوتا" اچھا لگا حقیقت پر مبنی کہانی ہے۔ افسانہ "بات ایک بوند کی" نے بہت بور کیا (معذرت کے ساتھ) ام تمامہ کا افسانہ "گوٹری جیسی ہاڑے" سو سو تھا خاص مزا نہیں آیا۔ نایاب جیلانی کی کہانی کچھ خاص نہیں تھی انٹرویوز سب بہت اچھے رہے۔
مستقل سلسلے میں سب کچھ پسند آیا۔ "قارئین کی عدالت میں" سلسلہ اچھا شروع کیا ہے۔ "دست کوزہ گر"، "دردل" اور "عشق آتش" اچھے جا رہے ہیں ان پر تفصیلی بات آئندہ خط میں کروں گی۔ اب اجازت دیں اللہ کرن کو ترقی عطا فرمائے نیک تمناؤں کے ساتھ۔

## کرن الشفاء خیر النساء۔۔۔ نامعلوم

کرن' شعاع اور خواتین کے ساتھ تعلق زیادہ پرانا تو نہیں مگر پانچ برس پر محیط ہے یہ رشتہ ہم تو شاید خاموش قاری ہی رہتے اگر ہماری نظروں سے یہ تحریر نہ گزرتی۔ یعنی "عشق آتش" آپ یقین کیجیے اس ناول نے ہمیں صحیح معنوں میں رلا دیا۔ آپ نے تو ہمیں لفظوں کے سحر میں جکڑ لیا سعدیہ جی' کیا جادو بھرے الفاظ تھے ہمارے پاس لفظ نہیں ہیں آپ کی تعریف کے لیے اور دوسری بات جو ہم نے محسوس کی وہ یہ کہ محبت کے اس رشتے میں سرفہرست عزت و احترام کو مقدم رکھا گیا تھا۔ اور سعدیہ جی پڑھتے وقت ہم شدت سے روئے تو کیا لکھتے وقت آپ بھی روئی تھیں پلیز کے لیے؟
پلیز درثمن کو بھی ڈھونڈیں شادی کے بعد وہ تو گوشہ نشین ہو گئی ہیں۔ درثمن پلیز پلیز آپ جلدی لکھیں ہم آپ کی تحریر کے منتظر ہیں۔
آپی ہم پہلی دفعہ خط لکھ رہے ہیں ضرور شامل کیجیے گا یہ نہ ہو آپ ہمارے خلوص و پیار و محبت سے بھرے خط

کو دست بن کی نذر کردیں۔
اللہ آپ کو اور اس ادارے کو مزید کامیابیوں سے ہم کنار کرے۔

**سائرہ پرواکرن صدیقی۔۔۔ کوٹ چھٹہ**

ناول کرل اچھی لگی "قارئین کی عدالت میں" یہ سلسلہ بے حد پسند آیا۔ آپ سے ریکوئسٹ ہے کہ کامران جیلانی اور فہد مصطفیٰ کو بھی اس سلسلے میں ضرور لے کر آئیں۔ دانش تیمور کا انٹرویو اتنی بار پڑھ چکے ہیں۔ آپ پلیز کسی اور اداکار کو مثلاً "ہمایوں سعید اور کامران مجاہد کو "دو کا پہاڑہ" میں جگہ دیں تو ہمیں اچھا لگے گا۔ اس بار جس ناول نے سب سے زیادہ انریکٹ کیا وہ ہے "عشق آتش" وجدان کے بارے میں پڑھ کر کہ کیسے بلیجہ کی جدائی نے اسے پاگل بنا دیا بہت رونا آیا۔ سعدیہ جی اب وجدان مصطفیٰ کو اس کے پیرینٹس سے بھی ملوادیں "دردل" کے تو کیا کہنے نبیلہ آپی اب مدیحہ اور عدیل کا ٹکراؤ بھی کروا ہی دیں اور جھٹکا منصور حسین کو جاب تو ملی۔۔۔!

"دست کوزہ گر" میں خرم اور زوبیہ کا ٹکراؤ اچھا لگا مگر خرم کا کپل ٹل کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے۔ "گوشہ عافیت" میں دلنشین کا نکاح نصیر احمد سے ہوا۔ یہ ہمیں اچھا نہیں لگا اور وجیہہ الحسن کے عمر سے رجانے کا سن کر ہم حیران رہ گئی اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ وجیہہ جیسے شخص کو بھی کیا ہدایت مل سکتی ہے!

"سائی اور سوہنی" بہت انٹرسٹنگ ناول تھا۔ نایاب جیلانی نے اس بار کافی ہٹ کر اور انٹرسٹنگ ناول لکھا۔ سوہنی کا فیصلہ اچھا لگا۔ اس نے سونی کا گھر تباہ ہونے سے بچالیا۔

"کوئی لمحہ محبت کا" صدف زیب کا ناول بھی بے حد انٹرسٹنگ تھا۔ عباس شاہزے اور زرمینے کی نوک جھونک سے دل بہت لطف اندوز ہوا۔ آخر کار انہوں نے دونوں کو ملا ہی دیا۔

"گھوری سیپی باؤسے" ام ثمامہ نے بہت پاور فل

لکھا۔ اب اجازت دیں۔

**شاہ شفیق۔۔۔ اٹک**

کرن کا شمارہ بارہ مارچ کو ملا بے تابی سے کھول کر سب سے پہلے موسٹ فیورٹ "عشق آتش" پہ چھلانگ لگائی وجدان کے ہوش و حواس ختم ہونے پہ ٹوٹ کے رونا آیا۔ خاص کر اس وقت جب وہ دیوانگی کے عالم میں بلیجہ کو پکارتا ہے اور لوگ اسے مارتے ہیں سعدیہ جی بلیجہ کو مارنا نہیں تھا نا نورالہدیٰ میں اتنا حوصلہ تو تھا اتنی محبت تو تھی اسے کہ وہ اس کی خوشی کی خاطر اسے وجدان دے دیتا۔ یہ بات اس نے کسی بھی کی پھر بھی؟ ناول بہت زبردست ہے لیکن بلیجہ کی ڈیتھ اور وجدان کی محبت اور دیوانگی بھلانے کے قابل نہیں ہے۔ یہ ناول ہمارا پسندیدہ ناول ہے بلاشبہ اس ناول کا شمار ٹاپ ناولز میں ہو گا۔ پلیز اب تانیہ اور شایان کو ملا دیجیے گا۔

"گوشہ عافیت" شگفتہ بھٹی بھی زبردست طریقے سے بڑھا رہی ہیں جو مرد عورت کو عزت اور وقار سے جینے کا حق نہیں دیتا اس کا ساتھ بے کار ہے جب سسرال کی طرف سے عزت نہیں تو وہ محبت بے کار ہے جو اسے عزت ہی نہیں دے سکتی۔ نصیر احمد اسے کم از کم عزت تو دے گا۔ ایک عورت کو محبت سے زیادہ عزت ہی کی تو ضرورت ہوتی ہے۔

"دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں ناول کا اینڈ خطرناک پچویشن پہ ہوا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "دردل" بھی ٹھیک تھا لیکن نایاب جیلانی کا ناول "سوہنی سائی اور سوہنی" خاص کر بہت پسند آیا۔ سوہنی کا گھر تو بچ گیا لیکن اس کو بہت کیا۔ سائی بھی وہی عام سا روایتی مرد نکلا اپنی محبت کے علاوہ انسان کو تو اور کچھ اچھا ہی نہیں لگتا یا دونوں کی محبت ایسے ہوتی ہے کہ ذرا موقع ملتے ہی اور بس۔ اب اجازت دیں آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

## سانحہ ارتحال

ہماری نامور مصنفہ بن رخ چودھری کے والد چودھری نصیر احمد طویل علالت کے بعد گزشتہ دنوں قضائے الٰہی سے وفات پاگئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) مرحوم بہت نیک، ملنسار، مرنجان مرنج انسان تھے۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔